ماہنامہ

تمثیل نو

دربھنگہ

ساتِ سمندر پار کا ہمعصر اُردو ادب

اپنوں سے اغیار سے
اُردو کے بازار سے
لایا ہوں تحفہ پیارا
سات سمندر پار سے

مئی ۰۸ء میں وگیان بھون میں منعقد ایک تقریب میں محترمہ سونیا گاندھی سے محترمہ حلیمہ سعدیہ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرتے ہوئے۔ تصویر میں پروفیسر شمیم احمد (وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد) بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

مدیر اعزازی: ڈاکٹر امام اعظم

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

ماہنامہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ

جلد: ۹	جولائی ۰۸ء تا مارچ ۲۰۰۹ء	شمارہ: ٦

زرِ تعاون

فی شمارہ: ۴۰ روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے، خصوصی تعاون: ۳۰۰ روپے، تاحیات (بھارت): ۵۰۰۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): ۲۰۰ روپے، دیگر ممالک (سالانہ): ۱۵ امریکی ڈالر / ۱۰ پونڈ

رابطہ: ''تمثیل نو'' قلعہ گھاٹ، دربھنگا۔۴، موبائل: 9431085816 فون: 06272-258755

email-imamazam99@yahoo.com

پرنٹر، پبلشر و اونر ڈاکٹر امام اعظم نے دربھنگہ آفسیٹ پریس، دربھنگہ سے چھپوا کر
دفتر ''تمثیل نو'' اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگا۔۴ سے شائع کیا۔

اقرا گرافکس اینڈ آفسیٹ، لال باغ، دربھنگہ، Cell : 9334911467

غیر ملکیوں کو اور انگریزوں کو خصوصی طور پر اردو متاثر کرتی رہی ہے اور جہاں انعام و اکرام کے تقسیم ہونے کا سوال ہے آج تک کسی اردو شاعر یا ادیب کو نوبل پرائز سے نہیں نوازا گیا۔ یہ المیہ اسی لئے ہے کہ اردو ادیب یا شاعر ان سیاسی پیچیدگیوں کو سمجھتے تو ہیں لیکن اس کیلئے راہ ہموار نہیں کرتے اور ان کمیٹیوں میں ہماری نمائندگی بھی نہیں ہے۔

گلوبلائزیشن کے بعد انٹرنیٹ پر جو تخلیقات سامنے آرہی ہیں ان میں بلا کی ذہانت کا پرتو ملتا ہے لیکن آج بھی فرانس کو دنیائے ادب میں ڈکٹیٹرشپ حاصل ہے اور اسی کا سکّہ چلتا ہے۔

میں نے سوچا کہ سات سمندر پار کے ادباء و شعراء سے خود اپنے اردو کے لوگ ناواقف ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ سات سمندر پار کے ہم عصر اردو فنکاروں کے کارناموں سے قارئین کو واقف کرائیں اور اسی غرض سے یہ خصوصی شمارہ ترتیب دیا ہے۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ یہ خلیج پاٹنے کا کام کتنا ضروری تھا! ہم اُمید رکھتے ہیں کہ آپ کو یہ چھوٹی سی کوشش پسند آئے گی!

قارئین تمثیل نو کو ہجری اور مسیحی سال نو مبارک!

ادبی و ثقافتی خبریں:

❁ ''کہانی براہ راست نصیحت کرنے کا نام نہیں۔ کردار اس طرح سے پیش کئے جائیں کہ ان کے غلط اعمال کے باوجود ان سے نفرت نہ ہو بلکہ قاری غور و فکر کرے کہ کوئی دوسرا یا میں ہوتا تو میرا ردِ عمل بھی یہی ہوتا'' معروف فکشن نگار جوگندر پال نے سہ روزہ بین الاقوامی سمینار (14-12 / اپریل 2008) ''معاصر تہذیبی اقدار، اور نئی اردو ہندی کہانی'' کا افتتاح کرتے ہوئے شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں ان خیالات کا اظہار کیا۔

مہمان خصوصی شیخ الجامعہ پروفیسر ایس پی اوجھا نے اس موقع پر کہا کہ ''یہ سمینار ہماری یونیورسٹی کے لئے فخر کی بات ہے، دراصل اردو دلوں کی زبان ہے اور یہ دلوں کو جوڑنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے''۔ کشمیر سے تشریف لائے پروفیسر زماں آزردہ نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ اردو ہندی کہانی پر یہ سمینار ہم عصر کہانیوں کی تفہیم میں نئے باب وا کرے گا۔ ہندی کے معروف افسانہ نگار اور ناقد پروفیسر گنگا پرساد وِمل نے ہندی میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی کہانیاں اپنے عہد کی بہترین عکاس ہیں۔ انہوں نے ہندی کی کئی کہانیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی بات کہی۔ صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اس سمینار سے ہندی اردو کے درمیان کی دوریاں یقیناً کم ہوں گی اور نئی ہندی اردو کہانی کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے کناڈا سے آئے معروف افسانہ نگار رضاء الجبار نے شرکت کی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے استقبالیہ کلمات پیش کیے جب کہ شکریہ کی رسم ڈاکٹر علاء الدین خاں نے ادا کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارتضیٰ کریم صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے بحسن وخوبی انجام دیئے۔ اجلاس کا آغاز سعید احمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بعد ازاں ترانہ ہندی ایم اے سال اول کی طالبہ عابدہ اور خوشنما نے اپنی مترنم آواز میں پیش کیا۔

امر نیندر ناتھ، ڈاکٹر عمر فاروق، مدیتا چندرا نے پرچہ پڑھا۔ رضاء الجبار، غضنفر، انجم عثمانی، تسنیم فاطمہ نے اپنی اپنی کہانیاں پڑھیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر انور پاشا، زمرد مغل، ایکادششھ عاصم علی سبزواری نے

مقالات پیش کئے۔ ہندی میں جگندر کمار، محمد علیم، کوثر مظہری، مشتاق صدف نے کہانی کا تجزیہ پیش کیا۔ مسعود اختر، افشاں ملک، سوربھ شرما 'نرچھے' نگار عظیم نے اپنی کہانیاں پڑھیں۔ اسلم جمشید پوری، آشا مشر، بشیر مالیر کوٹلوی اور محسن خاں نے افسانے پیش کئے۔

اس سہ روزہ سیمینار میں 20 مقالے، 20 افسانے، 10 تجزیے پیش کئے گئے ساتھ ہی تقریباً 10 کتابوں کا اجراء عمل میں آیا اور ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔

❁ یکم جون ۰۸ء کو الیاس اشرف نگر چندن پٹی لہریا سرائے دربھنگہ میں وزیر ریل جناب لالو پرساد نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے بی ایڈ کالج (سی ٹی ای، این سی ٹی ای سے منظور شدہ) آئی ٹی آئی (این سی وی ٹی سے منظور شدہ) اور کامران ماڈل اسکول کا افتتاح کیا۔ پروگرام کی صدارت یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد نے کی اور یونیورسٹی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کی قیادت میں یونیورسٹی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ جناب لالو پرساد نے اپنے افتتاحی خطاب میں یو پی اے حکومت کے ذریعہ ترقیاتی کاموں کی تفصیل بتائی اور جناب فاطمی کے ذریعہ تعلیمی میدان میں کرائے گئے کاموں کی ستائش کی اور کہا کہ سچر کمیٹی کے بعد فاطمی کمیٹی بھی بنائی گئی ہے۔ جناب فاطمی نے اپنے خطبہ میں تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے پروفیسر لالو پرساد کا استقبال کیا۔ پرووائس چانسلر کے آر اقبال احمد نے جناب لالو پرساد کو اور رجسٹرار ڈاکٹر پی پرکاش نے جناب ایم اے فاطمی کو مومنٹو پیش کئے۔ مہمان اعزازی شیام رجک، آلوک کمار مہتا ایم پی، ڈاکٹر تنویر حسن ایم ایل سی، انور احمد سابق ایم ایل اے، ڈاکٹر اظہار احمد ایم ایل اے، ڈاکٹر دلیپ کمار چودھری سابق ایم ایل سی، ہرے کرشن یادو ایم ایل اے، پتامبر پاسوان ایم ایل اے، ہری نندن یادو ایم ایل اے، رام نیواس پرساد ایم ایل اے، ڈاکٹر باسو دیو سنگھ ایم ایل سی، جناب مصری لال یادو ایم ایل سی ودیگر سیاسی لیڈران کا استقبال مانو کنبہ کے ذریعہ کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ مانو کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور پروگرام کی نظامت کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر امام اعظم کے کتابچہ ''درپن'' کا اجراء جناب لالو پرساد کے ہاتھوں ہوا۔ مانو کے رجسٹرار ڈاکٹر پی پرکاش نے کلمات تشکر پیش کئے۔ اس افتتاحی تقریب میں ہزاروں ہزار افراد شریک ہوئے۔

❁ یکم جون ۰۸ء کو مدھوبنی ضلع کے بسفی بلاک کے موضع بھگوان میں ''ادبی سنگم'' کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرہ کا افتتاح وزیر ریل جناب لالو پرساد نے کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کا نہ صرف ملک کی آزادی میں اہم کردار رہا بلکہ یہ آج بھی ملک کی بہت ہی مقبول زبان ہے۔ اردو کسی خاص ذات یا مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ اردو زبان کو پورے ملک کے لوگ فخر کے ساتھ بولتے ہیں۔ اپنے ریل محکمہ کی بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مجھے جو محکمہ دیا گیا تھا وہ ہمیشہ گھاٹے میں چلتا تھا لیکن جب سے میں آیا ہوں اس محکمہ کو فائدہ ہی فائدہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہار کی تمام چھوٹی ریل لائن کو بڑی ریل لائن میں تبدیل کیا جائے گا ایک بھی چھوٹی لائن بہار میں نہیں بچے گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ بعض نئے علاقوں کو ریل سے جوڑا جائے گا اور زیر و مائل اونسی میں ریل ٹکٹ کاؤنٹر جلد کھلے گا۔ انہوں نے اسٹیج پر بیٹھے تمام شعراء و شاعرات کو ریلوے پاس اور ۲۵۔۲۵ ہزار روپے دینے کا

اعلان کیا۔ مشاعرہ کی صدارت وزیر مملکت برائے امور داخلہ ڈاکٹر شکیل احمد نے کی اور وزیر ریل جناب لالو پرساد، وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جناب محمد علی اشرف فاطمی اور شعرا و شاعرات کا استقبال کیا۔ یہ کل ہند مشاعرہ نسیم احمد نئے، محمد یعقوب اور احمر حسن ولارے کی انتھک کوششوں سے منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں راحت اندوری، ڈاکٹر نسیم نکہت، انور جلالپوری، شبینہ ادیب، جوہر کانپوری، خوشبو شرما، شائستہ ثنا، سکندر حیات، کنیل کمار تنگ، شاہد یوسفی، پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر ایم اے ضیاء، ڈاکٹر منصور عمر، سلطان شمسی، ڈاکٹر امام اعظم، شکیل احمد سلفی، منجولا اپادھیائے وغیرہ نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کا دل جیت لیا۔ مشاعرہ کو سننے کیلئے دور دور سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوئے تھے۔ جناب انور جلال پوری نے مشاعرہ کی نظامت کی۔

❁ گزشتہ ۶، ۷/ جون ۲۰۰۸ء کو سعودی عرب کے شہر جدہ میں پہلی عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب کے صحرا میں نہ صرف اردو ترقی کر رہی ہے بلکہ وہاں اس کے مسائل اور امکانات پر بھی لوگوں کی توجہ مبذول ہے۔ جدہ میں ہندوستانی قونصل خانہ اور مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے اشتراک سے منعقد کانفرنس کا افتتاح قونصل جنرل سید اوصاف سعید نے کیا، جن کی مساعی جمیلہ سے اس کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ انہوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اردو صرف برصغیر کی زبان نہیں بلکہ یہ روس، یورپ، برطانیہ، کینڈا اور امریکہ کے بیشتر علاقوں میں مقبول ہے۔ سید اوصاف سعید نے کہا کہ جدہ اردو کا ایک اہم مرکز ہے اور یہاں اردو کے فروغ کے لئے اہم کام ہو رہا ہے۔ صدارتی خطبے میں وائس چانسلر پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان نے اردو یونیورسٹی کے ذریعہ ملک اور بیرون ملک جاری تعلیمی اور تربیتی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور سعودی عرب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے امتحانی مراکز اور سرگرمیوں کی تفصیل بیان کی۔ یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر اقبال احمد نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور نظامت فاصلاتی تعلیم کے پروفیسر وہاب قیصر نے دو روزہ کانفرنس کا مبسوط تعارف نامہ پیش کیا۔

ساہتیہ اکیڈمی کے سابق صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نیویارک سے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے جدہ آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اردو پوری دنیا میں خوشبو کی طرح پھیل رہی ہے۔ کناڈا سے تشریف لائے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ اردو ایک زندہ زبان ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا ہندوستان میں اردو جمہوریت اور سیکولرازم کے مستقبل کی علامت ہے۔ قومی کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال نے کہا کہ بنیادی سطح پر اردو کی تعلیم کے بغیر اردو کا تحفظ ممکن نہیں ہے۔ اس کانفرنس میں جن دیگر اہم شخصیات نے حصہ لیا ان میں جناب زاہد علی خاں (ایڈیٹر روزنامہ 'سیاست') حسام الاسلام صدیقی (ایڈیٹر 'جدید مرکز')، ظفر علی نقوی، ڈاکٹر بصیر احمد خاں (پرووائس چانسلر اگنو)، معصوم مرادآبادی کے علاوہ قطر سے عبدالکریم چوگلے، ریاض سے عذرا نقوی اور نعیم جاوید اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے پروفیسر محمد ظفرالدین، ڈاکٹر شجاعت علی راشد، ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر محمد احسن، ڈاکٹر نجم السحر، ڈاکٹر مسرت جہاں، سید جمال قادری، سراج وہاب، مہتاب قدر اور ہمیرہ عزیز کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سہیل اعجاز خاں نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار سے قبل عالمی مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں رحمٰن جامی، محسن جلگانوی، عالم خورشید، اقبال اشہر وغیرہ شعراء نے شرکت کی اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

۲۷ر جولائی ۰۸ء کو ساہتیہ اکیڈمی اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کے باہمی اشتراک سے ممتاز شاعر اور دانشور جناب مظہر امام کی ادبی خدمات پر پہلی بار یک روزہ مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مذاکرہ میں کل آٹھ مقالے پڑھے گئے۔ پہلے سیشن کی صدارت ممتاز نقاد و دانشور پروفیسر وہاب اشرفی اور دوسرے سیشن کی صدارت معروف افسانہ نگار عابد سہیل نے کی۔ سیمنار پر کلیدی خطبہ پروفیسر وہاب اشرفی نے پیش کیا جس کو کافی سراہا گیا۔ پروفیسر حسین الحق، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر منصور عمر، قاسم خورشید، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مولا بخش نے اپنے مقالات پیش کئے۔ مذاکرہ کے بعد شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت نامور شاعر اور دانشور پروفیسر شہریار نے کی جس میں ڈاکٹر ظہیر غازی پوری، بھگوان داس اعجاز، سلطان اختر، فرحت احساس، عنبر بہرائچی، شان بھارتی، عالم خورشید، جمال اویسی اور خورشید اکبر نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے اردو مشاورتی کمیٹی کے کنوینر جناب عنبر بہرائچی نے مذاکرے کے آغاز میں مندوبین اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔

سینئر جرنلسٹ عابد عبدالواسع نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پبلک ریلیشنز آفیسر کی حیثیت سے 28 اپریل 2008ء کو عہدہ سنبھالا۔ اس سے قبل وہ حیدرآباد کے موقر اردو اخبار ''منصف'' میں بحیثیت اسوسیٹ ایڈیٹر کارگزار تھے۔ وہ اردو یونیورسٹی کے شعبہ جرنلزم میں لیکچرر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ عابد عبدالواسع نے 1991ء میں حیدرآباد کے مشہور کالج انوار العلوم سے بی اے کی تکمیل کی۔ اسی کالج سے ایل ایل بی اور پھر اردو آرٹس ایوننگ کالج سے بی سی جے کے بعد آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے ماسٹرس ان کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم کی تکمیل کی۔ 1992ء میں انہوں نے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے اردو سکیشن میں نوجوانوں کے پروگرام یواوانی سے وابستگی اختیار کی۔ وہ کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کیلئے اردو علاقائی خبریں بھی پیش کرچکے ہیں۔ اگست 1993ء میں روزنامہ منصف سے وابستہ ہوئے۔ 2001ء میں ہندوستان کے پہلے اردو ٹی وی چینل ای ٹی وی اردو کے نیوز ڈسک پر بطور سینئر کاپی ایڈیٹر کام کیا۔ 2002ء میں منصف سے دوبارہ وابستگی کے بعد جنوری 2004ء میں حکومت امریکہ کی دعوت پر امریکہ کا 7 ہفتے طویل مطالعاتی دورہ کیا۔ جنوبی ایشیا سے اس اہم دورہ کے لئے منتخب سہ رکنی وفد میں شامل وہ واحد اردو صحافی تھے۔ واشنگٹن 'نیویارک' سینٹ لوئس' سان فرانسسکو اور شکاگو سے لکھے گئے ان کے سفرنامے روزنامہ ''منصف'' کے شنبہ سپلیمنٹ ''نقوش'' کی زینت بنے۔ امریکہ میں انہیں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ (محکمہ خارجہ) پنٹاگان (محکمہ دفاع) کے علاوہ کئی اہم سرکاری محکموں کے دفاتر کے معائنے اور اعلیٰ عہدیداروں سے امریکہ کی خارجہ پالیسی پر تبادلہ خیال کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس دورہ میں انہیں اقوام متحدہ ہیڈکوارٹرز' کولمبیا یونیورسٹی' اسٹانفرڈ اور برکلے جیسی عالمی شہرت یافتہ جامعات کے مشاہدہ اور پروفیسرس نیز ماہرین کے ساتھ تبادلہ خیال کا بھی موقع ملا۔ 2004ء کے اواخر اور 2005ء کی ابتدا میں انہوں نے کچھ عرصہ تک دبئی سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ ''اردو پوسٹ انٹرنیشنل'' کی ادارت بھی سنبھالی۔ حالات حاضرہ پر تجزیہ اور تبصرہ پر مشتمل ان کے کئی مضامین روزنامہ منصف اور اردو پوسٹ انٹرنیشنل میں شائع ہوچکے ہیں۔ کالج اور ریڈیو سے

وابستگی کے زمانے میں وہ شاعری بھی کر چکے ہیں۔ آکاش وانی حیدرآباد کے نوجوانوں کے پروگرام یواوانی میں ان کی شاعری ''کلام شاعر'' پروگرام کی زینت بن چکی ہے۔ کالج کے زمانے میں لکھی گئی ایک غزل کے دو شعر ڈاکٹر امام اعظم کی نذر:

درمیاں سمندر کے جو ہم سے دل لگاتے ہیں　　نہ جانے کیوں وہ ساحل پر ہم کو بھول جاتے ہیں
دل میں غم یقیناً ہے، آنکھ بھی تو پرنم ہے　　نہ جانے کیوں یہ دل والے پھر بھی مسکراتے ہیں

❁ بہار کی معروف ادبی تنظیم علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام اردو بھون پٹنہ میں بزرگ شاعر جناب شگفتہ سہسرامی کے تین شعری مجموعے کا اجراء ہوا۔ ڈاکٹر امجد رضا امجد کی تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ بعدہٗ صدر محفل معروف نقاد پروفیسر وہاب اشرفی، مہمانان خصوصی جناب ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر شمیم الدین احمد منعمی اور ڈاکٹر منظر اعجاز کے ذریعہ شگفتہ سہسرامی کے شعری مجموعے ''یا صاحب الجمال'' ''شانتی اور جستجو'' کا اجراء عمل میں آیا۔ علمی مجلس بہار کے جنرل سکریٹری پرویز عالم نے اس موقع سے موجود سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اسٹیج پر موجود مہمانوں کو گلدستہ پیش کر کے خیر مقدم کیا۔ پہلے جلسہ کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر زین رامش نے انجام دیئے۔

مشاعرہ کی صدارت جناب ناوک حمزہ پوری نے کی اور نظامت ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے انجام دی، جن شعرائے کرام نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ڈاکٹر منظر عالم ضیاء عظیم آبادی، ڈاکٹر کمال احمد، ڈاکٹر منظر اعجاز، شمیم قاسمی، منیر سیفی، صغیر ساگر، شکیل سہسرامی، بیجناتھ پانڈے، ارپی بھائل، نریندر سنگھ ہند، تبسم ناز، فرد الحسن فرد، چونچ گیاوی، منور داناپوری، ام اشرف، ضیاء الرحمٰن ضیاء، میر سجاد، احسن راشد، نسیم احمد نسیم، اصغر حسین کامل، بدر محمدی، استاد پٹنوی، معصوم شرقی امیر، ناوک حمزہ پوری، معین کوثر۔ ان کے علاوہ حاضرین جلسہ کے چند اہم نام جناب مولانا ابوالکلام قاسمی، عبید قمر، حسن احمد، نذیر الدین حیدر، علی اکبر، ریاض الدین اشرف، محمد جاوید، محمد توحید عالم، صابر سیوانی، نور الہدیٰ شمسی، وغیرہم۔

❁ عبدالرحمٰن عبد دھنبادی کے مطابق اکتوبر ۰۸ء کے آخری ہفتہ میں ریاست جھارکھنڈ کے چار بڑے شہروں میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی چار نئی کتابوں کا اجراء ہوا۔ کتاب ''تنقید کا نیا منظر نامہ اور وزیر آغا'' کا اجراء جن وادی لیکھک سنگھ، رانچی کی طرف سے ہوٹل سیٹی پیلس میں پروفیسر صدیق مجیبی کے ہاتھوں ہوا۔ صدارت بنگلور سے آئے ہوئے مہمان خصوصی منظر قدوسی نے کی۔ نظامت ایم زیڈ خان کی تھی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور کے بینر تلے ہوٹل ایشین ان میں کتاب ''اختر پیامی کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ'' کا اجرا انجمن کے صدر سید رضا عباس رضوی چھتن کے ہاتھوں ہوا۔ صحافی ممتاز شارق کنوینر تھے۔ گلستان ادب، دھنباد کی جانب سے مسکان کمپلیکس میں کتاب ''ابراہیم اشک: تجربہ کار رباعی گو'' کا اجرا پروفیسر سید منظر امام کے ہاتھوں ہوا۔ سہ ماہی ''رنگ'' کے مدیر شان بھارتی نے نظامت کی۔ جاجنیری بلب لائن اینڈ ویلفیئر چیریٹیبل ٹرسٹ، ہزاری باغ کے زیر اہتمام جاجنیری ہاؤس میں کتاب ''خورشید جہاں: حیات اور فن'' کا اجراء پروفیسر شیودیال سنگھ، صدر شعبہ ہندی، ونوبا بھاوے یونیورسٹی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ صدارت لیبر کمشنر ایم اے حق نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر

زین رامش نے ادا کیے۔ سبھی پروگرام میں شہر کے بیشتر قلمکار اور دیگر معززین و دانشور موجود تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر رام کرشن ساشتری، چیئرمین انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل ہری ٹیج'' کولکاتہ کی اطلاع کے مطابق ۵ تا ۸ رفروری ۲۰۰۹ء کو منعقد ہونے والے انٹرنیشنل کانفرنس میں مغربی بنگال کے گورنر کے ہاتھوں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی بھاگلپور یونیورسٹی اور مدیر کوہسار ۵ رفروری ۲۰۰۹ء کو ڈاکٹر بینگھ نند ساہا ایوارڈ'' سے نوازے جائیں گے۔ اس کانفرنس میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، اسپین، جاپان، چین، ملیشیا، سری لنکا، میانمار، بنگلہ دیش اور نیپال کے دانشور شریک ہوں گے۔ ڈاکٹر ہرگانوی کی اب تک ۱۱۳ کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کے لکھے پر نو کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور ملک کی کئی یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی ہو چکی ہے۔

مرکزی حکومت نے ہر سال مولانا آزاد کے یوم پیدائش ۱۱ نومبر کو ''یوم تعلیم'' کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے چنانچہ ملک بھر میں مختلف تقریبات میں مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور ان کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ دور میں ان کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد چیئر شعبہ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی میں ''مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیتی اور تحریری جہتیں'' کے عنوان سے صوبائی سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر مصری لال ٹھاکر نے کی جب کہ افتتاح قادر الکلام شاعر پروفیسر عبدالمنان طرزی نے کیا۔ انہوں نے مولانا آزاد کی حیات و خدمات پر مشتمل اپنی نظم پیش کی۔ ڈائرکٹر مولانا آزاد چیئر پروفیسر رئیس انور نے شرکا اور مولانا آزاد چیئر کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی کو نظامت کی ذمہ داری دی۔ وائس چانسلر نے مولانا آزاد کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مولانا کی تعلیمات آج بھی قابل عمل ہیں۔ پروفیسر دیاندھی رائے نے بطور خاص مولانا کے قومیت کے نظریہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ عہد حاضر میں مولانا کی تعلیمات کو عام کرنا بے حد ضروری ہے۔ شعبہ کے استاد پروفیسر ارشد جمیل نے اظہار تشکر کیا۔ وقفہ کے بعد ٹیکنیکل اجلاس کا آغاز ہوا۔ پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر ناز قادری، جناب شمیم فاروقی اور پروفیسر پربھاکر پاٹھک مجلس صدارت کے اراکین تھے۔ پروفیسر رئیس انور نے اپنے مقالہ میں مولانا آزاد کے افکار اور مولانا آزاد چیئر کی کارکردگی پر سیر حاصل بحث کی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ریجنل سنٹر دربھنگہ کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے ملک کے اولین وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کی خدمات اور ان کے تعلیمی افکار و تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ پہلے وزیر تعلیم کے طور پر مولانا نے جو تعلیمی پالیسی اختیار کی اسی کے نتیجہ میں ہندوستان نے ترقی حاصل کی۔ انہوں نے ایم او متھائی کی کتاب ''ریمر نیس آف نہرو ایج'' میں مولانا کی غلط تصویر پیش کیے جانے پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ آج کے دن اس کی مذمت کی جانی چاہئے۔ ڈاکٹر محمد ارشد جمیل، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر مبین صدیقی، ڈاکٹر قیام نیر، ڈاکٹر سید حسین احمد (آرہ) جمال اویسی، ڈاکٹر عبدالودود قاسمی، محمد بدرالدین وغیرہ نے مولانا آزاد کی شخصیتی اور تحریری جہتیں پر سیر حاصل گفتگو کی اور پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر ناز قادری، جناب شمیم فاروقی اور پروفیسر پربھاکر پاٹھک نے پیش کیے گئے مقالات کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ سمینار میں ڈاکٹر سید احتشام الدین، حیدر

وارثی، ڈاکٹر خالد سجاد، محترمہ ممتاز فرحت کے علاوہ یونی ورسٹی کے اساتذہ و طلبا و طالبات اور بڑی تعداد میں دیگر اہل علم نے شرکت کی۔

❁ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی دربھنگہ کے ریجنل سنٹر پر منعقد ایک پر وقار تقریب میں مولانا آزاد کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے ریجنل ڈائرکٹر امام اعظم نے کہا کہ مولانا کا یوم پیدائش یوم تعلیم کے طور پر منانا ان کو سچی خراج عقیدت ہے۔ مولانا کے نام پر قائم یونیورسٹی تعلیم کے فروغ کیلئے کوشاں ہیں اور تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ انہوں نے ایک قطعہ بھی پیش کیا:

گیارہ نومبر کا موقع تو ہے یوم تعلیم — مولانا آزاد کی دنیا کرتی ہے تعظیم
آپ وزیر علم تھے ہندوستان کے سب سے پہلے — آپ تو اپنی ذات کے اندر تھے خود ہی تنظیم

مدیر الہدیٰ شکیل سلفی نے کہا کہ مولانا آزاد کو سچی خراج عقیدت یہی ہوگی کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ فروغ ملے اور محروم طبقات تک تعلیم کی روشنی پہنچائی جائے۔ اس موقع پر پروفیسر ابصار الحق، ڈاکٹر فیض احمد، مظفر حسن، شفاعت حسین، حسن امام فاروقی وغیرہ نے بھی مولانا آزاد کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ (این آئی او ایس) دربھنگہ کے سب ریجنل سنٹر کے آفس انچارج جناب حسن وارثی نے بھی اپنے یہاں مولانا آزاد ڈے کا انعقاد کر کے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔

❁ ملت ہائی اسکول دھنباد جھارکھنڈ کی سینئر معلمہ ڈاکٹر محترمہ شاہینہ پروین (امام) فاطمہ ہاؤس واسع پور، دھنباد کو 15 نومبر ۰۸ء کو جھارکھنڈ کے وزیر اعلیٰ نے اپنے ہاتھوں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ سے نوازا۔ جھارکھنڈ کے دھنباد ضلع سے 3 اساتذہ کو حکومت نے یہ ایوارڈ دیا ہے۔ ڈاکٹر محترمہ شاہینہ پروین جنھوں نے ایل این متھلا یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ہے اور ملت ہائی اسکول کی سینئر معلمہ ہیں، پروفیسر سید منظر امام کی اہلیہ اور سہ ماہی وقت کی نائب مدیرہ ہیں۔ ان کی اسکول میں بہتر کارکردگی کے سبب انہیں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔

❁ کراچی، (پاکستان) آرٹس کونسل کی جانب سے نومبر ۲۰۰۸ء کے اواخر میں منعقد کی گئی ہفت روزہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ نئے ملک اور نئی سرحدیں راتوں رات نہیں بن پاتیں۔ زبان اور تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے میں صدیاں گذر جاتی ہیں۔ اردو ہند اسلامی مشترکہ تہذیب کی کمائی ہے۔ اس تہذیب نے دنیا کو آشتی اور انسانیت کا پیغام دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پیغام کو دنیا میں ایک پھر عام کیا جائے۔

❁ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی ٹیچرس ایسوسی ایشن کا پہلی بار انتخاب عمل میں آیا اور اس طرح مانوٹا کی تشکیل عمل میں آئی۔ ۶ ستمبر ۰۸ء کو منعقد ہونے والے انتخابات میں مختلف عہدوں کے لئے درج ذیل افراد کا انتخاب عمل میں آیا: صدر: پروفیسر ایس۔ اے۔ وہاب (وہاب قیصر)، نائب صدر ڈاکٹر مرزا شوکت بیگ، جنرل سکریٹری: ڈاکٹر عبدالقیوم، جوائنٹ سکریٹری: ڈاکٹر سلمٰی احمد فاروقی، جوائنٹ سکریٹری (پبلسٹی) جناب اشونی۔

❁ برطانیہ میں مقیم ممتاز قلمکار، مورخ اور سماجی شخصیت ڈاکٹر ودیا ساگر آنند ورلڈ اکیڈمی آف لیٹرس کے

وائس چانسلر منتخب کئے گئے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قائم اس ممتاز ادارہ نے ڈاکٹر آنند کو ان کی عظیم صلاحیتوں اور حصولیابیوں کے اعتراف میں وائس چانسلر منتخب کیا ہے۔ ورلڈ اکیڈمی آف لیٹرس سے جاری اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ "وائس چانسلر کی حیثیت سے آپ اہم کردار ادا کریں گے"۔ اس سلسلہ میں منعقد ایک تقریب میں ڈاکٹر آنند کو اس موقر آفس کا ڈپلومہ اور دوسری علامات طب، تعلیم، فنون لطیفہ، ٹکنالوجی اور دیگر میدانوں کی ممتاز شخصیتوں کی موجودگی میں پیش کی گئیں۔

❁ منصوبہ بندی کمیشن کی رکن، محترمہ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے تمبر ۲۰۰۸ء میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے تیسرے چانسلر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔ انہیں پروفیسر عبید صدیقی کے بعد چانسلر نامزد کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ سیدین ماہر تعلیم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر خواجہ غلام السیدین کی صاحبزادی ہیں۔ ان کا تعلق ہریانہ کے میوات سے ہے۔ نیز انہیں مولانا الطاف حسین حالی کے خانوادہ سے نسبت ہے۔ ڈاکٹر سیدہ خواتین کے حقوق کے لئے ہمیشہ سرگرم رہی ہیں۔

❁ مولانا محمد اعجاز احمد (موضع سوبھن، دربھنگہ) کو بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا چیرمین نامزد کیا گیا ہے۔ موصوف اس سے قبل مدرسہ فلاح المسلمین بھوارہ میں تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہیں تدریسی خدمات کے لے صدر جمہوریہ اعزاز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ مدرسہ سے وابستہ کسی شخص کو بورڈ کا چیرمین بنایا گیا ہو۔ موصوف متحرک اور فعال شخصیت کے مالک ہیں۔

❁ معروف شاعر اور مصور جناب جینت پرمار کو اردو میں ان کے شعری مجموعہ "پنسل اور دوسری نظمیں" پر ۲۰۰۸ء کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا ہے۔ فروری ۲۰۰۹ء میں انہیں یہ ایوارڈ پیش کیا جائے گا۔

❁ جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کی جانب سے فیاض احمد وجیہہ کو ایم اے (اردو) میں ان کی غیر معمولی کارکردگی کے لئے سجاد ظہیر ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ واضح ہو کہ اس یوارڈ میں ایک اچھی رقم کے علاوہ توصیفی سند شامل ہے جو ہر سال ایم اے اردو ادب میں غیر معمولی کامیابی کے لئے کسی ایک طالب علم کو دیا جاتا ہے۔ فیاض احمد وجیہہ اس یونیورسٹی میں فی الحال ایم فل کر رہے ہیں۔

ادارہ ان تمام حضرات کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہے۔

وفیات:

❁ معروف صحافی، شاعر اور ادیب جناب پروانہ ردولوی کا ۱۲ر اپریل ۲۰۰۸ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً ۷۴ سال تھی۔ پروانہ ردولوی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں یوپی اسمبلی میں رپورٹر کی حیثیت سے کیا اس کے بعد ہفت روزہ "نئی دنیا"، "ہندوستان" روزنامہ "ممبئی"، "دعوت"، "ملک وملت"، "قائد" وغیرہ میں اپنی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے اپنا روزنامہ "سیاست نو" کانپور سے جاری کیا جو ۱۹۵۷ء میں بند ہو گیا۔ انہوں نے ۱۹۶۹ء میں روزنامہ پرتاپ، نئی دہلی میں ملازمت اختیار کی اور ۱۹۹۰ء تک اس کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں اردو صحافت کا استغاثہ، مختصر کہانیوں کا مجموعہ 'جوتک'

نجات کا راستہ، ہو بہو (خاکے) کے علاوہ دو ناول ''آزمائش'' اور ''ویرانی نہیں جاتی'' لکھے۔ ان کے علاوہ طویل نظم ''شمع''، ''کربلا کی بہادر خواتین''، ''قاتلانِ حسین کا عبرت ناک انجام''، ''اسپین سے بوسنیا تک'' جیسی تاریخی کتابوں کے علاوہ نوسٹراڈیمس کی سچی اور حیرت انگیز پیشین گوئیاں سمیت چند کتابوں کے اردو ترجمے کئے جن میں جلیاں والا باغ کا ہیرو، توڑ اور توڑ ا، انڈیا ۲۰۰۱ء وغیرہ شامل ہیں۔ انہیں فلم اولوکن ایوارڈ، ماتر شری ایوارڈ، صحافت میں خدمات کے لئے عالمی اردو ایوارڈ، دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ برائے صحافت، یوپی اردو اکیڈمی ایوارڈ برائے مختصر کہانیاں، مترقلم ایوارڈ، بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ کے علاوہ رام کشن جئے دیال ڈالمیا ایوارڈ برائے قومی یکجہتی سے بھی نوازا گیا۔ مرحوم پروانہ ردولوی کے فرزند جناب تحسین منور بھی معروف صحافی اور شاعر ہیں اور ان دنوں یو این آئی اردو سروس سے وابستہ ہیں۔

❁ معروف شاعر و ادیب جناب نقی احمد ارشاد کا مارچ ۰۸ء پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ وہ شاد عظیم آبادی کے نبیرہ تھے۔ اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدہ سے سبکدوش ہو کر شعر و ادب کی خدمت دلجمعی سے کر رہے تھے۔ انہوں نے شاد کی بہت سی غیر مطبوعہ تحریروں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تخلیقات دیگر رسائل و جرائد کے علاوہ تمثیل نو میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان کی عمر تقریباً ۹۰ سال تھی۔

❁ نقی احمد ارشاد کے بڑے بھائی معروف شاعر سید سلطان احمد معروف بہ بہزاد فاطمی ۳/مئی ۲۰۰۸ء کو دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی ولادت یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء کو شاد منزل پٹنہ میں ہوئی۔ ان کی عمر ۹۰ سال سے متجاوز تھی۔ وہ سول سروس سے سبکدوش ہو کر شعر و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ ان کے ۲ شعری مجموعے ''نیاز بہزاد'' اور ''نقوش بہزاد'' شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات ہندو پاک کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

❁ نامور شاعر پروفیسر حفیظ بنارسی کا ۱۶/جون ۰۸ء کی صبح بنارس میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۵ برس کے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں اور ۵ بیٹے ہیں۔ پروفیسر حفیظ بنارسی مہاراجہ کالج آرہ سے بحیثیت صدر شعبہ انگریزی ۱۹۹۵ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کے کئی شعری مجموعہ شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں جن میں درخشاں، قول و قسم، بادۂ عرفاں، غزالاں، بندۂ مومن، قصیدۂ نبی رحمت قابل ذکر ہیں۔ ان کی ادبی و شعری کاوش پر بہار، یوپی اور بنگال اردو اکیڈمیوں کے انعامات کے علاوہ آل انڈیا میر اکیڈمی ایوارڈ بھی ملا ہے۔ وہ مشاعروں کے بیحد پسندیدہ شاعر تھے۔ ''تمثیل نو'' اور اس کے مدیر سے ان کی خاص قربت تھی اور وہ دربھنگہ کے آل انڈیا مشاعروں میں بھی شریک ہوئے تھے۔ نوجوان شاعر اور سائنٹسٹ ڈاکٹر عبیدالرحمن ان کے خویش ہیں۔ کلیات حفیظ بنارسی ''سفیر شہر دل'' کے نام سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

❁ مشہور نقاد اور شاعر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ۱۵/مئی ۲۰۰۸ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے۔ وہ ۲۵/جون ۱۹۳۲ء کو کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد کراچی چلے گئے۔ غلام ثاقب کانپوری کے بڑے صاحبزادہ تھے۔ ۱۹۵۹ء میں جامعہ کراچی میں لکچرار ہوئے۔ جاپان کے اوساکا یونیورسٹی میں بھی مہمان پروفیسر کی حیثیت سے

خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۱ء میں انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی۔ کشفی نے تقریباً دو درجن کتابیں تصنیف وتالیف کیں جن میں اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر (۱۷۰۷ تا ۱۸۵۷ء) ہمارے عہد کا ادب وادیب' 'جدید اردو ادب کے تنقیدی جائزے' 'ہمارے ادبی اور لسانی مسائل'۔ یہ لوگ بھی غضب کے تھے اور 'وطن سے وطن تک' اور 'غالب کی ۶ غزلیں' ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بہت سے تحقیقی وتنقیدی اور سوانحی مضامین ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کشفی صاحب کو نعت گوئی سے خصوصی شغف تھا۔

❁ اردو فکشن کے اہم ستون احمد یوسف کا ۱۸؍ جون ۰۸ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً ۷۸ برس کے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہونے والے احمد یوسف نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی اور بعد میں یہیں سے ''اردو ناولوں میں خواتین کے کردار'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ان کے ۴ افسانوی مجموعوں روشنائی کی کشتیاں، آگ کے ہمسایے، ۲۳ گھنٹے کا سفر، رزم گاہ بزم کے علاوہ تین ناولٹ کا مجموعہ جلتا ہوا جنگل، منظر عام پر آچکے ہیں۔ مرحوم ایک عرصہ تک بہار اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین بھی رہے۔ ''تمثیل نو'' اور اس کے مدیر سے بڑی قربت رکھتے تھے۔

❁ طنز ومزاح کے ممتاز اور مقبول شاعر ساغر خیامی کا انتقال ۱۹؍ جون ۲۰۰۸ء کو ممبئی میں ہوگیا۔ ساغر خیامی کا اصل نام سید رشید الحسن تھا جو لکھنو کے ایک علمی خانوادہ میں ۷؍ جون ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی سید اولاد حسین دینی اور علمی حلقوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھتے جاتے تھے اور شاعر لکھنوی کے تخلص سے اردو دنیا میں معروف تھے۔ ساغر خیامی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے ایک مدت تک یاد کیے جائیں گے۔ انہوں نے ابتذال زدہ ماحول میں بھی فن اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کے ۳ مجموعے انڈر کریز، قہقہوں کی بارات اور پس روشنی شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ انہیں ۱۹۹۷ء میں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۲۸؍ مارچ ۲۰۰۶ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل سنٹر دربھنگہ کے تحت منعقد ہونے والے عالمی مشاعرہ کی نظامت انہوں نے ہی کی تھی اور اپنے کلام سے محفل کو قہقہہ زار بنادیا تھا۔ مرحوم کی تدفین لکھنو میں عمل میں آئی۔

ادارہ ان حضرات کی رحلت پر اپنی سوگواری کا اظہار کرتے ہوئے مغفرت کی دعا کرتا ہے!

...........امام اعظم

ڈاکٹر منصور عمر، ریڈر، شعبۂ اُردو، سی۔ایم۔کالج، دربھنگہ (بہار)

قطعاتِ تاریخ بر وفاتِ مشاہیرِ علم ادب

نقی احمد ارشاد

گلشنِ شاد میں کیسا ماتم ہے یہ — وہ نقی احمد ارشاد رخصت ہوا
سال رحلت کی جو فکر مجھ کو ہوئی — بولا ہاتف کہ لکھ ''خوشنما باغچہ''
۲۰۰۸ء

پروانہ ردولوی

صحافی اور شاعر تھا جو پروانہ — لکھا جائے گا اب خود اس کا افسانہ
مجھے تاریخ جب لکھنے کی سوجھی — کہا ہاتف نے لکھو ''بجتِ نذرانہ''
۲۰۰۸ء

بہزاد فاطمی

موت پر اس کی ہم کیوں نہ ماتم کریں — چہچہاتا تھا جو رہتا تھا نغمہ بار
ساتھ بہزاد کے آج رخصت ہوئی — گلشن شاد سے ''شوکتِ افتخار''
۲۰۰۸ء

حفیظ بنارسی

تو چل بسا، رہے گی مگر تیری شاعری — جنت کی آس میں جو گذاری تھی زندگی
رہنا ہو مبارک تجھے آغوشِ حور میں — جی بھر کے ''تیر کھانا حفیظِ بنارسی''
۲۰۰۸ء

ابوالخیر کشفی

وہ نقاد شاعر وہ عمدہ معلم — ہوئی زندگی آج اس کی بھی پوری
ہے منصور کو فکرِ تاریخِ رحلت — کہو ''ہشت پہلو ابوالخیر کشفی''
۲۰۰۸ء

احمد یوسف

وہ اک محقق وہ ایک فکشن نگار یوسف — رہا جہانِ ادب میں با اختیار ہوکر
عدم کی جانب نکل پڑا دے کے یاد اپنی — وہ روشنائی کی کشتیوں میں سوار ہوکر
۱۵
۱۵+۱۹۹۳=۲۰۰۸ء

ساغر خیامی

روٹھ گیا ہم سب سے شاہِ طنز و مزاح — ساری دنیا جس کے فن کی دیوانی
لکھنے بیٹھا رحلت کی تاریخ میں جب — بولا ہاتف ''چنچل ساغر خیامی''
۲۰۰۸ء

فرحت حسین خوشدل، ہزاری باغ، جھارکھنڈ

حمد باری تعالیٰ

خدایا میں کروں تیری ثنا اوّل سے آخر تک
کہاں ممکن، کروں میں حق ادا اوّل سے آخر تک

میرے اعمال کب ہیں عفو کے قابل میرے مولیٰ
تیری رحمت کی ہو مجھ پہ ردا اوّل سے آخر تک

سنا ہے حشر میں شانِ کریمی کام آئے گی
بس اک امید ہے روز جزا اوّل سے آخر تک

یقیناً لوح بھی تیری قلم تیرا جہاں تیرا
مجھے مل جائے بس تیری رضا اوّل سے آخر تک

شریعت ہو، طریقت ہو کہ یا ہو معرفت یا رب
بصیرت کی نظر تو کر عطا اوّل سے آخر تک

کروں میں بندگی تیری دعا مانگوں تو بس تجھ سے
خدایا بخش خوشدل کی خطا اوّل سے آخر تک

❁

وارث ریاضی، بسوریا سکٹا، مغربی چمپارن

نعت پاکؐ

زندگی شوق کا حاصل مری یاد رسول
لوحِ دل سے مٹ نہیں سکتی کبھی یاد رسول

مظہر شانِ خدائے دوجہاں ان کا وجود
کاشفِ اسرارِ علم و آگہی یاد رسول

باعث امن وامانِ زندگی ان کا پیام
رونقِ بزم خلوص وراستی یاد رسول

جب ہجوم گردش دوراں سے گھبراتا ہے دل
دور کر دیتی ہے ساری بے کلی یاد رسول

ان کے ذکر خیر سے شاداب ہے دل کا چمن
یوں بڑھا دیتی ہے لطف زندگی یاد رسول

عشق کو پاکیزگی دی، قلب کو سوز وگداز
دے گئی ہے فکر کو سنجیدگی یاد رسول

مدحتِ خیر البشر میری متاعِ زندگی
اور میرا مدعائے شاعری یاد رسول

رحمت عالم کے لطف بے نہایت کے طفیل
بن گئی ہے میری وجہ بے خودی یاد رسول

اے ہجوم شوق! لے چل جانب طیبہ مجھے
اے سرشک یاس تھم جا آگئی یاد رسول

دولت ایماں، غم عقبیٰ، اطاعت کا شعور
اور میرے رب نے وارثؔ مجھ کو دی یاد رسول

❁

پروفیسر نظیر صدیقی کے خطوط

(۲۵)

اسلام آباد: ۹؍اکتوبر ۱۹۹۷ء۔ عزیز مکرم سلام و رحمت۔ آپ کا خط جس کا ہمیشہ انتظار رہتا ہے ۷؍اکتوبر کو ملا۔ کہا جاتا ہے کہ اب دنیا سے خط لکھنے کا کلچر ختم ہو چلا ہے۔ اب ساری باتیں فون، فیکس اور ای میل پر ہو جاتی ہیں۔ البتہ ابھی تیسری دنیا کے باشندوں میں خط کی متبادل صورتوں کا استعمال نسبتاً کم ہے۔ اسباب ظاہر ہیں۔ بہر حال غنیمت ہے کہ میں اور آپ اس معاملے میں 'باقیاۃ الصالحات'' میں سے ہیں۔

الیاس احمد گدی غیاث احمد گدی کے چھوٹے سگے بھائی تھے۔ افسانہ نگاری میں غیاث نے زیادہ ہی اہمیت حاصل کی۔ ویسے مجھے الیاس کے افسانے غیاث سے زیادہ متاثر کرتے رہے۔ الیاس نے اپنے ناول پر ساہتیہ اکیڈمی کا انعام حاصل کر کے غیاث پر برتری حاصل کر لی۔ غیاث افسانے اور ناول دونوں میں الیاس سے پیچھے رہ گئے۔ ایک خط پوسٹ کر دیجئے گا۔ غیاث عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے اور الیاس چھوٹے۔ اب جو آپ نے الیاس کی عمر تقریباً ۶۵ لکھی ہے تو مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ کیا میں الیاس سے صرف دو سال بڑا تھا۔ مجھے اس عمر میں شبہ ہے۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ رسمی تعلیم الیاس کی بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ ان کے خاندانی پیشے (گوالا ہونا) نے دونوں کو مار رکھا تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ اس نے ایسی صلاحیت کے دو بھائی بھینسیں پالنے والے اور دودھ بیچنے والے گوالوں کے ہاں پیدا کر دیئے۔ دونوں کو بہتر ماحول کی بہتر سہولتیں ملتیں تو نہ جانے وہ کیا ہوتے۔ پاکستان کے ادبی حلقوں میں الیاس کی وفات کا علم ہو چکا ہے۔ الیاس کے کچھ غیر مطبوعہ افسانے ہوں تو آپ لوگ چھپوا دیں۔ آپ دھنباد جائیں تو الیاس کے گھر جا کر تمام عزیزوں سے میری طرف سے بھی تعزیت کریں وہ تمام لوگ مجھے جانتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں میں صرف غیاث کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے جھریا گیا تھا۔ میں جھریا میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک رہ چکا ہوں۔

ستمبر میں بنگلہ دیش کے ایک بنگالی نژاد اردو افسانہ نگار غلام محمد (جو خاصے مشہور ہو چکے تھے) کا بھی اچانک انتقال ہو گیا۔ غلام محمد ڈھاکے میں میرے شاگرد بھی رہ چکے تھے۔ ایک حد تک الیاس بھی شاگرد تھے۔

'پروین شاکر کے خطوط' کے معاملے میں میں پھر ناشر کو لکھ چکا ہوں۔ اب ان کا خط آئے تو پتا چلے کہ وہ میری ہدایت پر عمل کر سکے یا نہیں۔ آپ کے پاس چار پانچ جلدیں پہنچیں گی۔ کچھ لوگوں کو بھیج دیجئے گا۔ اپنے ارد گرد کے احباب میں ڈاکٹر منصور عمر اور ڈاکٹر مظفر مہدی کو اپنا نسخہ ضرور پڑھوا

دیا کیجئے۔ یہاں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ کتاب بھیجنا ممکن نہیں ہوتا۔ آج کل تو لوگ خطوں کا جواب تک نہیں بھیجتے۔

خشونت سنگھ کی ہینڈ رائٹنگ بے حد خراب ہے۔ بالکل ناقابل پڑھ۔ ویسے ان کا یہ اخلاق غنیمت ہے کہ کتابوں کی رسید بھیج دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بے حد مصروف آدمی ہیں۔ ان کے پاس ہم جیسوں کے ساتھ خط و کتابت کی فرصت کہاں۔

ڈاکٹر نارنگ بھی عدیم الفرصت اور جہانیاں گشت آدمی ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا جب بھی میں ان سے اصرار نہ کرتا کہ وہ مجھے ہندوستان بلائیں۔ اگر بلائیں گے تو آنے کی کوشش کروں گا خصوصاً اس لئے کہ بہت ممکن ہے یہ میرا ہندوستان کا آخری دورہ ہو۔ اب زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے۔ آپ مظہر امام کو لکھ سکتے ہیں کہ غالب سیمینار میں نظیر صدیقی کو مقالہ پڑھنے کے لئے نہیں ہم لوگوں سے ملنے کے لئے بلوایا جائے۔

معصوم عزیز کاظمی صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے میری کتابیں پڑھنے کی زحمت گوارا کی۔ ان سے میرا اسلام کہئے شاید کبھی ملاقات ہو سکے۔

نوشاد میرے بہت بے تکلف دوستوں میں سے ہیں۔ لیکن خط لکھنے کے عادی نہیں۔ 'بادبان' کے مدیر کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ بھی خطوں کا جواب نہیں دیتے۔ آپ اجمل شاہین کے ذریعے 'بادبان' کا تازہ شمارہ حاصل کریں۔ آپ نے 'بادبان' کے تازہ شمارے پر جو تبصرہ بھیجا ہے اس کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ مرحوم ادیبوں کو صرف دعائے مغفرت پڑھ کے بخش دینا کافی نہیں۔ انہیں زندہ رکھنے کے لئے سال میں دو چار گالیاں دے دینا بھی مفید ہی ثابت ہوتا ہے۔ میں نے سلیم احمد کو گالیاں نہیں دی ہیں۔ صرف ان کی متضاد بیانیوں کی نشاندہی کر دی ہے۔

آپ نے میرا تبصرہ 'کتاب نما' کو بھیج دیا ہے تو اُمید ہے کہ کسی شمارے میں آ ہی جائے گا۔ بھائی مظہر امام کو میرا اسلام لکھ دیجئے گا۔ جواب میں عجلت سے کام نہ لیں لیکن تاخیر کو بھی راہ نہ دیں۔ میری کتاب کا جو اشتہار آیا ہے وہ میرے لاہوری ناشر نے بھجوایا ہوگا۔

آپ کا: نظیر صدیقی!

مظہر امام، دہلی

دلیپ کمار سے مکالمہ

ممتاز فلم اداکار دلیپ کمار ۱۹۸۴ء میں حکومت جموں وکشمیر کے مہمان کی حیثیت سے اپنے اہل خاندان کے ساتھ سری نگر تشریف لے گئے۔ ان کے ہمراہ ان کی ہمشیرہ اختر اور ان کی بیگم مشہور اداکارہ سائرہ بانو بھی تھیں۔ ان کا قیام کشمیر کے نہایت پُر فضا مقام ڈاچی گام کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ ان دنوں حکومت جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے داماد غلام محمد شاہ تھے۔ جناب مظہر امام ان دنوں سری نگر ٹیلی ویژن سنٹر کے سربراہ تھے۔ انہوں نے موقع غنیمت جان کر شہنشاہ جذبات دلیپ کمار سے ڈاچی گام میں سری نگر دور درشن کے لئے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ ہندوستانی ٹیلی ویژن پر دلیپ کمار کا پہلا انٹرویو تھا......مدیر!

پیش ہے اس انٹرویو کا متن:

ہندوستانی صنعت فلم سازی میں دلیپ کمار کی شخصیت ایک عہد ساز شخصیت ہے، ایک رجحان ساز شخصیت ہے۔ چالیس سالہ فلمی زندگی میں انہوں نے مختلف طرح کے رول ادا کیے ہیں اور ان میں سے بیشتر کے لئے انہیں انعام اور اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ دلیپ کمار کو جو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کی مثال ہندوستانی فلمی صنعت کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔ 'جوار بھاٹا' اور 'پرتیما' سے لے کر 'دنیا' اور 'آگ کا دریا' تک ایک لمبا سفر ہے اور اس لمبے سفر میں دلیپ کمار نے کبھی تھکنا نہیں سیکھا۔ انہوں نے مختلف طرح کے رول نبھائے رومانی بھی، غیر رومانی بھی، ہیرو کی حیثیت سے بھی، ہیرو کے والد کی حیثیت سے بھی، ہیرو کے دادا کی حیثیت سے بھی۔ ان سارے کرداروں میں انہوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ آج ہم آپ سے ان کی ملاقات کرانے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

مظہر امام: دلیپ صاحب، یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ ہماری درخواست پر یہاں تشریف لائے۔ اس سے پہلے بھی آپ اس ریاست جموں وکشمیر کے صدر مقام سری نگر میں آتے رہے ہیں۔ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ اب آپ اتنے دنوں کے بعد تشریف لائے ہیں تو آپ کے کیا تاثرات ہیں؟ آپ نے کچھ تبدیلیاں دیکھیں، ہماری اس وادی میں؟ ہمارے ماحول میں؟

دلیپ کمار: یہ وادی تو ایک سراپا حسن ہے، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ صدیوں سے لوگ اس کے گن گاتے رہے ہیں۔ اس کے حسن میں تو کوئی کمی نہیں۔ یہاں آنا ایک طرح سے جنت کو چھو کے لوٹ آنے کے برابر ہے۔ یہ وادی، یہاں کی فضا، کشمیری کلچر، یہاں کی تاریخ، یہاں کے لوگوں کی اخلاقی ساخت نہایت حسین اور خوبصورت ہے۔

مظہر امام: دلیپ صاحب، آپ نے ہندوستانی فلموں میں غالباً پہلی بار مکالموں کی ادائیگی کا ایک بالکل نیا طرز

اختیار کیا۔ یعنی لمبے لمبے مکالموں کی جگہ مختصر جملے، بجے سجائے جملوں کی جگہ عام بول چال کی زبان۔ کبھی آپ نے خاموشی کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا، کبھی چہرے کے حرکات وسکنات سے facial expression سے، آپ نے اس کیفیت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ یوں کہنا چاہیے کہ ڈرامائی انداز جو پہلے تھا، اس کے بدلے ایک cinematic میڈیم آپ نے پیش کیا اور جو غالباً ہمارے یہاں ایک نئی چیز تھی۔ اس سلسلے میں آپ کچھ ارشاد فرمانا چاہیں گے؟

دلیپ کمار: بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ باتیں کہہ دی جائیں تو اچھی لگتی ہیں۔ کچھ جو اَن کہی رہ جائیں زیادہ حسین ہوتی ہیں۔ میں چوں کہ بنگالی اسکول سے متعلق تھا اس لئے soft undertones میرے مزاج کا حصہ بن گئے۔ اس قسم کی کردار نگاری شاید ذاتی فطرت کے بھی قریب رہی ہو، جو بنتے بنتے میرا انداز بن گئی۔ لوگوں نے اسے کم گوئی کا نام دیا۔ یا یہ کہا گیا کہ اس میں جو اَن کہی بات ہے وہ زیادہ نمایاں ہے۔ میں نے ایسا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ یہ خود بہ خود بن گیا۔

مظہر امام: شاید آپ کی grooming ہوئی اسی انداز میں' بمبئی ٹاکیز کے فلم سازوں کے تحت۔ خاص طور پر آپ کی فلم 'ملن' مجھے اس وقت یاد آرہی ہے، جس میں آپ کی زندگی کا پہلا اہم رول تھا۔

دلیپ کمار: مختلف قسم کے کردار ہوتے ہیں۔ مختلف سبجیکٹ ہوتے ہیں۔ ہم اس کردار سے الگ رہ نہیں سکتے۔ لیکن کرادر میں رہ کر اس کے اندر کوئی نہ کوئی خصوصیت نمایاں کرنی ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ میں نے ہمیشہ 'ملن' یا 'دیوداس' کی طرح کے کردار ادا کئے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی کردار ادا کرنا پڑا جس میں extroversion زیادہ ہے۔ گاؤں کا کردار، دیہاتی کردار یا کوئی اور قسم کا کردار جیسے کہ 'مغل اعظم' میں ایک الگ قسم کا delineation، الگ قسم کی rendering۔ تو میں نے الگ الگ کردار نبھائے۔ دیکھنے والوں پر کوئی نہ کوئی چیز زیادہ اثر کرتی ہے۔ تعجب ہوگا آپ کو کہ کچھ لوگ میری کامیڈی کی بات کرتے ہیں، کہ آپ کامیڈی کردار کیوں نہیں کرتے، لیکن ایک ایکٹر اپنے کردار کے اندر ایک حد تک محدود ہو جاتا ہے اور اپنے کردار سے نہ اونچا جا سکتا ہے اور نہ اس سے زیادہ ہٹ سکتا ہے۔ مجھ سے جیسا بن سکا وہ کردار میں نے ادا کیا۔

مظہر امام: آپ کو المیہ نگاری کا بادشاہ یعنی tragedy king کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے المیہ جذبات کے اظہار میں آپ نے جو کمال دکھایا ہے، اس میں کوئی آپ کا حریف نہیں ہے۔ لیکن آپ نے جہاں ایک humorous کردار ادا کیا ہے، مزاحیہ کردار کی حیثیت سے جہاں آپ آئے ہیں، وہاں بھی آپ نے اپنے فن کا سکہ بٹھایا ہے۔ آپ یہ فرمائیے کہ آپ کو "Tragedy King" کی امیج زیادہ پسند ہے یا ایک مزاحیہ اداکار کی؟

دلیپ کمار: یہ چونکھا سوال ہے۔ مجھے کیا پسند ہے، لوگوں کو کیا پسند ہے اور حقیقت میں کیا ٹھیک ہے۔ (مظہر امام کی ہنسی) بہر کیف جیسا کہ میں نے کہا کہ heavy کام کرتے کرتے، بہت سنجیدہ کام کرتے کرتے، زیادہ ٹریجڈی کرتے کرتے انسان کے ایک اندر ایک بوجھل سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے لئے کامیڈی کرنا ایک طرح سے ٹریجڈی کے بوجھل پن سے فرار تھا۔ ایک pressure کے اندر، ایک گھٹن میں کام کرنا، انسان کی ذاتی

شخصیت پر حاوی ہو جاتا ہے۔ انگلینڈ میں dramatic coaches ہیں جو personality کے corrections (شخصیت کی اصلاح) سے متعلق ہیں۔ میں اکثر جاتا رہا ۵۵-۱۹۵۴ء میں اور اس کے بعد۔ ان سے مراسلہ قائم کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کامیڈی کیجئے۔ کیوں کہ زیادہ المیہ کردار کرنے سے pressure بڑھ جاتا ہے جو انسان کی ذاتی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

مظہر امام: 'دیوداس' میں آپ کی اداکاری کو بہت سراہا گیا ہے اور بعض ناقدین نے اسے آپ کی اداکاری کا نقطۂ عروج کہا ہے۔ 'دیوداس' کے رول میں اس سے پہلے سہگل بہت اچھا کام کر چکے تھے اور انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے اس رول کو امر بنا دیا تھا۔ اب آپ بتائیے کہ آپ نے اس رول کو کس طرح ادا کیا۔ میرا مطلب ہے ?How did you live the role۔

دلیپ کمار: سہگل صاحب نے جو کیا تھا وہ میں نے دیکھا نہیں تھا۔ اس کردار میں زیادہ تر introspection کی ضرورت تھی یعنی اندرونی کام کی۔ دیوداس بذاتِ خود باہر بہت کم ہے۔ اس کی اداکاری اندر زیادہ ہے، باہر بہت کم ہے۔ جو چیز اندر کی ہو وہ زیادہ وقت طلب ہوتی ہے۔ اس میں بات کہنے کی کچھ اور ہوتی ہے، اس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔ کچھ باتیں کہہ دیتا ہے کردار، کچھ باتیں ادا نہیں کرتا۔ تو یہ مشکل کام ہے۔ اس میں introspection کی وجہ سے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ اور اچھا ہوا میں نے سہگل صاحب کا یا بروا صاحب کا 'دیوداس' دیکھا نہیں تھا۔ ورنہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی نے بہت اچھا کام کیا تو آرٹسٹ کے لئے دقت ہو جاتی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے میں لارنس اولیویر نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ اس سے کسی دوسرے آرٹسٹ کا comparison کیا جائے تو بات نہیں بنتی۔ بہر حال میں تو کہوں گا کہ یہ ایک بہت اچھا experience تھا۔ یہ میرے کام کے تعمیری دور سے متعلق ہے۔ اس کا ایک اپنا significant اسکول ہے۔ 'مغلِ اعظم'، 'رام اور شیام'، 'آدمی' ان سے الگ ہے۔

مظہر امام: آپ نے اکثر نیا رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فلموں میں ایک ٹرینڈ سیٹ کرنے کی۔ آپ نے 'گنگا جمنا' میں پہلی بار بھوجپوری زبان (dialect) کا استعمال کیا۔ اسے اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بھوجپوری میں بہت سی فلمیں بنیں، بلکہ دوسری علاقائی زبانوں میں بھی، مثلاً کشمیری، ڈوگری وغیرہ میں بھی اس رجحان سے متاثر ہو کر فلمیں بنائی گئیں۔ آپ نے اس کا ایک اور تجربہ بعد کی فلم 'سگینہ مہاتو' میں کیا۔ اس کے بارے میں کچھ فرمائیں گے آپ؟

دلیپ کمار: بھوجپوری تھوڑی سی جسارت تھی اس زمانے کے لحاظ سے۔ تھوڑی سی کیا بلکہ کافی۔ مجھے تنبیہ بھی کی گئی۔ ایک ملازم تھا گھر کا، مالی بھی تھا، اس کا نام تھا بہاری۔ وہ تھا الہٰ آباد کا۔ ہم سے بھوجپوری میں بات کیا کرتا تھا۔ ڈانٹتا بھی تھا تو بھوجپوری میں۔ اپنی بیوی کی شکایتیں بہت کرتا تھا۔

مظہر امام: (قہقہہ)

دلیپ کمار: بھوجپوری زبان سے ایک دلچسپی تھی اور میرا خیال تھا کہ لوگ زبان سمجھ سکتے ہیں اگر تسلسل رہے کہانی کا۔ جیسے کہ لوگ انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں۔ زیادہ تر مکالمے نہیں سمجھتے، پھر بھی اس سے حظ اٹھاتے ہیں، لطف لیتے

ہیں، اور اس کا مقصد بھی ان کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ فلم بھوجپوری میں ہی بنایا جائے۔ میں نے پہلے experiment کیا بہت سے لوگوں کو بٹھا کے۔ مکالمے جیسے بولے جائیں گے۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ مدراس کے لوگ، کیرالا کے لوگ بھی اس کا مقصد سمجھ گئے۔ ڈسٹری بیوٹرز میں ہچکچاہٹ رہی۔ ہاں بہت دنوں تک اس کا بزنس نہیں ہو پایا تھا۔ جو لوگ خریدار تھے، وہ کہتے تھے کہ یہ چلے گا نہیں، بھوجپوری زبان میں کیوں فلم بنا رہے ہیں۔ جیسے ''مغل اعظم'' کے بارے میں بھی لوگوں کا خیال تھا کہ دقت طلب زبان ہے اور جاہ و جلال، شوکتِ الفاظ ہے۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی، لیکن دونوں فلمیں انفرادی حیثیت سے الگ الگ مقبول ہوئیں۔

مظہر امام: 'مغلِ اعظم' میں آپ کے مکالموں کی ادائیگی کو خاص طور سے نوجوان حلقوں میں بہت سراہا گیا ہے۔ اس میں جو آپ کی آواز کا اُتار چڑھاؤ ہے وہ ایک خاص حسن ہے جسے لوگوں نے پسند کیا ہے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں کہیں آپ کی آواز اتنی زیادہ ہو جاتی ہے، ڈوب جاتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

دلیپ کمار: نہیں، کچھ ریکارڈنگ defect رہا ہوگا، کیوں کہ ریکارڈنگ کا جو level ہوتا ہے اور جس کو ہم لوگ sound system کہتے ہیں، اگر اس پر کوئی چیز صحیح نہیں اترتی، تو یہ defect پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں جو projection theatres ہیں، وہ اے کلاس بھی ہیں، بی کلاس بھی ہیں، سی کلاس بھی ہیں۔ اس سے مراد یہ کہ کسی کی اچھی دیکھ بھال کی جاتی ہے، کسی کی نہیں۔ تو بعض دفعہ نہ صرف sound track بلکہ پکچرز بھی آپ دیکھیں گے کہ الگ الگ اسٹیشنوں پر یہ لگتا ہے کہ نظر آتی نہیں۔ ویسے آواز کا جہاں تک تعلق ہے جیسے سرگوشیاں، اگر equipment ٹھیک نہیں ہے، تو وہ ٹھیک سے سنائی نہیں دیں گی۔ دراصل یہ ڈیفکٹ projection system کا ہوتا ہے۔

مظہر امام: دلیپ صاحب! کہا جاتا ہے کہ آپ جس فلم میں کام کرتے ہیں، اس میں اپنے مکالمے بدلوا دیتے ہیں۔ ڈائریکٹر کو نظر انداز کر کے خود ڈائریکشن دینے لگتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں آپ سے اس کی تائید یا تردید کرنے کو نہیں کہوں گا، لیکن میں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ آخر اب تک آپ نے ڈائریکشن کے میدان میں کیوں قدم نہیں رکھا، جب کہ آپ کے بہت سے دوسرے ہم عصروں نے اس طرف توجہ دی ہے۔

دلیپ کمار: بات بات میں شرارتاً آپ مجھ پر ایک الزام لگا گئے ہیں۔ پھر اسی بات پر لوٹ کے آؤں گا۔ کوئی بھی ڈائریکٹر جیسا کہ محبوب صاحب ہیں، بمل رائے صاحب، داس صاحب ہیں، اگر اچھے ڈائریکٹر ہوں اور ان کے مکالمے آپ مسلسل تبدیل کرتے رہیں گے تو وہ ڈائریکٹر یا پروڈیوسر آپ سے بار بار کام نہیں لے گا۔ ہاں البتہ کسی مکالمے میں ایک جملہ ہے لفظوں سے بھرا ہوا، اور اگر اس میں کم گوئی زیادہ موثر ثابت ہو سکتی ہے، تو ہم اپنے ڈائریکٹر سے suggest کرتے ہیں۔ کوئی بھی اچھا ڈائریکٹر ہوگا، جیسے David Lean ہیں، ہمارے دوست بھی ہیں، وہ اس مشورے پر دھیان دے گا۔ مثلاً آپ نے مجھے ایک کیریکٹر دیا ہے۔ اس کیریکٹر کی عمر ۴۵ سال ہے اور ۴۵ سے ۴۷ کی عمر کے درمیان کہانی ختم ہو جاتی ہے، آپ کا لٹریچر مجھے اتنی ہی خبر دیتا ہے۔ اگر اداکار اس پر کوشش کرنا

چاہیے، اس کے third dimension میں جانا چاہے تو اسے سوچنا پڑے گا کہ کردار ۴۵ برس کا نہیں، ۵۰ برس کا تھا تو اس کی کیا کیفیت تھی۔ آپ کے لٹریچر میں اس سے بڑا data ملتا نہیں، تو اداکار خود ایک data بناتا ہے کہ اس کی پیدائش کس ماحول میں ہوئی تھی۔ کس طرح سے اس کی پرورش ہوئی۔ پینتالیس سال کا جب ہوا تو آپ کی کہانی آئی۔ تو ایک ایکٹر کی حیثیت سے میں اپنا ایک perspective بناتا ہوں اور اس پر محنت کر کے چند باتیں جو میری سمجھ میں آتی ہیں انہیں آپ کے سامنے لاتا ہوں۔ آپ کو ان میں سے پانچ باتیں پسند آتی ہیں، پانچ نہیں آتیں۔ ان میں سے پانچ نکال دی جاتی ہیں۔ اگر وہ پانچ بھی آ گئیں، پانچ کیا تین بھی آ گئیں تو وہ میرے لئے بہت بڑی آسانی کا باعث ہوتی ہیں۔ میرے لئے ہی آسانی کا باعث نہیں ہوتیں بلکہ وہ آپ کے سبجیکٹ اور آپ کی فلم کے لئے بھی ایک بہبودی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ کوئی اچھا ڈائریکٹر غلط suggestion کو نہیں قبول کرے گا۔ ہر اچھے ایکٹر کو چاہیے کہ وہ اپنے کردار پر پوری توجہ سے کام کرے۔ مگر dramaturgy کے دائرے کے اندر۔ کیوں کہ میں صرف اپنے ہی کیرکٹر کو سوچوں تو وہ مناسب نہیں ہوگا۔ یہ جو نقاد کچھ ہیں، جن سے متاثر ہو کر آپ نے یہ بات کہی ہے تو اس کا جواب ہے۔ (مظہر امام کا قہقہہ) رہا ڈائریکشن خود کرنا، تو یہ دو چار فلمیں ہیں جو میں نے خود ہینڈل کی ہیں۔ جس اسکول سے ہم آئے ہیں، جیسے بمبئی ٹاکیز جس میں سشادھر مکھرجی، امیا چکرورتی، واچا صاحب، سب مل کر کام کرتے تھے مگر ڈائریکٹر میں ایک آدمی کا نام ہوا کرتا تھا۔ This is the result of team work. کچھ لوگ اپنا independent نام بھی دیتے ہیں۔ میں نے اپنے نام سے کوئی فلم نہیں کی ہے اور کوئی ایسا ارادہ بھی نہیں ہے۔ in team work I believe فلم پروڈکشن میں سارے کام بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ ایکشن ہے، musical chapters ہیں، atmospheric shots ہیں۔ David lean بنگلور میں تھا تو اس کا ایک یونٹ یہاں سری نگر میں کام کر رہا تھا۔ یہ team work مجھے زیادہ سوٹ کرتا ہے۔ رہ گیا آپ کا یہ سوال کہ میں خود ڈائریکشن کا کام کرتا کیوں نہیں تو یہ attitutde کی بات ہے۔ ہم سشادھر مکھرجی سے کہتے تھے کہ آپ اپنا نام کیوں نہیں دیتے تو وہ ڈانٹ دیا کرتے تھے۔ اس کے پیچھے کوئی خاص پیچیدگی مضمر نہیں ہے۔

مظہر امام: دلیپ صاحب، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ بڑے مقبول اداکار ہیں۔ عوام آپ سے عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ ایک طرح کی پرستش کرتے ہیں، پوجا کرتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے آپ کے دل میں کس طرح کے تاثرات پیدا ہوتے ہیں؟

دلیپ کمار: پہلے تو انسان سچ پوچھیے خود ہی کچھ ڈر جاتا ہے۔ لوگوں کا خلوص دیکھ کر، شفقت دیکھ کر اتنا متاثر ہو جاتا ہے دل، اور تھوڑی guilt consciousness بھی اس میں آ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے دانستہ ہم نے ایک plan بنا کے دھوکا دیا۔ حالاں کہ نہ تو لیلیٰ تھی نہ مجنوں تھا، نہ کوئی جدائی کی بات تھی، نہ کوئی سلیم تھا، نہ انارکلی تھی، نہ کوئی شہنشاہ تھا جو ان کے بیچ حائل تھا۔ مگر لوگ جو تاثرات لے کر آتے ہیں تو میں نے اکثر دیکھا ہے وہ حقیقت بن کر ان کے دل میں برسوں رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نے شاید فریب دیا ہے کسی کو۔ کچھ اسٹوڈنٹ تھے، ان سے میں مخاطب تھا پچھلے سال، تو وہاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔ میں نے guilt complex کا اعتراف کیا

تھا۔ وائس چانسلر نے کہا کہ یہ فریب ہے تو اسے رہنے دیجئے۔ یہ فریب ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ زیادہ چھلکے مت اتاریے کہ اس کے پیچھے ایک کہانی تھی اور اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں تھی۔ جو تھا ویسے ہی ٹھیک ہے۔ اور ویسے یہ دنیا بھی، یہ کائنات بھی تو اوپر والے کا بنایا ہوا ایک کھیل ہے۔ یہ بھی ایک فریب ہے۔ یہ بھی ایک تماشا ہے۔ ہم بھی وہ بازی گر ہیں جو تماشا کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اتنا نوازا، لوگوں کے دلوں میں اتنی شفقت بھر دی، جس کے ساتھ ایک عجز اور انکساری بھی دی۔ شکر کرنا چاہئے مالک کا۔ اس کے ساتھ غرور یا گھمنڈ آجائے یا انسان اپنے ہی تماشے سے متاثر ہونے لگے تو اس کی ذہنی صحت کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔

مظہر امام: آج کل بہت سے اداکار عملی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں اور سیاسی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو معتبر بنا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اور ہندوستان سے باہر بھی۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ اسے مناسب سمجھتے ہیں؟

دلیپ کمار: میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ دور ہی عجیب بکٹ زمانہ ہے، تاریخ، ہمارا تمدن کسی اہم موڑ پر ہے۔ سیاسی لیڈر جو تھے، ان کے پیمانے گز ناپنے کے وہ بدل رہے ہیں۔ وہ خدمت کا جذبہ اور وہ وقار جو ان میں تھا تمام دنیا میں اسے بڑی ٹھیس پہنچی ہے پچھلے چند سالوں میں۔ اور کچھ لوگ قابل اعتراض سمجھتے ہیں کہ یہ فلمی لوگ کیوں سیاست میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ لیکن سیاست کسی خاص فرقے یا طبقے کی جاگیر تو ہے نہیں۔ یہ نجی معاملہ ہے، خانگی معاملہ ہے۔ اگر اس میں کوئی وکیل آسکتا ہے، اگر اس میں کوئی ڈاکٹر آسکتا ہے یا کوئی پروفیسر آسکتا ہے۔ عام شہری آتے ہیں تو میرے خیال سے اچھی بات ہے کہ اس میں اگر socially conscious اور conscientious فلم آرٹسٹ بھی دلچسپی لیں۔ مجھے سیاست میں آنے کا کوئی ambition نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ ایک الگ شعبہ ہے۔ یہ آئینہ دکھا سکتا ہے سیاست داں کو بھی سماج کو بھی، مگر ذاتی طور سے مجھے سیاست سے دلچسپی ہے، اور یہ دلچسپی یوں ہے کہ یہ ہماری زندگی کا نہ صرف ایک اہم جز ہے بلکہ آنے والے مستقبل اور ہمارے بچوں کے مستقبل سے متعلق ہے۔ اس لئے اس میں دلچسپی لینا ضروری بھی ہے۔ عقل پروری اور دانشوری کے جتنے بھی منصوبے ہیں، میں نے دیکھا ہے، اکثر لوگ شرارت کرتے ہیں اور ان کو بگاڑ دیتے ہیں۔ جو wisdom کی بات ہے، عقل اور دانشوری کی بات ہے، اس کو مسخ کر کے بہت سے لوگ منظم ہو کر اپنی غلط بات منوانے پر تلے رہتے ہیں۔ اس سے معاشرہ خراب ہوگا، ہمارا ملک خراب ہوگا، ہماری تہذیب خراب ہوگی۔ انسانی ذہن بڑی تخلیقی اونچائیوں پر پہنچ چکا ہے۔ اسے بدصورتی اور برائی سے محفوظ رکھنا ہر عقلمند ذی ہوش انسان کا فرض ہے۔ اور خاص طور سے جن کی نیت اچھی ہے، جن کے ایما اچھے ہیں ان لوگوں کا اکٹھا ہونا، ایک دوسرے کی مدد کرنا، آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے میں سمجھتا ہوں کہ ضروری ہے۔ سیاست بری چیز نہیں ہے۔ سیاست ہماری زندگی کا، سماجی اور معاشی زندگی کا ایک بڑا ضروری پہلو بن گیا ہے۔ اس میں دلچسپی لینی چاہئے۔

مظہر امام: اور اداکاروں کو تو خصوصاً، کیوں کہ ان کی عوامی مقبولیت ہوتی ہے اور وہ عام لوگوں کی خدمت زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

دلیپ کمار: یہ ضروری نہیں ہے۔ اداکار ایک اچھا اداکار بن سکتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر اداکار اچھا

سیاست داں بھی ثابت ہو، لیکن یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایک اداکار سیاست داں نہیں ہو سکتا۔

مظہر امام: آپ کشمیر تو اکثر آتے رہے ہیں اور اس علاقے سے آپ کی دلچسپی رہی ہے۔ ایک زمانے میں آپ سے کشمیر کی مشہور شاعرہ حبہ خاتون پر ایک فلم بنانے کی بات چیت چل رہی تھی۔ اس سے بھی آپ کے تعلق کی خبر ملی تھی۔ معلوم نہیں پھر اس سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی؟

دلیپ کمار: اس وادی میں کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے، کیا کچھ نہیں سوچا جا سکتا ہے۔ حبہ خاتون پر تو بہت کام کیا گیا ہے۔ محبوب صاحب نے کیا تھا، وہی بنانا چاہتے تھے۔ یہ جگہ ideal ہے۔ یہ وادی بہت خوبصورت ہے۔ ہماری دنیا کے خوبصورت ترین مقامات میں وادی کشمیر کا ایک بہت اونچا مقام ہے۔ اس میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ایک شہری کی حیثیت سے میں سوچتا ہوں کہ اتنا کچھ ہو نہیں رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، یہ میں کہہ نہیں سکتا۔ ایک آرٹسٹ، ایک شہری ہونے کے ناطے میرا یہ تبصرہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ تخریبی نہیں بلکہ تعمیری نقطۂ نگاہ سے بات کر رہا ہوں۔

مظہر امام: آج کل کمرشیل فلموں اور آرٹ فلموں کا بڑا چرچا ہے اور اس پر اکثر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد ہیں۔ یا پھر یہ کہ آرٹ فلموں کے لئے بھی تجارتی لحاظ سے کامیاب ہونا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ پھر آرٹ فلمیں بنانے کی ہمت کون کرے گا۔

دلیپ کمار: "Academic Cinema" میں اسے کہوں گا۔ جب آپ فلم بنا رہے ہیں کسی کسان پر اور آپ کا urban view ہے۔ کیمرہ کا لینس بڑا sophisticated بڑا شہری ہے تو ہل چلانے والا اسے دیکھے گا اور اپنے آپ کو نہیں پائے گا۔ آپ کی نظر بڑی sophisticated ہے، اس پکچر کو لوگ جاتے ہیں سنیما ہال میں دیکھنے کے لئے۔ film critics بڑا اچھا reviews دیتے ہیں۔ وہ فلم ریلیز ہوتی ہے تو کسان نہیں ہوتا۔ یہ طبقہ اپنے کو آپ کو پہچان نہیں پاتا۔ یہ کہنا کہ "academic cinema" کا کوئی مقام نہیں، غلط ہے۔ بڑا اونچا مقام ہے اس کا۔ جہاں تک عام فلم ہے 'مدر انڈیا' فلم بنی تھی یا 'مغل اعظم' بنی تھی۔ یہ عام شہری کو دیکھ کر، اس کی co-efficient aesthetic کو دیکھ کر بنی تھی کہ وہ کہاں تک اسے سمجھ سکتا ہے اور کہاں تک اسے پسند کر سکتا ہے۔ اور میرے خیال میں وہ فلم بہتر ہے۔ بازاری فلم اُسے کہیں گے، جو فلم بیچنے کے لئے بنایا جاتا ہے، اس سے اتفاق نہیں کرتا میں، لیکن اچھا فلم بن سکتا ہے جو کامیاب بھی ہو۔ 'اکیڈمک سنیما' میں اگر کوئی خامی ہے یا وہ ناکام ہوتا ہے تو اس لئے کہ ایک بڑا اکیڈمک آدمی گاؤں پر ایک فلم بناتا ہے اور وہ جانتا ہی نہیں کہ گاؤں میں خوشی کے موقع پر کیا کیفیت ہوتی ہے، غم کے موقع پر کیا۔ یہ فلم ساز اس سے بھی واقف نہیں ہیں اور اس کے idiom سے واقف نہیں ہیں۔ اُن کی سوچ ایک شہری کی سوچ ہے۔ وہ فلم کامیاب نہیں ہوگا۔ اگر بچہ ہے تو بچے کی کہانی بنایئے۔ اسے آئنسٹائن کی تھیوری آف relativity ہم نہیں دیں گے۔ بچوں سے کچھ کہنا ہے یا اپنے عوام سے جو اتنی developed نہیں ہے، aesthetic sense کے لحاظ سے، تو اس سے ویسی ہی بات کرنی چاہئے۔ ہم بذات خود یہ "آرٹ فلم" ہے، اور یہ "کمرشیل فلم" ہے، اس طرح کی قید میں الجھتے نہیں۔

مظہر امام: دراصل آج کل صرف تجارت کے لئے صرف پیسہ حاصل کرنے کے لئے فارمولا فلمیں بنائی جاتی

ہیں جن میں crime اور violence پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

دلیپ کمار: کہاں کچھ یہ نہیں ہو رہا۔ اپنے آپ کو بیچنے کے لئے لوگ غلط جگہ مکان بنا لیتے ہیں، سڑک غلط بنا لیتے ہیں۔ سیاسی لیڈر اپنے آپ کو بیچنے کے لئے جھوٹی باتیں کرتا ہے۔ جھوٹے وعدے کرتا ہے۔ کیا کچھ نہیں کرتا وہ۔ دوسروں کی برائی کرتا ہے۔ دوسروں کو دشنام کرتا ہے۔ تو وہ بھی اتنا ہی مجرم ہے، اتنا ہی گنہگار ہے جتنا کہ اس طرح کی فلم بنانے والا ہے۔ میں fence کے، یعنی جو حد بندی ہے، اس کے باہر بیٹھا ہوا ہوں تو میرا یہ interpretion ہے کہ کسی شہر میں گندی سڑک ہو اور مکان بہت اچھا بن جائے، یہ ناممکن ہے۔ مکان بڑا گندا اور سڑکیں اچھی ہوں، یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ مکان بھی اچھا ہوگا، سڑک بھی عمدہ ہوگی اور اس کے اندر رہنے والے بھی اچھے ہوں گے تو ملک اچھا ہوگا۔ ملک کا معاشرہ اچھا ہوگا education اچھا ہوگا۔ فلم بھی آہستہ آہستہ اسے reflect کرتا چلا جائے گا۔

مظہر امام: اب ایک آخری سوال۔ آگے آپ کے ارادے کیا ہیں؟

دلیپ کمار: جو اُس کو منظور ہو۔

مظہر امام: فلموں کے سلسلے میں؟

دلیپ کمار: فلمیں بنتی ہیں، بنتی ہی رہیں گی، اور کوشش یہی ہوگی کہ اگر اچھی فلمیں نہ بنا سکیں تو کم از کم بُری نہ ہوں۔ اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور آپ سے اور آپ کے تمام ناظرین سے درخواست ہے کہ اس معاملے میں دعا گو رہیں۔ ان کی دعائیں شامل حال رہیں اس لئے یہ کشتی یہاں تک پہنچی ہے۔

مظہر امام: بڑی کامیابی کے ساتھ پہنچی ہے اور ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کی نوازش کہ آپ نے ہمارے لئے اتنا وقت دیا۔ آپ نے جو باتیں کیں وہ بڑی خیال انگیز ہیں اور ان پر غور کرنے کا اور سوچنے کا ہم سب کو یقیناً موقع ملے گا۔ شکریہ، بہت بہت شکریہ۔ ❀❀❀

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ (بہار)

خطبۂ استقبالیہ

(بموقعہ افتتاح کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، آئی ٹی آئی اور کامران ماڈل اسکول، الیاس اشرف نگر، چندن پٹی، لہیریا سرائے، دربھنگہ۔ بتاریخ یکم جون ۲۰۰۸ء)

ہمارے لئے خوشی کا مقام ہے کہ آج یہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے تحت قائم تین اداروں کالج آف ٹیچر ایجوکیشن (بی ایڈ)، انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (آئی ٹی آئی) اور کامران ماڈل اسکول کا افتتاح معزز وزیر ریل جناب لالو پرساد کے دست مبارک سے ہوا۔

جناب لالو پرساد ایک شخص نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت شخصیت اور تحریک کا نام ہے اور مظلوموں کی بیداری کی علامت بن کر ہم سب کے سامنے آئے ہیں۔ دانشور اسے کہتے ہیں جو علم کا جانکار ہوتا ہے لیکن Genius یا نابغہ اسے کہا جاتا ہے جس کے اندر پورے حالات کو بدلنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جناب لالو پرساد ایک جینیس ہیں اور انہوں نے جس شعبہ میں اور جن سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا وہاں کی کایا پلٹ کردی۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ ایک شخص جو ہندوستان کے گاؤں کے ماحول سے نکلتا ہے اور زمین سے جڑے رہنے کے باوجود اس کی اڑان ایسی ہوتی ہے جہاں بڑے بڑے دانشور حیران ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان کی سیاست میں بڑی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ انقلابات آئے۔ حکومتیں بدلیں۔ بہت سے لوگ آئے اور گئے لیکن اس پورے منظرنامہ پر جس طرح لالو پرساد چھائے رہے اور ہیں اس کی مثال ماضی قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ہندوستان میں جو سیاسی صورت حال ہے اور جو سماجی پس منظر ہزارہا سال سے دیکھنے کو مل رہا ہے اس کو ہر کوئی جانتا ہے۔ یہاں بسنے والے لوگوں کا سماج نام نہاد اونچی ذاتوں کو چھوڑ کر ۶ ہزار ذاتوں میں منقسم ہے۔ اس لئے لالو پرساد نے اس بنیادی مسئلہ پر دھیان دیا اور ذات پات کے نظام کے درمیان ایک نئی روشنی دکھائی۔ اس سے پہلے اس بہار کی سرزمین پر مہاتما بدھ نے یہ نعرہ دیا تھا کہ ''آدمی جنم سے نہیں کردار سے بڑا ہوتا ہے'' لالو پرساد نے بھی ان دبے کچلے لوگوں کیلئے یہ کوشش کی کہ ان کے اندر عزت نفس کا احساس پیدا کیا جائے۔ کمتری کے احساس کو ختم کیا جائے اور بابا بھیم راؤ امبیڈکر نے جس آئین کی تشکیل کی اس کے تحت دبے، کچلے، پسماندہ طبقات تک آزادی کی صحیح روشنی پہنچانے کی سعی کی۔ لالو پرساد اقلیتوں کے دکھ درد کو جانتے تھے اور وہ جانتے ہیں کہ ان کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی حالت دلتوں سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ زمین سے جڑے رہنے کی وجہ سے ان کو سچائیاں معلوم ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اقلیتیں مظلوم ہیں۔ اس لئے ان کے مسیحا بن کر لالو پرساد نے تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کئے۔ جناب لالو پرساد نے جذباتی نعرہ بازی سے الگ ہو کر اقلیتوں کی ہمہ جہت ترقی کیلئے محض کسی اقلیتی رہنما پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ کمان خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور سماج کے دونوں طبقات جو نظرانداز کئے جاتے تھے جو محروم تھے، دبے کچلے تھے ان کو حوصلہ دیا۔ بہار میں اپنے دور اقتدار میں اردو اساتذہ کی بحالی کے ساتھ مدارس کے فارغین کو بھی روزگار کا موقعہ دیا جب کہ دیگر پسماندہ طبقات کے فروغ اور تعلیمی ترقی کیلئے

پہلوان اسکول اور چرواہا ودیالیہ کا بالکل اچھوتا تصور پیش کیا۔ بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن جیسے اعلیٰ تعلیمی ادارہ کا ذمہ دار اقلیت کے ایک دانشور کو بنایا اور تمام بورڈوں اور اداروں میں اقلیتوں کی شراکت کو یقینی بنایا۔ جناب لالو پرساد محض ایک سیاسی رہنما ہی نہیں ہیں بلکہ ہوا کا رُخ بدلنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں لالو جی اسی لئے جینئس کی صف میں آتے ہیں۔ آپ ایک مدبر اور ایک ایسے اسٹیٹس مین ہیں جن کا ہندوستان میں کوئی ثانی نہیں۔ دنیا کے سارے مینجمنٹ کے بڑے ادارے ان کی رائے کے متمنی ہیں۔ ان کو ہارڈ وارڈ، شکاگو اور کیلی فورنیا سے لکچر دینے کیلئے بلایا گیا تھا نیز وہ سنگاپور میں مینجمنٹ کے طلباء اور ملیشیائی ریلوے کے نمائندوں کو بھی مینجمنٹ کے گُر سکھانے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں اور موصوف ریل مینجمنٹ کے بعد واٹر مینجمنٹ کو بہتر بنانے کی جانب توجہ دے رہے ہیں۔ ندیوں کے اضافی پانی کے صحیح استعمال کیلئے نئے منصوبہ پر غور کر رہے ہیں۔

لالو پرساد کی حصولیابیوں کی طویل فہرست ہے جس کے احاطہ کیلئے کئی کتابوں کی ضرورت ہے۔ وزیر ریل کی حیثیت سے لالو جی نے جس طرح ریلوے کی کایا پلٹ دی وہ بے مثال ہے۔ گھاٹے میں چلنے والی یہ ریلوے دودھ دینے والی گائے بن گئی۔ اس کرشمہ کو جاننے کیلئے دنیا بھر کے دانشور اُن سے رابطہ قائم کرنے لگے۔ آئی آئی ایم میں غیر ملکی طلباء و طالبات ان سے مینجمنٹ کا گرو منتر سیکھنے آئے اور آج بھی یہ گرو منتر مینجمنٹ کی کسی کتاب میں نہیں ملے گا۔ یہ ان کی ہی ایجاد ہے۔ ریلوے کو جو فائدہ ہوا ہے وہ تاریخی ہے اور ملک کیلئے فخر کی بات ہے۔ ان کی حصولیابیاں جنتا کے دربار میں بھی مقبول ہیں۔ لالو پرساد نے یو پی اے حکومت میں آر جے ڈی کے جتنے بھی وزراء شامل کئے وہ سب بڑے ہی پختہ کار اور بیدار مغز ہیں۔ ان ہی وزراء میں ایک اہم نام جناب محمد علی اشرف فاطمی کا ہے جنہیں فروغ انسانی وسائل کا وزیر مملکت بنا کر اس خطہ کی تعلیمی ترقی کے لئے راہ ہموار کی۔ جناب ایم اے اے فاطمی جیسی شخصیت کو وزیر بنا کر اردو آبادی اور اقلیت کو تعلیم سے جوڑے رکھنے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے ہیں اور امید ہے کہ جس علم کے چراغ کو جناب لالو پرساد نے ان دبے کچلے اور اقلیتوں کے لئے جلایا ہے وہ کل مشعل بن کر ملک میں ایک مینارہ کی صورت دکھائی دے گا۔ آج کے اس موقع پر ہم مانو کی جانب سے اور متھلا کی اردو آبادی اور اقلیتوں کی طرف سے الیاس اشرف نگر میں ان کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں کہ ہم ان کے سواگت میں بہت کچھ نہیں کر سکتے لیکن ہم اپنا دل لے کے آئے ہیں، نظریں بچھائے ہیں اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ آپ کا یہ مبارک قدم ہمارے لئے بہت ساری خوشیوں اور خوابوں کو سچی تعبیر فراہم کرے گا:

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
ایک ہی صورت درپن درپن
شبھ بہت ہے ان کا درشن

آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

کیسی یہ ہریالی ہے
جھوم رہی ہر ڈالی ہے

چہرے پر خوشحالی ہے
آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

آپ بڑے ہیں دانشور
آپ کا چرچہ ہر گھر گھر
آپ گرو ہیں علم و ہنر
آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

چہرے پہ مسکان لئے
اپنی اک پہچان لئے
راحت کا سامان لئے
آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

آپ پہ دنیا شیدائی
بگڑی بات بھی بن آئی
بج اٹھی ہے شہنائی
آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

آپ غریبوں کے نیتا
آپ نے سب کا دل جیتا
سیوا میں جیون بیتا
آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

دبے ہوئے اور کچلے لوگ
کو سکھلایا جیون یوگ
دور کیا نفرت کا روگ
آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد
متھلا کی دھرتی کا بھاگ

اب بھی سونے والے جاگ
موسم کے سرگم کا راگ

آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

شکچھا ایک عبادت ہے
شکچھا میں ہی طاقت ہے
ان قدموں کی برکت ہے

آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

چندن پٹی کی دھرتی
علم و ہنر کی ہے بستی
کم بھی نہیں ان کی ہستی

آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

شکچھا کا یہ آنگن ہے
علم و ہنر کا مسکن ہے
خوشیوں کا بھی کارن ہے

آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

خوشیوں کی یہ ساعت ہے
لالو کی کیا عظمت ہے
استقبال سواگت ہے

آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

اعظم یہ الیاس نگر
ہے یہ دیارِ علم و ہنر
روشن ہے ہر راہ گزر

آئے ہیں لالو پرساد
زندہ باد زندہ باد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۹۸ء میں پارلیامنٹ ایکٹ کے تحت قائم ہوئی۔ اس یونیورسٹی کو روایتی انداز تعلیم کے ساتھ ساتھ فاصلاتی نظام تعلیم اختیار کرنے کی بھی اجازت ملی۔ اس طرح یہ یونیورسٹی اگنو کے بعد ملک کی دوسری فاصلاتی و روایتی انداز تعلیم کو ایک ساتھ اپنانے والی پہلی اور منفرد یونیورسٹی بن گئی۔ دو سوا ایکڑ اراضی پر محیط یونیورسٹی کی اپنی شاندار عمارت ہے اور روز بروز ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے۔ ملک بھر میں اس کے ۹ ریجنل سنٹر (دربھنگہ، پٹنہ، دہلی، بنگلور، ممبئی، کولکاتہ، بھوپال، سرینگر، رانچی)، ۶ سب ریجنل سنٹر (لکھنؤ، سنبھل، جموں، میوات، امراوتی، حیدرآباد) اور ۱۴۰ اسٹڈی سنٹرس قائم ہیں۔ ایک اکزام سنٹر جدہ (کے ایس اے) میں قائم ہے۔ ملک اور بیرون ملک کے تمام اسٹڈی سنٹرس میں تقریباً 1.34 لاکھ طلباء و طالبات داخلہ لے کر اپنا کیریئر سنوارنے میں مصروف ہیں نیز جنوری ۰۸ء سے دوردرشن اُردو چینل پر مانو کے پروگرام ''مانو ورشن'' نشر کئے جا رہے ہیں۔ مسرت کا مقام ہے کہ یونیورسٹی کو وائس چانسلر کی شکل میں عزت مآب پروفیسر اے ایم پٹھان جیسی عظیم دانشور شخصیت کی خدمات حاصل ہیں جنہوں نے اپنے پیش رو پروفیسر شمیم جے راج پوری کے کاموں کو اپنی فہم وفراست، دوراندیشی اور دانشوری سے آگے بڑھاتے ہوئے ملک کی ایک ممتاز دانش گاہ کی صورت میں جلوہ گر کیا ہے اور ان کی لائق و فائق قیادت میں یونیورسٹی روز بروز ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔ جس یونیورسٹی کو پروفیسر اے ایم پٹھان جیسی عظیم المرتبت شخصیت کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل ہو اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مستقبل بے حد تابناک اور روشن ہوگا۔

دربھنگہ ریجنل سنٹر ۱۴ رفروری ۰۵ء میں وزیر مملکت جناب ایم اے فاطمی کی کاوشوں اور خصوصی دلچسپی سے قائم ہوا۔ اس مختصر مدت میں تشنگان علوم جوق در جوق اپنی پیاس بجھانے آرہے ہیں اور سیراب ہو رہے ہیں۔

اس مختصر عرصہ میں اس ریجنل سنٹر نے گیارہ اسٹڈی سنٹرس (دربھنگہ، مدھوبنی، مظفرپور، سمستی پور، مشرقی چمپارن، کشن گنج، سیتامڑھی، ارریہ، پورنیہ اور سیوان) قائم کئے۔ نیز اگنو کے اشتراک سے چلنے والے ڈی پی ای (ڈپلومہ ان پرائمری ایجوکیشن) کا اسٹڈی سنٹر ڈاکٹر ذاکر حسین ٹیچرس ٹریننگ کالج میں اور بی ایڈ (فاصلاتی) کا کالج آف ٹیچر ایجوکیشن چندن پٹی میں ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں وزیر مملکت جناب ایم اے اے فاطمی، وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان، پرو وائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد اور رجسٹرار ڈاکٹر پی پرکاش کی عنایتیں حاصل ہیں۔ ہم اپنے ان تمام محسنین کے شکر گذار ہیں جن کی بدولت الیاس اشرف نگر چندن پٹی لہیریا سرائے نے ایک تعلیمی بستی کی شکل اختیار کرلی۔ چندن پٹی ایک قدیم تاریخی بستی ہے جہاں بڑے بڑے علماء وصوفیا اور دانشوران پیدا ہوئے، علم وفضل کی روشنی بکھیری اور یہیں کی سرزمین میں آسودۂ خاک ہوئے۔ اس سرزمین سے ممتاز شاعرہ پروین شاکر، سید محمد ابوالقاسم صاحب مرحوم (سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ)، مولانا محمد ایوب صاحبؒ، مولانا غلام یحیٰ صاحبؒ، ممتاز فلسفی شاعر پروفیسر اجتبیٰ رضوی، معروف شاعر ایس ایم رضا کریم مرحوم (سابق ڈی ایس پی)، سید فرمان علی مرحوم اور ایشیا کے معروف سرجن ڈاکٹر ایس ایم نواب جیسی عظیم شخصیتوں کا تعلق رہا ہے۔ پروین شاکر کو چھوڑ کر باقی سبھی ہستیاں یہیں مدفون ہیں۔ یہ بستی بجا طور پر یہ حق رکھتی ہے کہ علم وفن کے اس قدیم گہوارہ کو تعلیمی بستی میں تبدیل کیا جائے اور جناب ایم اے اے فاطمی نے اپنی کاوشوں سے اسے یہ

مقام دلانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی نواحی بستیوں میں باقی پور، پرکھوپٹی، جیورو غیرہ بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ مانو کے تعلیمی اداروں کو ان بستیوں کے باشندگان کا تعاون حاصل ہے۔ آج یہاں مانو کے تحت کالج آف ٹیچر ایجوکیشن (بی ایڈ، روایتی و فاصلاتی) کامران ماڈل اسکول اور انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ وزیر موصوف کی رہنمائی میں ہم ترقی کی راہ پر گامزن رہیں گے۔ جناب فاطمی صاحب کی سعی بلیغ سے مانو کو تقریباً سات ایکڑ اراضی عطیہ کے طور پر ملی ہے۔ انہوں نے دربھنگہ کو ملک کے تعلیمی نقشہ میں نمایاں مقام دلانے کا جو خواب بنا ہے اس کی تعبیر اب نظر آنے لگی ہے جو اس خطہ کے لئے ایک فال نیک ہے۔

خود محوِ انتظار ہے متھلا کی سرزمین
کس درجہ بیقرار ہے متھلا کی سرزمین
''مانو'' کے وائس چانسلر تشریف لائے ہیں
اُن پہ بہت نثار ہے متھلا کی سرزمین
اے ایم پٹھان کی بھی نوازش یہ کم نہیں
گلرنگ، پربہار ہے متھلا کی سرزمین
ہر سمت جل اُٹھے ہیں یہاں علم کے چراغ
ساعت یہ سازگار ہے متھلا کی سرزمین
جھرمٹ یہاں ستاروں کا جیسے اُتر گیا
کچھ اور پروقار ہے متھلا کی سرزمین
اک انبساط کی ہے فضا آج چارسو
گو پیکر خمار ہے متھلا کی سرزمین
اردو زبان اس کی رگ و پے میں دوڑتی
اُردو کا اک دیار ہے متھلا کی سرزمین
ثابت اسی کو فاطمی نے آج کردیا
کیوں اتنی بے قرار ہے متھلا کی سرزمین
اردو کے گیت آج بھی سب گنگنا رہے
اب بھی یہ نغمہ بار ہے متھلا کی سرزمین
''مانو'' کا جب سے ''ریجنل سنٹر'' یہ کھل گیا
کچھ اور مشک بار ہے متھلا کی سرزمین
کیونکر فروغ پائے نہ اُردو زباں یہاں
اُردو کی پاسدار ہے متھلا کی سرزمین
''مانو'' کے وائس چانسلر ہیں پیکر علوم

ان کی شکر گذار ہے متھلا کی سرزمین
اقبال لے کے آئے بلندی نصیب کی
پھر اوج صد بہار ہے متھلا کی سرزمین
پرکاش آگئے تو اندھیرے بکھر گئے
ہر سمت لالہ زار ہے متھلا کی سرزمین
الیاس بھی کا نگر بھی مقام علوم ہے
وڈیا کا اک دیار ہے متھلا کی سرزمین
ہیں تکنیکی علوم کے خواہاں یہاں بہت
زرخیز، زرنگار ہے متھلا کی سرزمین
اعظم مراد پوری ہوئی آپ آگئے
مشکور بار بار ہے متھلا کی سرزمین

میں اور اردو زبان

❁ سیکولرزم کے بغیر ہندوستان ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اردو زبان نے سیکولرزم کو فروغ دینے اور اسے زندہ رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج جس طرح ہم تاج محل پر فخر کرتے ہیں اسی طرح اردو زبان بھی ہماری تہذیبی وراثت کا ایک اہم حصہ ہے اور اس زبان پر ہم تمام ہندوستانیوں کو فخر ہونا چاہئے۔ یہ وہ واحد زبان ہے جو بغیر کسی ترجمان کی مدد کے دلوں میں سیدھے اتر جاتی ہے۔ درحقیقت یہ ہندوستانی زبانوں کا زندہ تاج محل ہے۔

❁ تمام دنیا میں میری پہچان اردو کے حوالے سے ہے، میں نے ادب کی جو بھی خدمت کی ہے وہ اردو کے ذریعہ ہی کی ہے۔ اردو اگرچہ میری مادری زبان نہیں لیکن یہی زبان میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ اردو صرف ہندوستان کی ہی زبان ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ اردو پاکستان کی زبان ہرگز نہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد اگر اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنایا گیا تو وہ ایک سیاسی مجبوری تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہاں کے عوام سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو اور سرائیکی وغیرہ بولتے ہیں۔ یہ زبانیں ہی پاکستانی زبانیں ہیں۔ پاکستان میں لکھنے پڑھنے کا کام ہی اردو میں ہوتا ہے جب کہ ہم ہندوستانی لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اردو میں ہی سوچتے اور بولتے ہیں۔

——— پروفیسر گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر امام اعظم ، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴ (بہار)

جدّہ کا سفر

کہتے ہیں کہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ انسان سفر سے بہت کچھ سیکھتا اور حاصل کرتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں۔ سفر کرنا بعض لوگوں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے اور وہ سفر کی پریشانیوں کو آسانیوں میں تبدیل کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ یہ میرے لئے پسندیدہ چیز ہو یا نہ ہو لیکن نئی چیز نہیں ہے اور اندرون ملک میرا سفر ہوتا رہتا ہے۔ میرا پہلا غیر ملکی سفر ۱۹۹۱ء میں پاکستان کا ہوا تھا اور اب یہ دوسرا سفر جدہ کا درپیش تھا جہاں مجھے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام اور انڈین قونصلیٹ جدہ کی زیر نگرانی ہونے والے عالمی اردو کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ یہ سفر میرے لئے علمی بھی تھا اور روحانی بھی۔

سفر کے لئے اور بالخصوص غیر ملکی سفر کے لئے جن تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سفر پر روانہ ہونے سے محض ایک دن قبل (یکم جون ۰۸ء) مانو کے تین اداروں کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، آئی ٹی آئی اور کامران مانو ماڈل اسکول کا افتتاح تھا اور جس کی تیاریاں دس روز قبل سے جاری تھیں، پھر اس کے بعد رات میں اونسی بھنگواں میں کل ہند مشاعرہ میں بھی شرکت کرنی تھی۔ مجھے ۲رجون ۰۸ء کو سوتنتر تا سینانی ٹرین سے نئی دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ دربھنگہ سے ٹرین ۳ بج کر ۳۰ منٹ پر تھی۔ میں دفتر سے ۲ بجے گھر، پھر وہاں سے جیسے تیسے اسٹیشن پہنچا۔ میرا چھوٹا بھائی سید ظفر اسلام ہاشمی اور انظار کریم شوکت، شکیب عالم، نشاط کریم شوکت موجود تھے، انہیں جمشید پور جانا تھا۔ نظر عالم بھی موجود تھے، ٹرین بروقت کھلی میری ٹکٹ اے سی سکینڈ سے اپ گریڈ ہو کر اے سی فرسٹ کی ہو گئی تھی۔ اس میں ٹی ٹی رحمان صاحب تھے جو میرے قرابت دار ہیں۔ سمستی پور اسٹیشن پر حاجی مسعود حسن شبو، اعجاز حسین آزاد وغیرہ مجھ سے ملنے آئے۔ ڈاکٹر یاسر حبیب ڈینٹل سرجن (سمستی پور) نے بذریعہ فون مبارکباد دی۔ مظفر پور اسٹیشن پر شکیل چشتی بھی پہنچے۔ وزیر مملکت جناب ایم اے اے فاطمی، جناب حسن امام درد، جناب منظر شہاب، جناب سید احمد شمیم، پروفیسر محفوظ الحسن، سابق اے ڈی ایم نیاز احمد، ڈاکٹر ضیاء الحق نظر، جناب سید منظر امام، جناب محمد سالم، پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، نسیم محمد جان، پروفیسر رئیس انور، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر ایم اے ضیاء، ڈاکٹر ایم نہال، ڈاکٹر منصور عمر، پروفیسر قاسم فریدی، انجینئر محمد صالح، ڈاکٹر منظر مہدی، ڈاکٹر رضوان احمد جناب تشنہ اعجاز، فرحت حسین خوشدل، شکیل احمد سلفی، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ابوذر ہاشمی، حیدر وارثی، بدر عالم سلفی، ڈاکٹر حسن الدین حیدر (ریجنل ڈائرکٹر مانو، پٹنہ)، ڈاکٹر عمر فاروق (اے آر ڈی مانو، لکھنؤ)، ڈاکٹر رحیل صدیقی (اے آر ڈی مانو، کولکاتا)، مجیر احمد آزاد محمد طلحہ، راشد احمد، معراج العابدین اور فیاض احمد وجیہہ وغیرہ نے مبارکباد پیش کی۔ عالمی کانفرنس میں شرکت کی اطلاع روزنامہ ''قومی تنظیم''، ''راشٹریہ سہارا'' اور ''ہمارا سماج'' میں شائع ہوئی۔ ٹرین تاخیر سے دہلی پہنچی۔ نئی دہلی ریجنل سنٹر کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر شاہد پرویز کا برابر کال آتا رہا کہ وہ دفتر میں انتظار کر رہے ہیں جہاں ڈاکٹر محمد

احسن ریجنل ڈائرکٹر بھوپال جنہیں میرا رفیق سفر ہونا تھا میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ لے کر انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شاہد پرویز نے بتایا کہ وہ ۶ بجے شام تک دفتر میں میرا انتظار کریں گے۔ میں اسٹیشن سے سیدھا ریجنل سنٹر پہنچا۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی سید خرم شہاب الدین کو یہاں بلا لیا تھا جو آٹو لے کر اپنی رہائش گاہ چلے گئے۔ ریجنل سنٹر پر چائے وغیرہ پینے کے بعد میں اور ڈاکٹر محمد احسن ابوالفضل آ گئے۔ یہاں چائے پینے کے بعد ڈاکٹر محمد احسن رخصت ہو گئے۔ میں اپنے بھائی کے ساتھ نظام الدین چلا آیا جہاں کرنسی تبدیل کرائی اور حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ ڈاکٹر نگار عظیم اور ڈاکٹر حنیف ترین کو 'تمثیل نو' دیا۔ ۴ رجون کو صبح ۷ بجے ڈاکٹر محمد احسن ٹیکسی لے کر آئے اور پھر ہم لوگ انٹرنیشنل ایرپورٹ پہنچ گئے۔ ساڑھے دس بجے فلائٹ تھی۔ ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد ہم فلائٹ میں بیٹھ گئے۔ یہاں یہ بھی بتادوں کہ اگر ڈاکٹر محمد احسن نہ ہوتے تو میرا یہ سفر نہ ہو پاتا، ٹکٹ وغیرہ کا انتظام انہوں نے ہی کیا تھا۔ سعودی ایر کرافٹ نے ۱۱ ربجے دن میں اڑان بھری۔ تقریباً ۳ گھنٹہ میں ہم لوگ ریاض ایرپورٹ پہنچے۔ یہاں جن پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا وہ ناقابل بیان ہے۔ یہاں عربی کے علاوہ دوسری زبان جاننے والا کوئی نہ تھا۔ ہمیں فارم بھرنے پڑے انگلیوں کے نشانات لئے گئے، پاسپورٹ میں انٹری لگی۔ تمام جانچ سے گذرنے کے بعد ہم لوگ سامان سمیت ایرپورٹ پر رہے۔ ہمارے موبائل نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ریاض سے جدہ کے لئے فلائٹ تھی۔ ایرپورٹ پر مسافروں کی کافی بھیڑ تھی۔ کاؤنٹر پر لمبی لمبی قطاریں تھیں۔ عملے کے اندر ذرہ برابر مروت نہیں تھی۔ جمعرات کا دن ہونے کی وجہ سے بھیڑ زیادہ تھی۔ ویکینڈ میں لوگ عمرہ کے لئے بھی جاتے ہیں۔ کاؤنٹر پر ہمیں ڈھائی بجے آنے کے لئے کہا گیا۔ ہم مطمئن تھے کہ ٹکٹ کنفرم ہو جائے گا۔ ہم نے احرام باندھ لیا۔ احرام دربھنگہ سے ہی لے کر آیا تھا جو میرے بھائی سید حلیم آل احمد اعظم نے دیا تھا۔ وہ الجبیل (سعودی عربیہ) میں ملازمت کرتے ہیں، لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ ان کا کوئی نمبر ہمارے پاس نہیں تھا۔ نہ ان لوگوں سے رابطے کا کوئی وسیلہ جو 'تمثیل نو' کے حوالے سے میرے آشنا تھے۔ میرا سامان سفر میری مشغولیتوں کی وجہ سے میری اہلیہ ڈاکٹر زہرہ شمائل، میرے بچے نوا، فضا، حیا اور میرے بھائی سید ظفر اسلام ہاشمی نے تیار کیا تھا۔ اس لئے رابطے کے یہ وسیلے خود سمیٹ نہیں سکا اس کا نتیجہ وہاں بھگتنا پڑا تھا کہ احرام کی حالت میں ہم لوگ قطار میں بے یار و مددگار کھڑے رہے۔ پھر کسی نے بتایا کہ ایئرپورٹ پر بنگلہ دیشی کلینر سے رابطہ کرنے پر وہ چپ چاپ پیسہ لے کر بات کرا دیں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ اس نے ۱۰ ریال لے کر ڈاکٹر محمد احسن کے دوست سے جو ریاض میں ملازمت کرتے ہیں بات کرائی۔ ایک دوسرے کلینر سے ۳۰ ریال میں ایک SIM لے لیا جس کی وجہ سے ہم مزید پریشانیوں سے بچ گئے۔ آفتاب صاحب ایرپورٹ آ گئے جس سے ہمیں راحت ملی۔ وہ ۸ بجے شب تک ہمارے ساتھ رہے۔ اس وقت تک ہمارا ٹکٹ کنفرم نہیں ہوا تھا۔ ہم نے سوچا کہ باہر نکل کر بس یا ٹیکسی سے جدہ کا سفر کیا جائے۔ آفتاب صاحب کے موبائل سے مکہ میں ملازم اپنے خالہ زاد بھائی شکیل اعظم سے بات کی۔ اس کو احسن صاحب کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد متین کا نمبر دیا کہ وہ ہم سے بات کریں۔ آفتاب صاحب نے تسلی دی کہ جدہ کی فلائٹ کی فری کوینسی کافی ہے اس لئے ٹکٹ کنفرم ہو جائے گا۔ تقریباً ساڑھے نو بجے شب میں ٹکٹ کنفرم ہوا۔ سعودی ایرلائنس کی سروس اچھی نہیں ہے۔ میں نے اندرون ملک پرائیویٹ ایرلائنس سے کافی سفر کئے ہیں۔ اتنی خراب

فلائٹ سے سفر کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ۱۱ ربجے جدہ ایئرپورٹ پہنچے۔ ایرپورٹ کے باہر سواریاں مکہ کے لئے مل رہی تھیں۔ چوں کہ ہم احرام میں تھے اس لئے سارے ٹیکسی والے ہمیں سیدھے مکہ معظمہ لے جانا چاہتے تھے۔ ایرپورٹ پر ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ ٹھہرانے کا انتظام کہاں کیا گیا ہے۔ احسن صاحب نے اردو اکیڈمی جدہ کے صدر جناب سید جمال اللہ قادری سے بات کی انہوں نے بتایا کہ ہمارے ٹھہرنے کا انتظام فندق الامین میں ہے۔ یہ بغداد یہ میں فارحی جویلرس کے پاس ہے۔ ایئرپورٹ پر اللہ کا ایک بندہ ملا جس کا تعلق بہار کے چھپرہ سے تھا۔ اس نے ہمیں ایک ٹیکسی پر بٹھا دیا جس نے ہوٹل پہنچایا۔ وہاں ایک بنگالی تھا جس نے بتایا کہ ہمارے دیگر احباب اور شعرا حضرات بھی یہیں قیام پذیر ہیں۔ اب ہمارے دل میں یہ تڑپ تھی کہ کس طرح جلد از جلد مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ کی سعادت حاصل کی جائے۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ہوٹل سے ۳ بجے شب میں نکلے اور تقریباً ایک گھنٹہ میں مکہ پہنچ گئے۔ جدہ سے مکہ کی دوری ۱۰۰ کیلومیٹر اور مدینہ کی دوری ۵۰۰ کیلومیٹر ہے۔ احسن صاحب نے اپنے ماموں زاد بھائی کو حرم شریف پہنچنے کی اطلاع دی۔ اس دوران ہم نے نماز فجر ادا کی۔ پھر متین آگئے انہوں نے ہمارا سامان اپنے یہاں رکھا۔ ہم لوگوں نے وضو کیا اور آب زمزم پیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس وقت وہاں بھیڑ نہیں ہوگی لیکن ہزاروں افراد طواف کرتے نظر آئے۔ کعبہ شریف پر نگاہ پڑی تو دل کی دنیا بدل گئی۔ ہر مسلمان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے زیارت کعبہ کا شرف حاصل ہو۔ آج اس گناہگار کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی تو سجدۂ شکر بجالایا، دعا پڑھی، طواف کیا، بڑی مشکلوں سے سنگ اسود کو بوسہ دے سکا۔ مقام ابراہیم پر نماز پڑھی، صفا مروہ کی سعی کی۔ حضورؐ کی رہائش گاہ دیکھی جہاں لائبریری ہے۔ ابوجہل کا گھر دیکھا جہاں حمام ہے۔ پھر ہم متین کی رہائش گاہ پہنچے۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ بھوک کافی لگی تھی، انہوں نے ہمیں ناشتہ کرایا، وہاں تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر ہم لوگ ٹیکسی سے جدہ کیلئے روانہ ہوئے۔ بار بار اللہ کا شکر ادا کرتے رہے کہ اس نے زیارت کعبہ کی سعادت بخشی۔

حسرت وارمان انسان کے دلوں میں گھر بناتے رہتے ہیں۔ ہم بھی حسرت وارمان کی ایک دنیا دلوں میں بسائے ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے، خواب دیکھنا انسان کا جبلی حق ہے لیکن اس کی تعبیر مرضی الٰہی پر موقوف ہے۔ اقبال کا ایک شعر ہے:

لگی نہ میری طبیعت ریاض جنت میں پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے

اور اس کے نتیجہ میں دادی حوا، جدہ آگئیں اور آدمؑ مکہ ومنیٰ تشریف لے گئے اور وہ ایسا مقدس مقام بن گیا جہاں سے مکہ مکرمہ کا باب کھلتا اور مدینہ کے در وا ہوتے ہیں۔ جدہ کے لئے ہم لوگ جس ٹیکسی سے روانہ ہوئے اس کا ڈرائیور کچھ باؤلا سا تھا۔ اس کی نظریں سامنے نہیں تھیں۔ سگریٹ کے کش لیتا رہا اور نہ جانے عربی میں کیا کیا بولتا رہا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ سامنے دیکھے۔ ہمارے ساتھ ایک پاکستانی بھی تھے جو عمرہ کرکے واپس آرہے تھے۔ وہاں ٹیکسی کی رفتار ۱۸۰ سے ۲۰۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے اگر حادثہ ہو جائے تو شاید جسم کے پرخچے اڑ جائیں۔ لیکن ہمارا ڈرائیور شاید ان باتوں سے بے نیاز تھا۔ اچانک اس نے مخالف سمت سے آنے والی کار کو ڈیش کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں خراش بھی نہیں آئی جب کہ دوسری کار کو کافی نقصان پہنچا۔ پھر ہم لوگوں نے دوسری ٹیکسی لی۔ ہمارے جدامجد نے جنت کے بعد اگر کسی مقام کو پسند اور جس میں رضائے الٰہی بھی شامل تھی، تو وہ جدہ،

مکہ اور منیٰ تھا۔ اس لئے جدہ پہنچنے پر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

جدہ، بحر احمر کے کنارے بسا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں لوگ مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ بن عفان کے زمانہ میں اسے بندرگاہ کی حیثیت ملی جس سے تاجروں کا قافلہ دور دراز سے آنے لگا۔ اس پر غیر ملکیوں کی نظر بد لگی رہی اس لئے اسے فصیل بند کر دیا گیا کہ دشمنوں کو اس کے حصار سے باہر رکھنے کا یہی طریقہ تھا۔ لیکن جب پرتگالیوں اور دیگر حملہ آوروں کی کوششیں محض خواب بن کر رہ گئیں تو اس شہر کو دوسرے ممالک کے سفیروں کے لئے کھول دیا گیا اور پھر یورپ اور دیگر ممالک نے عرب سے Diplomatic Relation قائم کرنے کے لئے اپنے اپنے سفارت خانے آباد کئے۔ آج جدہ کی آبادی تیس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہ سعودی عرب کا تجارتی دارالسلطنت اور مشرق وسطیٰ اور مغربی ایشیا کا سب سے دولت مند شہر ہے۔

جدہ کی مقبولیت اس کی مذہبی حیثیت، پھیلی ہوئی شہریت اور حجاج کرام کی بڑھتی ہوئی اجتماعیت نے اس شہر کو مزید کشادہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب یہ شہر بڑی بڑی عمارتوں، خوبصورت اور وسیع شاہراہوں، جدید ساز و سامان سے مزین صفائی اور پاکیزگی کی بے مثال سند بن چکا ہے۔ حالاں کہ ابھی بھی چھوٹی چھوٹی گلیاں موجود ہیں جو نگاہوں کے سامنے ماضی کا عکس پیش کرتی ہیں لیکن اس کا بھی انداز دیگر ہے۔ جسے قدیم عربی روایات اور دیہی زندگی کے تاریخی پس منظر کی واقفیت نہ ہوگی وہ ان گلیوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھے گا۔

جدہ پہنچ کر ہوٹل میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جب کمرہ سے باہر آئے تو ڈاکٹر محسن جلگانوی، عالم خورشید، اقبال اشہر اور رحمٰن جامی وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ محسن جلگانوی ان دنوں حیدرآباد سے شائع ہونے والے روزنامہ اعتماد کے سب ایڈیٹر ہیں۔ حیدرآباد میں ان سے پہلے بھی ملاقات ہوتی رہی ہے۔ بیشتر شعرا کا قیام اسی ہوٹل میں تھا۔ چندر بھان خیال اور معصوم مرادآبادی دوسرے ہوٹل میں تھے۔ اسی ہوٹل میں ہمارے کئی احباب پروفیسر محمد ظفرالدین، ڈاکٹر شجاعت علی راشد، ڈاکٹر نجم السحر، ڈاکٹر مسرت آرا، ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ بھی قیام پذیر تھے۔ ۵ رجون کی شام میں انٹرنیشنل انڈین اسکول (بوائز سیکشن) میں مشاعرہ کا اہتمام تھا۔ یہ مشاعرہ سفارت خانہ کا تھا۔ اسکول کی بس آئی جس سے ہم لوگ وہاں پہنچے۔ کرسیوں پر ہم لوگوں کے نام آویزاں تھے۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہمارے معزز وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان، پرووائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد، پروفیسر وہاب قیصر (کورڈینیٹر) موجود تھے۔ وہاب قیصر صاحب مجھے بھی مشاعرہ پڑھوانا چاہتے تھے لیکن تاخیر کے سبب موقع جاتا رہا۔ ڈنر کا وقت ہوگیا۔ ڈنر لیا اور رات کے تقریباً ا ربجے ہوٹل واپس آیا۔ جدہ سے نکلنے والے اردو روزنامہ اردو نیوز اور سعودی گزٹ کے ہفت روزہ ضمیمہ ''آواز'' میں پروگرام کی خبریں بھی آئی تھیں۔ ۶ جون کو عالمی اردو کانفرنس کا افتتاح ۴ بجے شام میں تھا۔ ہم لوگ جمعہ پڑھنے مسجد عائشہ (مکہ مکرمہ) گئے۔ اسکول کی بس سے ہم لوگ گئے تھے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر محمد ظفرالدین، ڈاکٹر شجاعت علی راشد، ڈاکٹر مسرت جہاں، ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ، بیورو چیف ''سیاست'' حیدرآباد ایم ایس ایچ ہاشمی اور ڈاکٹر محمد احسن بھی تھے۔ جمعہ کی نماز پڑھی۔ بڑا سکون ملا۔ اس مسجد کی بڑی اہمیت ہے اس علاقہ کے لوگوں کی میقات بھی یہی مسجد ہے۔ اس بس کے ڈرائیور محمد بشیر ہم لوگوں کو لے کر ایک ہوٹل میں رُکے جہاں دن کا کھانا کھایا۔ پانچ آدمی کا کھانا ہم لوگوں نے لیا جو کافی

تھا۔ یہاں پانی مہنگا ہے اور پٹرول سستا ہے۔ ایک ریال (۱۱ روپے) میں دو لیٹر پٹرول، ایک کپ چائے اور آدھا لیٹر پانی ملتا ہے۔ طرح طرح کے کھانے کھائے جن کے نام یاد نہیں۔ تقریباً ۳ بجے ہم لوگ اپنے مستقر پر پہنچے۔ اور یہیں سے جلسہ گاہ گئے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (لندن)، حسن عبدالکریم چوگلے (قطر)، محترمہ عذرا نقوی (ریاض) قونصل جنرل ہند، ہندوستانی قونصلیٹ جدہ ڈاکٹر اوصاف سعید موجود تھے۔ اوصاف سعید سے غائبانہ تعارف پہلے سے تھا۔ موصوف اردو سے بیحد محبت رکھتے ہیں۔ مشہور ادیب مرحوم عوض سعید کے بیٹے اور معروف نقاد پروفیسر مغنی تبسم کے بھانجہ ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کی کتاب ''خاکے'' جو جدہ اردو اکیڈمی سے طبع ہوئی ہے ہمیں عنایت کی بڑے ہی مخلص انسان ہیں۔ بہت لپک کر ملے میں نے ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ اور مضامین کا مجموعہ ''گیسوئے تنقید'' ان کی خدمت میں پیش کیا جسے انہوں نے قبول کیا۔ ان کا تبادلہ حال ہی میں دہلی ہوگیا ہے۔ نعیم بازید پوری جو اردو نیوز میں ہیں اور اچھے شاعر ہیں سے غائبانہ تعارف تھا ان سے مل کر اچھا لگا۔ شاہین نظر سینئر ایڈیٹر ''عرب نیوز'' جدہ کو ''تمثیل نو'' بھجوا تا رہا ہوں لپک کر ملے۔ سرور ندوی، سلطان مظہر الدین، بدرالدین ایم انصاری، شریف اسلم (صحافی)، طیب نگرانوی، سرل مٹّا (قونصل)، سید محمد قادری سلیم وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ عمر سالم العدروس نہایت مخلص انسان ہیں اور اردو سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اپنے اشعار سے سامعین کا دل جیت لیتے ہیں، بہت محبت سے ملے۔ کانفرنس ہال کے اندر لگے اسٹالوں میں سے ایک اسٹال پر لوگوں کے جمگھٹے نے میری توجہ کھینچ لی، قریب گیا تو دیکھا کہ لوگ منور رانا کے شعری مجموعہ ''ماں'' کو ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی۔ پروگرام کی افتتاحیہ تقریب بڑی شاندار ہوئی۔ یہ عالمی اردو کانفرنس مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے زیر اہتمام اور زیر نگرانی انڈین قونصلیٹ جدہ اور بحسن تعاون: انڈیا فورم جدہ اردو اکیڈمی انڈین ایجوکیشنل کونسل اور دیگر تنظیموں کے تعاون سے منعقد ہوئی جس کا افتتاح عزت مآب ڈاکٹر اوصاف سعید نے کیا اور کہا کہ یہاں سے اردو کے دو اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اردو کا ایک اہم مرکز جدہ ہے۔ تقریباً ۱۲ برسوں سے یہاں مشاعرے ہورہے ہیں۔ صدارتی خطبہ میں عزت مآب پروفیسر اے ایم پٹھان نے یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد بتائے اور کہا کہ اس کے لئے مسلسل کوشش ہورہی ہے۔ عزت مآب اوصاف سعید کی تجویز پر یہاں ۲ سال قبل مانو کا اکزام سنٹر قائم ہوا ہے اور انہی کی تجویز پر یہ عالمی کانفرنس ہورہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اردو کے توسط سے تعلیم حاصل کر کے روزگار کیسے فراہم ہوں گے۔ ہمارے یہاں سے ایم بی اے کر کے کئی امیدوار بڑی بڑی کمپنیوں میں روزگار سے جڑ گئے ہیں۔ یہ یونیورسٹی ۱۹۹۸ء میں پارلیامنٹ ایکٹ کے تحت قائم ہوئی۔ روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے تحت یہ یونیورسٹی چلتی ہے۔ حکومت ہند کی مدد سے بہت جلد پالی ٹیکنک کا قیام عمل میں آئے گا۔ انہوں نے بطور خاص پروفیسر گوپی چند نارنگ، سید تقی عابدی وغیرہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یونیورسٹی کی روز افزوں ترقی کا سہرا میں اپنے ساتھیوں کو دینا چاہتا ہوں۔ پرو وائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ انہوں نے بڑی سلیس اردو میں خطاب کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال نے اپنے اظہار خیال میں کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ اردو ساری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اردو اسکرپٹ کے تحفظ پر پوری

توجہ دی جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بنیادی سطح پر اردو کی تعلیم کے بغیر اردو کا تحفظ ممکن نہیں۔ اردو کے ممتاز نقاد پدم شری پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ مشرق وسطی میں بھی اردو کا چلن روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اردو کی شیرینی، لطافت دلکشی سے کون واقف نہیں اس کا جادو سب کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں پٹھان صاحب اور اوصاف سعید صاحب کا شکر گذار ہوں میں تو کبھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ اردو کا دامن پکڑ کر اس مقدس سرزمین پر آؤں گا۔ میں تو اپنی خوش بختی پر جتنا بھی ناز کروں وہ کم ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کام کرنے والے کس طرح کرتے ہیں۔ پٹھان صاحب ایک سائنٹسٹ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں سائنس بھول گیا ہوں سوائے اردو کے مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں ساری زبانوں کا احترام کرتا ہوں لیکن اردو ایک ایسی زبان ہے جو سب کے مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔ امیر خسرو ہندی اردو کے پہلے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں اردو رائج نہیں تھی۔ ہندی فارسی کا لفظ ہے۔ شاجہاں کے زمانہ میں یہ اردو کہلائی۔ پروفیسر نارنگ نے یہ بھی کہا کہ اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کے لئے NGOS کو آگے آنا ہوگا۔ اس ارض مقدس کے رشتہ سے اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے چاہے آپ اسے جس طرح پکاریں۔ اردو، ہندی، ہندوستانی۔ زبانیں انسانیت کو Sustain کرتی ہیں۔ اپنے خطاب میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ عرب ممالک میں مشاعروں کا چلن تو برسوں سے ہے لیکن تعلیمی مسائل اور زبان کے مسائل پر پہلی بار کسی عرب ملک میں کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ اردو آنند نرائن ملا، چکبست، فراق کی زبان ہے اردو کی پھلواری یہاں بیٹھی ہوئی ہے جس کے باغباں بھی یہاں ہیں۔ جناب ظفر علی نقوی چیئرمین مائنورٹیز ایجوکیشنل کمیٹی، دہلی، حسام الاسلام صدیقی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر ضیاء الدین شکیب، جناب حسن عبدالکریم چوگلے، ڈاکٹر بصیر احمد خاں (پرووائس چانسلر اگنو)، جناب زاہد علی خاں (مدیر سیاست حیدر آباد)، جناب نعیم جاوید (دمام)، محترمہ عذرا نقوی، ڈاکٹر عابد معز، ڈاکٹر پرویز احمد (ریاض) سمیت اردو کے ممتاز اسکالرس نے شرکت کی۔ اردو اکیڈمی جدہ کے زیر اہتمام شائع آزاد سووینیر ۲۰۰۸ء (عالمی اردو کانفرنس نمبر) کا اجرا بھی ہوا۔ پروفیسر ایس اے وہاب قیصر نے کانفرنس کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ نظامت پروفیسر ظفر الدین نے کی اور اظہار تشکر ڈاکٹر سہیل اعجاز خاں نے کہا۔ پروگرام کی شروعات اسکول کی بچیوں کے ترانہ سے ہوا:

علم و ادب کے گوہر ذہنوں میں سج رہے ہیں — یہ ساز زندگی کے رستوں میں کٹ رہے ہیں
آداب زندگی کے اور آپ کے اشارے — ہم کو اصول یہ سب جی جان سے ہیں پیارے
علم و ادب کا معدن یہ مدرسہ ہمارا — مہکا ہوا یہ گلشن یہ مدرسہ ہمارا

بعد نماز مغرب کانفرنس کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ اس کے موضوعات میں ☆ اردو طریقہ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لئے تجاویز ☆ اردو رسم الخط اور جدید انفارمیشن ٹکنالوجی، اردو ڈاٹا باکس کی تشکیل اور اردو پروگراموں کو بہتر بنانے کے مسئلہ پر غور شامل تھے۔ صدارت ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور ڈاکٹر تقی علی عابدی نے کی اور نظامت ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے۔ ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی، محترمہ سمیرہ عزیز، نعیم جاوید اور ڈاکٹر محمد ظفر الدین نے مقالے پیش کئے۔ ڈاکٹر شکیب (لندن) نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اردو کی تشہیر اور تبلیغ میں مقامی رسم الخط ابتدائی مرحلے میں کارآمد ہو سکتے ہیں جس سے ترقی کی منزل تک پہنچنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ دوسرے اجلاس

کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ اور چندر بھان خیال نے کی اور کلیدی خطبہ جناب ظفر علی نقوی اور جناب زاہد علی خاں نے پیش کیا۔ سراج وہاب، معصوم مراد آبادی، ڈاکٹر محمد احسن، مہتاب قدر، ڈاکٹر امام اعظم اور ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے مقالے پیش کئے۔ اس سیشن کے عنوانات اس طرح تھے: ☆ ہندوستان اور اس سے باہر اردو زبان کی ترقی اور تعلیم کا جائزہ، ☆ ہندوستان اور اس سے باہر اردو کے فروغ اور اشاعت میں میڈیا کا رول۔ نظامت پروفیسر محمد ظفر الدین نے کی۔ میں نے اپنا رسالہ "تمثیل نو" اور مضامین کا مجموعہ "گیسوئے تنقید" کئی حضرات کو پیش کیا۔ جدہ اردو اکیڈمی کے صدر سید جمال قادری کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ جدہ اردو اکیڈمی بہت ہی فعال ہے اور پورے ہندوستان کی اردو اکیڈمیوں کو جدہ اردو اکیڈمی کی طرح سرگرم ہونا چاہئے۔ یہاں کام سلیقہ اور منصوبہ بندی سے انجام دیئے جاتے ہیں۔ دیارِ غیر میں یہ پہلی اردو کانفرنس تھی جس کا سہرا مانو کے معزز وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان اور قونصل جنرل ڈاکٹر اوصاف سعید کے سر جاتا ہے۔ دونوں سیشن کے اختتام پر پرتکلف عشائیہ کے بعد ہم لوگ اپنے ہوٹل چلے آئے۔ ۷ جون کو اسکول کے بچوں کے ساتھ Interaction تھا جس میں ہماری شرکت نہیں ہو سکی۔ ہم لوگ ۴ بجے اسکول پہنچے۔ جہاں تیسرے اجلاس کی تیاری شروع ہوئی۔ عنوانات اس طرح تھے: ☆ کیا اردو ایک موثر ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے؟ ☆ مڈل ایسٹ کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم۔ مجلس صدارت پروفیسر کے آر اقبال احمد اور جناب حسام الاسلام صدیقی پر مشتمل تھی۔ کلیدی خطبہ حسن عبدالکریم چوگلے نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم و زبان کا رشتہ جسم و جان کا ہوتا ہے اس لئے شاید ماں کی گود کو پہلا مدرسہ کہا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں متفقہ طور پر ہر انسان اپنی مادری زبان سے پہچانا جاتا ہے...... اردو ایک میٹھی زبان ہے جو برصغیر کی سب سے پسندیدہ اور مقبول زبان ہے۔ اب مشرق وسطی میں بھی وہی درجہ اور وہی مقام حاصل کر چکی ہے جس کی وہ حقدار ہے۔ چند جملے کہ "اردو کیا ہے" اردو کی زبانی ملاحظہ کیجئے:

"میں اردو ہوں میری داستان حیات اتنی طویل نہیں کہ اس کو پڑھنے اور سمجھنے میں کسی کو دیر لگے کیوں کہ میں بڑی آزاد مزاج اور ملنسار واقع ہوئی ہوں۔ اس لئے جو مجھے اپنانا چاہتا ہے میں اسی کی ہو کر رہ جاتی ہوں جو مجھے پناہ دیتا ہے اس سے محبت کرنے لگتی ہوں، جو مجھے پڑھتا ہے میں اس کو آگاہی بخشتی ہوں جو مجھے سمجھتا ہے میں اسے رازِ حیات بتاتی ہوں، میرا کہیں قیام نہیں میری کوئی حد نہیں ہر قوم و ملت سے میری دوستی ہے، ہر زبان سے میرا رشتہ ہے انسانیت میرا مذہب ہے مٹھاس میری سرشت ہے، اتحاد میرا نعرہ ہے، یگانگت میری کوشش ہے۔" مزید کہا کہ اردو کی بدقسمتی یہ بھی رہی کہ اسے ہر زمانہ میں دبانے کی کوشش کی گئی مگر اس میں اتنی لچک ہے کہ ابھرتی ہی رہی اور انشاءاللہ رہتی دنیا تک برقرار رہے گی۔ انہوں نے پٹھان صاحب کے اس قابل قدر اقدام کی ستائش کی کہ جنہوں نے مشرق وسطی کے ایک اہم ملک سعودی عرب میں ایک عالمی کانفرنس کرا کر مثبت اور مستحکم قدم اٹھایا ہے۔ اللہ تبارک و تعالی ان کی کوشش کو کامیابی عطا کرے۔ آمین۔ انہوں نے وائس چانسلر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں یقین دلاتا ہوں کہ دوحہ، قطر کے محبانِ اردو آپ کے ساتھ ہیں اور ہر طرح کے تعاون کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے مانو کا اسٹڈی سنٹر قطر میں کھولنے کی گذارش کی اور اس طرح کی کانفرنس کے انعقاد کی دعوت بھی دی۔ اس سیشن میں علی مصری، ڈاکٹر نکہت جہاں کا مقالہ ڈاکٹر مسرت جہاں نے پیش کیا۔ محترمہ عذرا نقوی، ڈاکٹر

نجم السحر اور پروفیسر سید عبدالوہاب قیصر نے اپنے اپنے مقالے پیش کئے۔ اس کی نظامت ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے کی۔ اس کے بعد چوتھے اجلاس کی تیاری شروع ہوئی جس کے عنوانات: جدید اردو ادب کے اُبھرتے ہوئے رجحانات اور کسی بھی معاشرے میں اردو زبان کے رول کا جائزہ اور تجاویز تھے۔ مسند صدارت پر پروفیسر بصیر احمد خاں (پرووائس چانسلر اگنو) اور پروفیسر شمیم حنفی متمکن تھے۔ مقالہ نگار ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ، سید جمال اللہ قادری تھے۔ تمام لوگوں کے پر مغز مقالے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی شائع کرے گی۔ اس کے کنوینر پروفیسر محمد ظفر الدین تھے۔ چوتھے سیشن کے اختتام کے بعد اختتامی اجلاس کا اہتمام ہوا جس کی صدارت پروفیسر کے آر اقبال احمد (پرووائس چانسلر مانو) نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر بصیر احمد خاں (پرووائس چانسلر اگنو) اور مہمان اعزازی جناب زاہد علی خاں (ایڈیٹر روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد) تھے۔ اختتامی اجلاس کے خطاب میں ڈاکٹر سید تقی عابدی (معروف ادیب اور ماہر امراض قلب) نے اردو کے حوالے سے بڑی اہم اور موثر باتیں پیش کیں۔ انہوں نے کہا کہ ''کانفرنس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں 'صحت کا طبیب اور ادب کا مریض ہوں' سچائی یہ ہے کہ اردو اس وقت ترقی کی منزل پر نہیں بلکہ تشہیر کے مرحلے میں ہے۔ اس لئے ہمیں ابھی سوچنا پڑے گا کہ ہماری زبان کو ترقی کی منزل پر پہنچنے میں کیا کیا مسائل درپیش ہیں، ہو سکتے ہیں یا ہونے والے ہیں اور ان کا حل تلاش کرنا چاہئے۔ یہ کانفرنس اسی کی ایک کڑی ہے۔'' ان کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے محترم چندر بھان خیال نے اپنے الوداعیہ خطاب میں کہا کہ ان دو دنوں کی کانفرنس میں اردو کے جو مسائل ہمارے سامنے آئے ہیں انہیں ہمیں سنجیدگی سے لینا پڑے گا۔ کلمات تشکر پروفیسر وہاب قیصر نے پیش کئے۔ اس کے بعد تقسیم ایوارڈس کا سلسلہ شروع ہوا۔ پروفیسر اے ایم پٹھان اور ڈاکٹر اوصاف سعید نے مشترکہ طور سے ایوارڈس تقسیم کئے۔ اردو میں انڈین اسکول کے ٹاپر طلبا اور ان کے اساتذہ (اردو اکیڈمی جدہ)، بیت بازی میں فائز انڈین اسکول کے طلبا (خاک طیبہ ٹرسٹ جدہ) اور اردو کوئز میں فائز انڈیا اسکول کے طلبا (اردو گلبن جدہ) نے حاصل کئے۔ اس کانفرنس میں کئی معزز ہستیوں سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ تمام لوگوں کے خیالات اردو کے سلسلہ میں سامنے آئے بڑی اہم کانفرنس ہوئی۔ جدہ میں مقیم ہمارے دوست شاہد نعیم ہیں جن کو ''تمثیل نو'' پابندی سے بھجواتا ہوں ان سے فون پر بات ہوئی۔ ۱۰ رجون کو ہماری روانگی تھی اس روز ہوٹل آئے اور کچھ دیر ہم لوگوں نے باتیں کیں اچھا لگا۔ ''تمثیل نو'' بھی ان کے حوالے کیا۔ ہم لوگوں نے روزانہ کی طرح ۷ جون کو اختتامیہ پروگرام کے بعد عشائیہ میں شرکت کی اور ہوٹل آ گئے۔ ۸ جون کو انڈین اسکول کی بس آئی اور ہم لوگ دوسرے عمرہ کے لئے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ احرام فندق الامین میں جہاں ہمارا قیام تھا باندھ لیا تھا۔ ہم لوگ فجر سے پہلے پہنچے۔ ڈاکٹر ظفر الدین، ڈاکٹر مسرت جہاں، ڈاکٹر شجاعت علی راشد، ڈاکٹر محمد احسن اور خاکسار نے اپنے اپنے سامان لوکر میں بند کرائے پھر وضو کیا اور طواف کے لئے کعبہ شریف پہنچے۔ عمرہ کرنے والوں کا ہجوم سالوں بھر رہتا ہے۔ اس بار بھی سنگ اسود کو بڑی مشکلوں سے ہاتھ سے چھو کر بوسہ لیا۔ مقام ابراہیم وغیرہ پر نفل نماز ادا کی اور حرم شریف میں بالکل مقام ابراہیم کے سامنے فجر کی نماز پڑھی اور وہاں سے سعی کرنے چلا آیا۔ اس بار سعی پہلی منزل پر کی۔ دھیرے دھیرے اس منزل پر بھی لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد ہم لوگ باہر نکل کر پاکستانی سیلون پہنچے جہاں دس ریال دے کر حلق کرایا پھر ۵ لیٹر کا ایک گیلن

آب زمزم لیا اور ٹیکسی کر کے ہوٹل پہنچ گئے۔ غسل کیا اور کچھ دیر آرام کیا۔ مجھے سعودی ریال کی ضرورت تھی ایک صاحب ہمیں ایک مارکیٹ لے گئے جہاں ۱۱ روپے ریٹ سے ریال مل گئے۔ اسی روز ظفرالدین صاحب، قاضی ضیاء اللہ، شجاعت علی صاحبان کی فلائٹ تھی۔ احسن صاحب نے اپنے ماموں زاد بھائی شاہ محمد متین کو مکہ سے بلالیا تھا جو مکہ حرم شریف کے سامنے فندق دارالتوحید میں ہیں ان کی مدد سے ہی ہم نے پہلا عمرہ کیا تھا۔ ۹ جون کو ہمیں مدینہ منورہ جانا تھا۔ یہاں بھی گائڈ کی ضرورت تھی اور وہ محمد متین سے بہتر کون ہوتا۔ مدینہ منورہ کی دوری ۵۰۰ کیلومیٹر ہے جہاں ٹیکسی سے ساڑھے ۳ گھنٹے لگتے ہیں۔ اس لئے ہم لوگ تقریباً ۱۲ بجے پہنچے۔ پاکستانی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ پھر مسجد نبوی گئے۔ گرمی اپنے شباب پر تھی اے سی کام نہیں کر رہا تھا۔ ہم لوگوں نے اپنا سامان باہر ہی رکھا اور ظہر کی نماز حرم شریف کے اندر پڑھی پھر ریاض الجنتہ میں منبر رسولؐ، محراب رسولؐ پر نفل نماز پڑھی اور پھر روضہ رسولؐ جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ بھی ہیں پر فاتحہ پڑھی۔ سلام پیش کیا اور باہر آئے سامان لیا اور حرم شریف کے قریب ہی ہوٹل کی تلاش میں نکلے۔ بنگالیوں کے ایک ہوٹل میں ۱۰۔۱۰ ریال دے کر ایک کمرہ لیا جس میں ۳ بستر لگے ہوئے تھے۔ میری خواہش تھی کہ ایک شب مسجد نبوی میں گذاروں گا سو یہ خواہش بھی پوری ہوئی۔ وہاں سے پھر حرم شریف کے قریب آئے اور ایک ٹیکسی لی جس سے مسجد قبا، مسجد قبلتین، مسجد صبا، جبل اُحد گئے جہاں نفل نماز اور فاتحہ پڑھی۔ ہم لوگوں نے کئی طرح کی کھجور کی خریداری کی، ٹوپی، تسبیح اور جائے نماز لئے۔ مدینہ منورہ میں کافی سکون ملا۔ وہاں سے واپسی کے بعد مسجد نبوی میں مغرب کی نماز پڑھی۔ حرم شریف میں نماز کے بعد علماء حضرات کھجور کھاتے اور قہوہ پیتے نظر آرہے تھے ہم لوگ جب پہنچے تو انہوں نے مخلصانہ انداز میں ہمیں پیش کیا اور ہم لوگ بھی ان سے لطف اندوز ہوئے۔ آب زمزم خوب پی عشاء کی نماز پڑھ کر پھر ریاض الجنتہ اور گنبد خضریٰ میں نفل نمازیں ادا کیں اور سلام پیش کیا۔ باہر آئے۔ کچھ خریداری کے بعد بنگالی ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا پھر ہوٹل جا کر سو گئے۔ صبح بیدار ہوئے فجر کی نماز حرم شریف میں پڑھی اور ریاض الجنتہ اور گنبد خضریٰ پر حاضری دیتے ہوئے واپس آئے۔ جنت البقیع کا گیٹ فجر کی نماز کے بعد کھلا تھا وہاں پہنچے فاتحہ پڑھی۔ ان جگہوں پر مطوع اور پولس بھی رہتی ہے۔ جنت البقیع میں حاضری بھی بڑی اہم تھی۔ تمام مزارات ایک جیسے تھے اور تمام کچے صرف چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑے سرہانے میں گڑے ہوئے تھے۔ یہاں سے ہم لوگ پھر ریاض الجنتہ اور گنبد خضریٰ پہنچے اور وہاں سے رخصت ہو کر ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ ٹیکسی لی اور بڑے اطمینان سے جدہ آگئے۔ ہمارا ٹکٹ کنفرم ہو چکا تھا۔ ۱۰ جون کو فلائٹ تھی۔ ڈاکٹر محمد احسن کے دوست ارشاد احمد جدہ میں ہیں انہوں نے اپنی گاڑی سے مارکیٹ گھمایا۔ اپنے آفس لائے پھر اچھا کھانا کھلایا۔ اسی طرح جدہ میں ہی محمد طفیل اپنی گاڑی سے مارکیٹ لائے جہاں ہم لوگوں نے کچھ خریداری کی۔ بڑے مخلص شخص ہیں۔ یہ تمام حضرات بہار کے ہی ہیں۔ ۱۰ جون کو گڈو کی گاڑی سے ہم لوگ جدہ ایئرپورٹ آئے۔ بورڈنگ پاس لینے کے بعد ہم سب بیٹھ گئے۔ تقریباً گیارہ بجے شب میں فلائٹ کھلی اور ہم لوگ دمام ایئرپورٹ پہنچے۔ وہاں ایک گھنٹہ ایئرپورٹ پر رہے۔ جہاں سے فلائٹ سیدھے نئی دہلی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پہنچی۔ ہندوستان میں پٹنہ سے دہلی اور حیدرآباد کنگ فیشر، سہارا ایئرویز (جواب بند ہو چکا ہے)، جیٹ ایئرویز وغیرہ سے سفر کر چکا ہوں۔ مجھے سعودی ایئرلائنس کی سروس بہتر نہیں معلوم

ہوئی۔ کافی Crowd تھا۔ کھانا وغیرہ کا انتظام بھی بہتر نہیں تھا صرف ایئر ہوسٹیز کی پوشاکیں اچھی لگ رہی تھیں۔ کہیں سے عریاں نہیں تھیں۔ جدہ ایئرپورٹ بڑا ایئرپورٹ ہے۔ ۱۰ ربجے ہم لوگ ۱۱رجون کو دہلی پہنچے کافی تکان کا احساس ہو رہا تھا۔ گرمی بھی شدید تھی۔ لمبی قطار کی وجہ سے کافی وقت لگا۔ ویزا پر اسٹامپ لگوانے پڑتے ہیں۔ وہاں سے پری پیڈ ٹیکسی سے ہم لوگ اپنے چھوٹے بھائی خرم کے یہاں آ گئے۔ اماں جی تھیں اور ہمارا بھانجہ سروش تھا۔ سب سے پہلے غسل کیا حوائج ضروریات سے فارغ ہوئے اور ناشتہ کے بعد ہم لوگ یعنی میں اور احسن دہلی ریجنل سنٹر آ گئے جہاں ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر شاہد پرویز سے ملاقات ہوئی۔ پھر ڈاکٹر احسن وہاں سے اپنے احباب سے ملنے چلے گئے اور میں ملی کاؤنسل کے دفتر آ گیا صفی اختر صاحب سے ملنے۔ میں جب بھی دہلی جاتا ہوں ان سے ملنے ضرور آتا ہوں۔ وہاں سہیل عارفی اور دوسروں سے ملاقات ہوئی۔ وہیں سے میں آٹو ریز رو کر کے سید حامیور دیہار آ گیا جہاں بزرگ محترم مظہر امام صاحب کے یہاں چند لمحے بتائے۔ آٹو باہر کھڑا تھا۔ دو گھنٹہ کے بعد میں واپس ابوالفضل آ گیا۔ احسن بھی آ گئے اور اپنا سامان ساتھ لے گئے انہیں بھوپال جانا تھا۔ میرا ٹکٹ ۱۲رجون کی بہار سمپرک کرانتی ٹرین سے تھا۔ اسی روز جسونت اپارٹمنٹس ڈاکٹر محترمہ حلیمہ سعدیہ سے ملنے آ گیا وہ "تمثیل نو" کی خریدار بھی ہیں۔ ان کے خاوند انجینئر حیدر اقدس جیلانی موجود تھے۔ میرے ساتھ عزیزی سادات تھے جو جامعہ ملیہ میں ایم اے اردو کے فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ ہم دونوں کو انہوں نے بہت اصرار کر کے رات کا کھانا اپنے ساتھ کھلایا۔ بہت دیر تک گفتگو ہوئی۔ رات کے ساڑھے دس بجے خرم کے یہاں پہنچا۔ وہاں ننھے ماموں کی اہلیہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ رات میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ صبح ہوئی اسی روز ۱۲جون کو ہاشمی اپنی فیملی کے ساتھ دہلی پہنچے تھے۔ وہ مجھ سے ملنے آئے۔ ساتھ ناشتہ کیا پھر ان کی گاڑی سے مارکیٹ نکلے ہندوستان ایکسپریس کے سب ایڈیٹر احمد جاوید سے ذاکر نگر ملنے آ گیا۔ ان سے بھی ملنے میں اکثر آتا ہوں۔ موصوف مجھ سے کافی قریب رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک دو چیزیں مارکیٹ سے لیں اور پھر ہاشمی کے یہاں آ گیا وہاں کھانا کھایا۔ دھوپ تیز تھی کسی طرح آٹو ملا پھر ہم دہلی اسٹیشن پہنچے۔ بہار سمپرک کرانتی بروقت کھلی لیکن دربھنگہ تقریباً ۴ بجے پہنچی۔ وہاں سے کاشانہ فاروقی پہنچا۔ والد بزرگوار جناب ایم زیڈ ایم زیڈ فاروقی سے مصافحہ ومعانقہ کے بعد اہلیہ ڈاکٹر زہرہ شمائل، بچے نوا امام، فضا امام اور حیا فاطمہ سے روبرو ہوا۔ میرے خالہ زاد بھائی حاجی مسعود حسن شبو ملنے آ گئے۔ خالہ امی آئیں۔ خالو ابا جناب منصور حسن، ماموں افسر حسین رضوان، حسن امام فاروقی و دیگر حضرات سے ملاقات ہوئی۔ شام کے حصہ میں قلعہ گھاٹ پہنچا۔ دفتر میں سکنڈ سٹرڈے کی چھٹی تھی۔ سوموار کو دفتر پہنچا جہاں رفقاء سے ملاقات ہوئی۔ آرتھو سرجن ڈاکٹر اے حق، آئی آر سہیل ایڈوکیٹ، محمد حسنین ایڈوکیٹ، سید محمود احمد کریمی، ادریس پرویز ایڈوکیٹ، ممتاز عالم ایڈوکیٹ، حضرت مولانا ابوالحقانی، ایس ایم جاوید اقبال، محمد سراج الدین، ڈاکٹر ایم حسن، قاضی ابصار الحق، اے آر خاں، صداقت علی خاں، ڈاکٹر فیض احمد، شفاعت حسین، طالب انصاری، مظفر حسن، عون احمد، محبوب احمد خاں، وکیل احمد، غلام فرید، سید متین اشرف، سید محمد عرفان الدین، سید عتیق اللہ، ڈاکٹر ایس احمد ناصح، ایم اے صارم، محمد حسن امام فاروقی، محمد سہیل احمد وغیرہ سے بھی ملاقات ہوئی۔

میرا یہ سفر ایک ایسا سفر تھا جس میں اردو کی محبت تھی، جدہ کی طمانیت تھی، مکہ کی مقدس سرزمین کی

عقیدت تھی اور نبی کریمؐ کی سرزمین مدینہ کی زیارت کا ایک گلدستہ دل کے اندر کھلا ہوا تھا جس میں مختلف رنگ کے پھول تھے۔ رنگوں اور خوشبوؤں میں علاحدہ علاحدہ۔ لیکن ذہن و دل پر ایسے حاوی اور اس طرح مدغم ہو چکے تھے کہ ان کو الگ الگ کر کے لفظوں کا جامہ پہنانا اور ان کی خاصیت کا بیان کرنا مجھ ناچیز کے لئے ناممکن ہے۔ جو میں محسوس کر رہا تھا وہ میں جانتا تھا یا میرا خدا جو ولولہ جو جوش موجزن تھا۔ آپ اسے جنوں کا نام دے سکتے ہیں یا عرفان آفاق کا عکس کہہ سکتے ہیں۔ میں دیوانہ وار شرف باریابی اور خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سجدہ ریزی کے اس معراج پر تھا جہاں اپنا سدھ بدھ بھی مجھے نہیں رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں کیا ہو رہا ہے کیسے ہو رہا ہے کیونکر ہو رہا ہے۔ ایک وجدانی کیفیت تھی جو پورے سفر پر محیط رہی۔ جب میں چلا تھا تو بس یہ تھا:

منزل ملے، ملے نہ ملے اس کا غم نہیں ‏ ‏ ‏ منزل کی جستجو میں میرا کارواں تو ہے

زندگی میں مواقع تو بہت آتے ہیں لیکن ایسا موقعہ بہت کم آتا ہے جو یادگار بن جائے۔ ظاہر ہے مارکو پولو، ابن بطوطہ اور ای ایم فوسٹر نے بڑے دلچسپ سفرنامے لکھے ہیں اور یادگار سفرنامے لیکن وہ سفرنامے اپنی ادبی اور تاریخی حیثیت سے جتنے بھی اہم ہوں، ان تمام سفرناموں میں وہ وجدانی کیفیت جو میں نے محسوس کی اس کی زیریں لہریں کہیں نہیں دیکھ پایا کیوں کہ سفر کرنا ان کا مشغلہ تھا اور میرا سفر کرنا مشغلہ نہیں۔ بلکہ سفر اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لئے کرتا ہوں اور اس میں میرا دل و دماغ مکمل طور پر یکسوئی سے غور و فکر کرنے پر اکساتا رہتا ہے اس لئے میں نے تجربوں سے زیادہ احساسات و کیفیات کی ترجمانی اس سفرنامہ کے اوراق منتشر میں کی ہے۔ امید ہے کہ آپ اسی زاویہ سے اسے دیکھیں۔ عرب کی سرزمین اپنی شاعری کے لئے دنیا میں مشہور رہی ہے اور دور جاہلیت کی شاعری تو بامِ عروج پر رہی ہے۔ امراء القیس نے جو عشقیہ داستان لیلیٰ مجنوں کی لکھی ہے وہ اسی سرزمین سے تعلق رکھتی ہے:

کچھ حقیقت ہے کچھ فسانہ بھی ‏ ‏ ‏ جتنا سمجھا ہے اتنا جانا بھی

آج تک اس عشقیہ داستان کا کوئی متبادل نہیں ملتا ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں ہیر رانجھا کے قصے اور فارسی میں شیریں فرہاد کے قصے اپنی نوعیت کے معرکۃ الآرا قصے ہیں۔ لیکن یہ سارے قصے عالم وجود میں نہیں آتے اگر لیلیٰ مجنوں کا قصہ موجود نہ ہوتا۔ اس قصہ میں جو Punches ہیں وہ دیگر کہانیوں میں نہیں ملتے۔ اردو شاعری میں بھی عشق کی داستان کو مختلف زاویہ سے پیش کیا گیا ہے اس میں عربی شاعری کی روح اور لیلیٰ مجنوں کے قصے کا وہ اٹھان موجود نہیں۔ بہر حال سرزمین کا فرق بھی جذبوں کے فرق میں امتیازات پیدا کرتا ہے۔ عرب کی سرزمین پر جلال و جمال کی وہ کیفیت آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میرا یہ سفر علمی بھی تھا اور روحانی بھی، عالمی کانفرنس میں اردو کی عظیم شخصیتوں نے زبان و ادب کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا میں ان سے مستفید ہوا۔ سمندر پار اردو کے جادو کو سر چڑھ کر بولتے دیکھا تو نہ صرف مسرت ہوئی بلکہ یہ جذبہ بھی پیدا ہوا کہ اردو جو خود ہمارے اپنے دیار میں اجنبی بنتی جا رہی ہے اس کے فروغ کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے، لیکن یہاں یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ اس سفر کا حاصل سفر خانہ کعبہ، مسجد نبوی اور روضہ اطہرؐ کی حاضری تھی:

اس مقدس زمین پر آ کر! ‏ ‏ ‏ میں نے کعبہ کو رو برو دیکھا

جب مدینہ پہنچ گیا اعظم ‏ ‏ ‏ ہو کے روضہ کو باوضو دیکھا

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

کوہسار، بھیکن پور۳، بھاگلپور-812001 (بہار)

سات سمندر پار کا ہمعصر اُردو ادب

اردو آج اکیسویں صدی میں دنیا کی مقبول زبان ہے۔ یہ چار دانگ عالم میں بولی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ کمپیوٹر، سٹیلائیٹ اور انٹرنیٹ سے جڑ چکی ہے اور ٹی وی کے لئے اردو چینل آچکا ہے۔

دنیا کی ہر لسانی سسٹم میں کچھ نہ کچھ معاشرتی اور ثقافتی صفات ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اسی میں ساری نشانیات پوشیدہ ہوتی ہیں۔ چار سو سال قبل بتدریج عمل سے گزر کر اردو زبان موجودہ شکل میں پہنچی ہے۔ جس کی اپنی نشانیات ہیں، اپنا لہجہ اور تلفظ ہے۔ اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنی روایت، اپنا تمدن اور اپنی انفرادیت کا تحفظ یقینی طور پر ہے۔

اردو زبان اپنی دلکشی، اپنی شیرینی اور اپنی صلاحیت کی بدولت زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ چوں کہ یہ رابطے کی زبان ہے، ادب کی زبان ہے، تعلیم کی زبان ہے اور ہر طرح کے جذبات کے اظہار کی زبان ہے اس لئے قومی تشخص اور قومی کلچر کی زبان ہے۔

زندگی کی حقیقتوں، بھاؤں تاؤں، حوصلوں، تمناؤں، مجبوریوں، تلخیوں اور مسکراہٹوں کا احساس اردو زبان اور اس کے ادب کی سانسوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ نئے رنگ، نئے ڈھنگ، نئے انداز، نئے الفاظ اور نئی تشبیہوں کی چاندنی سے اردو زبان اور ادب روشن ہیں جن میں ماضی ہے، حال ہے اور مستقبل کا عکس بھی ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کا عکس نمایاں ہے۔

سات سمندر پار کے قلمکاروں نے عرصہ سے اردو کے رشتوں کو مضبوط کیا ہے، عہد کے تناظر میں ازلی اور ابدی بندھن کو جوڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور تجربے، تازہ کاری اور دریافت نو کے امکانات کے ساتھ محسوسات کو تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ ساتھ ہی رنگارنگی پیدا کی ہے۔

برطانیہ کے قلمکاروں میں رالف رسل، انور شیخ، اطہر راز، بخش لائلپوری، وِدیا ساگر آنند، ساحر شیوی، صابر ارشاد عثمانی، ش صغیر ادیب، گلشن کھنہ، سوہن راہی، عبدالغفار عزم، محمود ہاشمی، عاصی کاشمیری، ایوب مرزا، عاشور کاظمی، اقبال مرزا، عطیہ خان، بانو ارشد، صفیہ صدیقی، سلطانہ مہر، مقصود الٰہی شیخ، اکبر حیدرآبادی، ساقی فاروقی، قیصر تمکین، رضا علی عابدی، خالد یوسف، حیدر طباطبائی، مصطفےٰ شہاب، ڈیوڈ میتھیوز، سیما جبار، نور جہاں نوری، فرزانہ خان، منزہ شاد، ارتقا شیخ، افتخار نسیم، اکرام اشعر، ضیاء الدین احمد شکیب، طلعت سلیم، خواجہ طارق محمود، اقبال راہی، منظر نقوی، غضنفر ہاشمی، محمد قاسم دہلوی، پرویز مظفر، رحیم اللہ شاد، جمیل اخگر، آدم چغتائی، گلزار سنگھ امرت، فضل کریم مغل، شکیب مرزا، ابراہیم ذوق، نسیم اختر، راجہ منتشر، محمد قدوائی، ضیا زیدی، ہارون الرشید، سارا نیر، راغب دہلوی، فاروق حیدر ناداں، اشفاق حسین، ملک فضل حسین، نوید حسن، چمن لال چمن، صباحت عاصم واسطی،

نجمہ انصار، اختر ضیائی، اعجاز احمد اعجاز، سلطان فاروقی، کنول نین پرواز، مختار الدین احمد، منور احمد کنڈے، عادل فاروقی، شوکت واسطی، ریاض جعفری، انور نسرین علیگ، رخسانہ رخشی، عقیل دانش، محمد صادق جاوید، خالد محمود، ایاز صدیقی، نور الصباح بیگم برلاس، عرفان مصطفےٰ، یاور عباس، امین مغل، عباس زیدی، مجاہد ترمذی، سلمان آصف، شمس الدین آغا، دردانہ انصاری، سحر مہدی، فہیم اختر، صفات علوی، جاوید اختر چودھری، اختر اعوان، ابراہیم رضوی، اختر گلفام، فیضان عارف، مہتاب خاں عباسی، فرحان اسلم، احمد نظامی، روحی مجید، ضیا شاہد، جوہر کاظمی، مجید قریشی کے نام اہم ہیں۔ ان میں شاعر، ادیب، افسانہ نگار، صحافی سبھی شامل ہیں۔ بیشتر کی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ انور شیخ، ودیا ساگر آنند، ساحر شیوی، عاشور کاظمی وغیرہ پر کئی کتابیں طبع ہوچکی ہیں۔ صابر ارشاد عثمانی کی محمد علی جوہر پر بیحد ضخیم کتاب چرچا میں رہی ہے۔ ساحر شیوی اور انور شیخ پر ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی ہوچکی ہے۔ لندن سے ''جنگ'' اور ''نیشنل'' مقبول ترین اخبار ہیں۔ ''نوائے وقت'' بھی مقبولیت رکھتا ہے۔ ''آواز'' ''اوصاف'' ''دی پاکستان پوسٹ، اردو ٹائمز'' ''دی عوام نیوز'' ''کشمیر نیوز'' ''کشمیر پوسٹ'' ''ایشیا ٹائمز'' وغیرہ نے اپنے وجود کا احساس دلایا ہے اور برطانیہ میں اردو صحافت کے معیار کو اونچا کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر اخبار انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔ ماہنامہ ''پرواز'' کثیر الاشاعت اور وقت کی پابندی سے شائع ہونے والا رسالہ ہے۔ ساحر شیوی اور صابر ارشاد عثمانی مدیر ہیں۔ سید معراج جامی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ ودیا ساگر آنند اور ساؤتھ افریقہ کے وسیم بٹ وسیم سرپرست ہیں۔ ہر شمارہ میں گوشہ کی وجہ سے اور بیحد معیاری تخلیقات کی وجہ سے ''پرواز'' پوری اردو دنیا کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ عبدالغفار عزم ''اردو تحریک'' اقبال مرزا ''صدا'' حیدر طباطبائی ''شہرزاد'' اور مقصود الٰہی شیخ ''مخزن'' نکالتے ہیں۔ پہلے وہ ''راوی'' شائع کرتے تھے۔ ۲۵ برس تک پابندی سے نکالنے کے بعد منصور آفاق کے ہاتھ فروخت کردیا۔ کئی ادبی انجمنیں ہیں جن کے تحت مشاعرہ اور سیمینار بین الاقوامی سطح پر ہوتے رہتے ہیں۔

کئی یونیورسٹیوں اور مدرسوں میں اردو زبان اور ادب کے پڑھنے والے آج اکیسویں صدی میں بھی ہیں، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ بھی اردو زبان و ادب کی ترویج ہورہی ہے۔ اس طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کے تیسرے مرکز برطانیہ میں ہمعصر اردو ادب کا تشخص تابناک ہے۔

جرمنی بھی اردو کا ایک بڑا مرکز ہے۔ حیدر قریشی، ثریا شہاب، اسحاق ساجد، ضیاء الدین، نعیمہ ضیاء الدین، سید سرور ظہیر غزالی، حنیف تمنا، اختر سید، نور اقبال بیابانی، علی حیدر وفا، انور ظہیر رہبر، عشرت معین سیما، رخسار انجم وغیرہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں فعال ہیں۔ حیدر قریشی افسانہ، تنقید، خاکہ، شاعری، انشائیہ اور صحافت میں نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی درجن بھر کتابیں طبع ہوچکی ہیں۔ اردو میں ماہیا کے علمبردار ہیں۔ ''جدید ادب'' کے نام سے معیاری رسالہ نکالتے ہیں۔ اس سے قبل جرمنی سے ہی ماہنامہ ''اردو دنیا'' نکالتے رہے ہیں۔ اسحاق ساجد بنیادی طور پر شاعر ہیں اور صحافی ہیں۔ ''سمندر'' کے نام سے رسالہ نکالتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''جمال دوست'' منظر عام پر آچکا ہے۔ افسانہ اور تنقید بھی لکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن پر مضامین کا مجموعہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ترتیب دے کر شائع کرایا ہے۔ ثریا شہاب اور نعیمہ ضیاء الدین افسانے لکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے۔ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی نے اردو زبان اور ادب

کے باب کو روشن کیا ہے! چند شاعروں کے اشعار ملاحظہ کریں:

کہنے کو تو سایہ ہے
جال سنہری سا
زلفوں کا بچھایا ہے (ماہیا۔حیدر قریشی)

ایسا کرو تم / اپنی خواہشیں اور سوچیں / قید کر دو / کہیں ایسا نہ ہو کہ / تم گم کردہ منزل کی تلاش میں سرگرداں / اپنا نشاں بھی بھول جاؤ / اور مہر و وفا کی چاہ میں / لوح مزار نہ بن جاؤ (نظم "سفر"۔ اسحاق ساجد)

اک پل ایسا آئے گا / جو روشنی بکھیرے گا / گلی گلی سنوارے گا / بس خواہش دل ہے کہ / ہم سب دیکھ سکیں۔ (نظم۔نور اقبال بیابانی)

حسن بچوں کی اداؤں میں بکھر جاتا ہے
حسن ماؤں کی محبت میں نظر آتا ہے...... (علی حیدر وفا)

نہ جفا ہی کر سکے وہ نہ وفا
حق میں ان کے بھی دعا کرتے رہے...... (ناہید ادا)

تتلیوں کے بیل بوٹے دیکھنا
بے تحاشہ خواب جھوٹے دیکھنا...... (رخسار انجم)

کنیڈا چوں کہ ایک کثیر الثقافتی، کثیر النسلی اور کثیر اللسانی ملک ہے۔جس میں تارکین وطن کے ثقافتی، معاشرتی، مذہبی اور ادبی اقدار کو برقرار رکھنے کے لئے حکومت کی جانب سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ اردو زبان وادب کے تحفظ کے لئے بھی حکومت کی طرف سے اعانت ملتی ہے۔ اردو کو کنیڈا میں سب سے پہلے عزیز احمد نے متعارف کرایا۔ وہ 1963ء میں پروفیسر کی حیثیت سے کنیڈا گئے تھے۔ 1964ء میں ٹورنٹو میں American Historical Society and Canadian Historical Association کا مشترکہ اجلاس ہوا تھا جس میں عزیز احمد نے مضمون "اردو غزل کا ارتقا: تاریخی تناظر میں" پڑھا تھا۔ یہ پہلا مضمون تھا جس سے کنیڈین آشنا ہوئے تھے۔ دوسرا مقالہ پروفیسر عبدالقوی ضیاء نے شہر Fred Riction میں ایک کانفرنس میں پڑھا جس کا عنوان "عصری اردو شاعری تاریخی تناظر میں" تھا۔ ان دو مقالوں کا چرچا خوب ہوا۔

اس کے بعد اردو ادب کو متعارف کرانے کا سلسلہ چلا۔ کانفرنسیں ہونے لگیں۔ 1983ء میں ایک عظیم الشان کانفرنس ٹورنٹو میں اشفاق حسین نے کیا جس میں ہندوستان، پاکستان اور انگلستان کے ادباء وشعراء نے شرکت کی تھی۔ خالد سہیل اور حفظ الکبیر قریشی کی کوششیں بھی رنگ لائیں۔ اردو اخبارات اور رسائل نکلنے لگے۔ ٹی وی اور ریڈیو پر پروگرام ہونے لگے۔ پھر ایک وہ وقت آیا جب McGiLL یونیورسٹی میں اعلیٰ سطح پر اردو پڑھائی جانے لگی۔ اور Middle Eastern Studies Centre میں اردو Chair قائم ہوئی۔ بقول پروفیسر عبدالقوی ضیاء:

> "یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ ٹورنٹو یونیورسٹی میں جب تک عزیز احمد زندہ رہے اردو اعلیٰ سطح پر پڑھاتے رہے۔ گورنمنٹ

کی طرف سے اگر پندرہ طلباء اردو پڑھنے والے مہیا ہو جائیں تو اس کا سارا خرچ دیا جانے لگے گا۔ اردو کی بات ٹورنٹو سے نکل کر مانٹریال، اوٹاوہ، ایڈمنٹن اور دوسرے شہروں میں چل نکلی۔ اس کا حوالہ میری کتاب Vision And Envision Urdu Literature And Language In Canada

میں موجود ہے۔ اردو زبان وادب اس ملک میں ارتقا کی بہت سے دشوار گزار منزلیں طے کر کے اس نقطہ پر پہنچ چکی ہے کہ اس کا چرچا ہماری زندگی کا روز مرہ بن گیا۔ ٹورنٹو سے آج جتنے اخبارات ورسائل نکلتے ہیں اتنے کراچی یا لاہور سے بھی نہ نکلتے ہوں گے۔ یہاں کے ٹی وی، ریڈیو اسٹیشن سے برابر اردو میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ اب تک اردو کے کئی شعراء کا کلام انگریزی میں ترجمہ ہو کر بصورت Anthologies چھپ چکا ہے۔ اور اس میدان میں سب سے کارہائے نمایاں حفظ الکبیر قریشی اور بیدار بخت نے انجام دیئے ہیں۔ ادبی جلسوں کے انعقاد میں جو سرگرمیاں اشفاق حسین نے دکھائی ہیں ان سے انکار ممکن نہیں۔''

اردو ادب کے خدمت گاروں میں شاہین کا بھی نام آتا ہے۔ سید معین اشرف، علی طیب، جاوید دانش، شاہد حسین رزاقی، اکرام بریلوی، رضا الجبار، عقیلہ کیانی، سید خورشید عالم، عقیلہ شاہین، جوش مندوزئی، نذرت یار خاں، نسیم سید، انور نسیم، اقبال حیدر وغیرہ نے بھی کینیڈا میں اردو زبان وادب کی خدمت کی ہے۔ عرفانہ عزیز، سلیم قریشی، ناشاد جونپوری کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا! گاہے گاہے ستیہ پال آنند بھی کینیڈا میں قیام کرتے رہے ہیں۔

ترکی میں بھی اردو ادب پر بہت کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں میں تین سطح پر اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پہلی سطح پر بی اے کی ڈگری کے لئے مقالے لکھے جاتے ہیں۔ دوسری سطح کے مقالے ایم اے کے لئے لکھے ہوتے ہیں اور تیسری سطح کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لئے ہوتی ہے۔ پروفیسر خلیل طوق آر استنبول یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔ وہ اردو زبان اور ادب کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ مضامین لکھتے ہیں اور تحقیقی مقالے لکھنے میں طلبا کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے بقول ترکی کی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی، ایم اے اور بی اے کے جن طلباء نے تحقیقی مقالے لکھے ہیں ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

احمد آل بیراق (Ahmet Albayrak)، جلال توریر (Celal Turer)، جودت قلیچ (Cevdet Kylic) علی چقماق (Ali Cakmak)، احمد ہونوک (Ahmet Hunuk)، مصطفےٰ یلدیریم (Mustafa Yildirim)، ولی اور خان (Veli Ur han)، رضا بارش (Ryza Baris)، ابراہیم قاپلان (Ibrahim Kaplan)، داؤد شاہین (Davut Shahin)، کمال دایانیر (Kemal Dayanir)، نظمیہ چام (Nazmiya Cam)، تحسین قرلی (Tahsin Kirli)، فاطمہ گوک (Fatma Gok)، یوسف سائین (Yusuf Sayin)، ایم شوکت بیرام (M. Sevket Bayram)، الیاس مینڈی (Ilyas Mendi)، حسین شاہین (Huseyin Sahin)، عائشہ گل شانلی (Ayse gul Sanly)، طاہر یارئین (Tahir Yaren)، فاروق آق دوغان

(Faruk Akdogan)، ایف جوشکون (Elif Coskun)، عبدالحمید بوکوم (Abdul hamit Bukum)، نائل ایکیز (Nail Ekiz)، صبری آلاجہ خان (Sabri Alacahan)، احمد کیس گین (Ahmet kesgin)، آدم ایکمیک چی (Adem Ekmekci)، جلال سوئڈان (Celal Soydan)، سلمیٰ بینلی (Selma Benli)، امید اوقائی (Umit Okay)، عدلیت چوغال (Adalet Cogal)، نظمی بیرام (Nazmi Bayram)، خلیل دیمیرانی (Halil Demiray)، مظفر صاری اوز (Muzaffar Sarioz)، پینار دلشاد (Pinar Dilsad)، شکری شیمشک (Sukru simsek)، پیلین اورگین آئیدین (Pelin Ozgen Aydin)، شنائی بویوک پتراک (Senay Buyukpitrak) وغیرہ نے اردو زبان اور ادب کے فروغ میں حصہ لیا ہے۔ آرزو سورین ترکی کی یونیورسٹی میں ڈاکٹر خلیل طوق آر اکی کلیگ ہیں۔ ان کے مضامین بھی اردو میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نارڈک ممالک میں اردو نے اپنا جادو جگایا ہے اور اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ڈنمارک سے ترغیب بلند ''ظریف'' کے نام سے رسالہ نکالتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ''سرمایۂ شعراء'' کے نام سے 940 صفحے میں موضوعاتی شاعری کے علاوہ سخن وری کی بیشتر اصناف کو یک جا کر کے ایک بڑا کام انہوں نے کیا ہے۔ اس کے تحت غزل، نظم، حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، مرثیہ، نوحہ، مناجات، مسدس، سہرا، قطعات تاریخ، رباعی، مثنوی، ہجو، کتبہ، گیت، ٹھمری، منظوم اقوال، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، نثر لطیف، خیال، دوہا، ہولی، بھجن، ڈوہڑہ، ملی نغمے، گانے، ہائیکو، تضمین، قوالی، لوری، ماہیا، ثلاثی، کافی، اپنے وقت کے مشہور اشعار، مشہور مثل، محاورے اور مقولے اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ بڑا ادبی کام ڈنمارک سے ہوا ہے۔ اسٹاک ہوم سے جمیل احسن رسالہ ''منزل'' نکالتے ہیں۔ شاعر ہیں اور مجموعۂ کلام کے خالق ہیں۔ لونڈ (سویڈن) سے زبیر وارثی گذشتہ دس سال سے بلاناغہ ''زاویہ'' نکال رہے ہیں۔ وہ مضامین اور افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''جو سچ کہہ دوں'' پریس میں ہے۔ وہاں اردو اکیڈمی اور لائبریری بھی قائم ہے۔ اس طرح اردو زبان وادب کو فروغ مل رہا ہے۔ مالمو، وکشو، استافن استوف، لانڈس کلونا، ہلسنگ برگ وغیرہ جگہوں میں سرتاج حسین، عابد محمود، شرف نوید، جاوید حسن، آغا ذکی خاں، مرزا تصدق حسین بیگ، ارجمند کالستائن، عبدالروف کلیم، منیر بھٹی، طیار رضوی، شاہد باجوہ، سجاد بٹ، نعیم مجاہد وغیرہ اردو کے تئیں فعال ہیں۔ ڈنمارک سے محمد آصف خواجہ ماہنامہ ''شاہین'' نکالتے ہیں۔ ناروے میں اردو زبان وادب پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ یہاں سے ''بازگشت'' ''کارواں'' ''آواز'' اور ''پیام مشرق'' جیسے رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ہرچرن چاؤلہ، جمشید مسرور اور فیصل ہاشمی کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ شاہد عمران رانا، چودھری سعید احمد، وسیم سجاد، نجیب نقوی، محمد اکرم شاہ جیلانی اور نوید خاور وغیرہ اردو ادب کے خدمت گذار ہیں۔ ان سب میں نمایاں نام جمشید مسرور کا ہے۔ وہ شاعر، ڈراما نگار اور صحافی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ حکومت کی طرف سے انہیں بڑا انعام واعزاز ملا ہے۔ ان کی کتابوں کے نام ''شاخ منظر'' ''میری خوشبو میرے پھول'' ''دیوار ہوا پر آئینہ'' ''ذولسانی'' ''لمحوں کے سمندر'' وغیرہ ہیں۔ جمشید مسرور:

فریاد کا اک حرف سنائی نہیں دیتا
یہ ظلم ہے کیسا کہ دہائی نہیں دیتا

فیصل ہاشمی:

میری آنکھوں کو وہ چھینے کی سزا دیتا ہے
جو بھی منظر ہو وہی خوف نیا دیتا ہے

نجیب نقوی:

ہوتی ہے اگر بات کوئی تاب سے باہر
آتش نہ نظر آئے مگر دل تو جلے

عطاء الحق قاسمی جب بحیثیت سفیر ناروے میں تھے تب اردو زبان و ادب میں کچھ زیادہ ہی گرماگرمی محسوس ہو رہی تھی!

ہالینڈ میں ناصر نظامی اور احسان سہگل بیحد فعال ہیں۔ نثر اور شاعری میں ان دونوں کی کئی کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ انہیں عروض پر مہارت حاصل ہے۔ اکثر ہند و پاک اور برطانیہ کے رسائل میں عروضی موشگافیوں سے بھرپور ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اردو زبان اور ادب کے فروغ میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔

قبول اپنی کوئی دعا ہی نہیں
یوں لگتا ہے جیسے خدا ہی نہیں

(احسان سہگل)

مجھے معلوم ہے کہ داغ سب ہیں/ میرے چہرے پر/ مگر میں پھر بھی ان داغوں سے/ صاف انکار کرتا ہوں/ میں اپنے صاف چہرے پر/ بہت اصرار کرتا ہوں/ اسی اصرار کے باعث/ میں دل کے آئینے کے روبرو/ ہونے سے بے حد خوف کھاتا ہوں! (تسلسل۔ ناصر نظامی)

اسپین میں اردو کا قافلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ نذیر اے قمر اور اسد اعوان وہاں سے "دریچہ" کے نام سے سہ ماہی رسالہ نکال رہے ہیں۔ نذیر اے قمر کے ماہیوں کا مجموعہ "چاند اکیلا ہے" اور نظموں، غزلوں کا مجموعہ "بہار آنے تک" طبع ہو چکا ہے۔ اسد اعوان کا شعری مجموعہ "حرفِ پندار" شائع ہو چکا ہے۔ دونوں تنقید بھی لکھتے ہیں۔ ان کے دو ایک اشعار ملاحظہ کیجئے:

رنجشوں سے دماغ میں آتش
جیسے روشن چراغ میں آتش

(نذیر اے قمر)

اس دھرتی کی بھیڑ میں میری تم سے تھی پہچان
تم کیا بچھڑے میرے ہونٹوں سے بچھڑی مسکان

(نذیر اے قمر)

رابطہ تجھ سے محبت کا رہا شام وسحر
ہر کوئی تیری حکایات سے بیگانہ تھا

(اسد اعوان)

جاپان میں اردو زبان وادب کے فروغ کا کام اطمینان بخش ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں بی اے اردو کے چار سالہ کورس کے علاوہ ایم اے اردو اور پی ایچ ڈی کا بھی انتظام ہے۔ نصاب میں کلاسیکی اور جدید ادب شامل ہے۔ جاپانی سفارت خانوں، وزارت خارجہ اور ریڈیو جاپان کی اردو سروس سے بھی اردو زبان وادب کے باب روشن ہورہے ہیں۔ اردو کے نمائندہ ادب کا جاپانی میں ترجمہ کا کام جاری ہے۔

فرانس میں اردو 1830ء سے پڑھائی جارہی ہے۔ اردو زبان اور ادب سے واقفیت رکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ کالجوں میں اضافی مضمون کی حیثیت سے اردو ادب پڑھایا جاتا ہے۔ کتابوں کے ساتھ کیسٹ اور فلم کے ذریعہ بھی اردو ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لندن میں میری ملاقات آئسین ڈیز ولیئر سے ہوئی تھی۔ یہ پیرس یونیورسٹی، فرانس میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اردو زبان کے ساتھ وہ برصغیر ہندوپاک کی تاریخ بھی پڑھاتے ہیں اور لسانیات ان کا خاص موضوع ہے۔ رسم الخط کا تحفظ لازمی ہے ورنہ اردو ادب میں میر سے لے کر اقبال تک زبان کی لطافت اور فکری نعمتوں سے آنے والی نسل محروم ہو جائے گی۔

آسٹریلیا میں بھی اردو نے اپنا ڈیرا جما رکھا ہے۔ اوم کرشن راحت پرانے شاعر ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کنیز فاطمہ مضامین لکھتی ہیں اور رسالہ "بزم ادب" نکالتی ہیں۔ اوم کرشن راحت کے دو اشعار دیکھئے:

نکلنا چاہتے ہیں سب حدوں سے ہم آگے
کسی کے در ہی سے بڑھتے نہیں قدم آگے
یہ زندگی ہے کہ میدان جنگ ہے راحت
سیاہ درد ہے پیچھے، سیاہ غم آگے

اٹلی میں بھی اردو لکھنے پڑھنے والے موجود ہیں۔ ارشد اقبال آرش اردو کا علم زور شور سے لہرا رہے ہیں۔ نثر ونظم میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ انہوں نے ایک رسالہ نکالنے کا بھی اعلان کیا ہے۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے:

اپنے ہوشربا حسن کی نزہت رہے باقی
انجام مرا کچھ ہو محبت رہے باقی
آرش کے لبوں سے یہ ہنسی چھیننے والے
یونہی تیرے ہنسنے کی یہ عادت رہے باقی

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سات سمندر پار اردو زبان اور ادب کا مستقبل روشن ہے۔

پروفیسر مجید بیدار، شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

سرحد پار کے نثری ادب کا حقیقت پسند تجزیہ

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے عالمی سطح پر بے شمار تغیرات رونما ہوئے ان تغیرات میں ہجرت کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اسی ہجرت کو اپنا مقدر بنا کر برصغیر سے مشرقی اقدار، تہذیب اور شائستگی کے ساتھ اردو زبان وادب کے شاعر وادیب نہ صرف دنیا کے خطہ خطہ میں پہنچ گئے بلکہ انہوں نے روزگار کی تلاش کے علاوہ شعر وادب کی روایت کے ساتھ مشرقی تہذیب اور روایات کو فروغ دیا جس کا مثبت نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں اردو زبان اور تہذیب سے لگاؤ کا جذبہ پیدا ہوا پھر رفتہ رفتہ اس زبان کے چاہنے والوں نے ادبی نشستوں اور مشاعرہ کلچر سے یکجہتی اور رواداری کو عام کیا جس سے غیر ملکی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جس سے اردو کا بول بالا ہوا اور ساری یوروپی دنیا میں اردو زبان اور اس کے کلچر سے یگانگت پیدا ہوئی۔ سیرت نبویؐ کے مطالعہ سے خود یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں ہجرت کو اہم مقام حاصل ہے اور مہاجر کی بے پناہ قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ اس سنت نبوی کی تکمیل میں برصغیر سے تعلق رکھنے والے بے شمار افراد نے تلاش روزگار اور تعلیم وتدریس کے علاوہ تہذیب وثقافت کی جانکاری کے لئے برصغیر سے نکل کر یوروپی ممالک کا رخ کیا اور وہاں بود و باش اختیار کرتے ہوئے روزگار اور حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی علمی اور تدریسی تشنگی کا بھی ازالہ کیا۔ جس کے مثبت نتائج اس طرح برآمد ہوئے کہ ہندوستان اور پاکستان سے شعر وادب کی جس روایت کو لے کر ان مہاجرین نے دوسرے ممالک میں قدم رکھا وہاں بھی اس روایت کی ترویج وترقی کے مواقع حاصل ہوگئے۔ جس کی وجہ سے مشرقی تہذیب وروایات اور اردو شعر وادب کی اخلاقی خصوصیات کو ان علاقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور رفتہ رفتہ شاعروں اور ادیبوں کے قافلے یوروپی ممالک میں بسنے کے بعد اپنی شناخت بنانے اور اس شناخت سے نامور ہونے کے لئے ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یوروپی ممالک میں بسنے والے اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقی صلاحیتوں میں نہ صرف اضافہ ہو رہا ہے بلکہ ان کی خدمات کی ستائش بھی کی جا رہی ہے۔

سرحد پار کے اردو لکھنے والوں میں نثر نگار بھی موجود ہیں اور شاعروں کی بھی کثیر تعداد موجود ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اردو ادب کی خدمت انجام دینے والے یوروپی قلم کاروں میں جہاں مرد حضرات کی تخلیقی کاوشیں نمایاں ہو رہی ہیں وہیں خواتین بھی اردو شعر وادب سے اپنا رشتہ جوڑ کر تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہی ہیں جس کا بین ثبوت یہی ہے کہ جب لندن سے ''مخزن'' کا پہلا شمارہ جولائی 2001ء میں شائع ہوا تو اس شمارے میں برطانیہ کے بارہ افسانہ نگاروں کی 36 کہانیاں شامل کی گئیں اور ان کہانیوں کا تجزیہ 12 پاکستانی ناقدین نے پیش کیا۔ مخزن کے 12 افسانہ نگاروں میں مرد وخواتین دونوں کے کارنامے شامل ہیں جس کے مطابق برطانیہ کے نامور 12 افسانہ نگاروں میں خالد یوسف، ستارہ لطیف خانم، ش۔ صغیر ادیب، شمسہ مسعود، صفیہ صدیقی، طلعت سلیم،

فیروز، جعفر، قیصر تمکین، محسنہ جیلانی، مقصود الٰہی شیخ، نجمہ عثمان اور یعقوب مرزا کے نام شامل ہیں۔ برطانیہ کے ان بارہ نامور افسانہ نگاروں میں صرف 5 مرد حضرات خالد یوسف، ش۔ صغیر ادیب، قیصر تمکین، مقصود الٰہی شیخ اور یعقوب مرزا کی تخلیقات اور ان کا تجزیہ شمارہ میں شامل ہے جب کہ اس شمارے میں سات خواتین اپنے افسانوں کے توسط سے جلوہ گر ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانیہ کی سرزمین میں تخلیقی نثر لکھنے والوں میں مرد و خواتین اپنا حصہ ادا کر رہی ہیں۔ جس انداز سے افسانوی نثر کی برطانیہ میں پذیرائی کے موقع فراہم ہیں وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کے قلم کاروں نے قصہ کہانی کو ایک آسان رویہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا بلکہ اظہار کی بے شمار قوتیں تخلیقی نثر میں موجود ہونے کی وجہ سے افسانہ نگاری کی صنف کی طرف توجہ دی اور یہ بھی کھلی حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں جس طرح غزل کو بلند مرتبہ حاصل ہے اسی طرح نثر میں افسانہ نگاری اپنے معیار اور وقار کو منا چکی ہے۔ اس لئے افسانوی نثر کے بڑھتے ہوئے قدم یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یوروپی دنیا میں اردو افسانہ کی مقبولیت کی سب سے اہم وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ تخلیقی حسیت کو افسانہ کے توسط سے نمایاں کرنے میں قلم کار کو نہ صرف ذاتی آشتی ہوتی ہے بلکہ وہ اپنی تخلیق کے ذریعہ قاری کے دل کے گوشوں تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ یہ بھی خوش آئند بات ہے کہ برطانیہ کے 12 اہم افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پاکستان کے نامور نقادوں نے کیا۔ جس کی حقیقت جاننے کے لئے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جن ناقدین نے بارہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تجزیہ کا حق ادا کیا ان میں پروفیسر ریاض صدیقی، احمد ہمیش، محمد منشا یاد، حسن عابدی، ممتاز احمد خاں، رشید نثار، عذرا اصغر، علی حیدر ملک، انور سدید، ایم خیام، فردوس حیدر اور نثار ترابی کے نام شامل ہیں۔ ان تجزیہ کار نقادوں کی فہرست پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ تنقیدی نثر لکھنے والوں میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے چوں کہ عذرا اصغر اور فردوس حیدر ہی دو خواتین ہیں جنہوں نے تنقیدی نثر کی طرف توجہ دی اور یہ اندازہ لگانا بھی بہت آسان ہے کہ یوروپی ممالک میں جہاں اردو نثر کے تخلیقی رویے فروغ پا رہے ہیں اور افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری کی طرف بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ تنقیدی نثر لکھنے والوں کی تعداد سارے یوروپی ممالک ہی نہیں بلکہ برطانیہ میں بھی مفقود ہے۔ نثر کے حوالے سے یوروپی دنیا میں جہاں افسانہ نگاروں کی کثرت ہے وہیں دوسری نثری اصناف میں افسانوی نثر کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی نثر کے فروغ پر بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ بلاشبہ نثری نگارشات میں افسانوی نثر کو یوروپی تخلیق کاروں نے پسند کیا ہے چنانچہ ناول، افسانہ، ڈرامہ، اور ناولٹ لکھنے کی روایت یوروپی ممالک کے اردو نثر نگاروں میں تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ غیر افسانوی نثر لکھنے والے ادیبوں میں بلاشبہ رپورتاژ کو یوروپی دنیا میں اعتبار کا درجہ حاصل ہے۔ جس کے بعد یوروپی ممالک میں سفرنامہ جیسی غیر افسانوی صنف کی طرف یوروپی قلمکار متوجہ نظر آتے ہیں۔ دیار غیر میں نثر کو فروغ دینے والے ادیبوں نے اردو نثر کو ایک نئے اظہار سے وابستہ کیا جسے مقصود الٰہی شیخ نے یاد نگاری کے نام سے اپنے شماروں میں جگہ دیے جو در حقیقت شخصیات کے مرقع یا خاکوں پر مبنی ایسے مضامین ہیں جن میں شخصی تاثرات کا احاطہ کیا جاتا ہے یعنی یوروپی دنیا میں نثر کا وہ انداز بھی فروغ پا رہا ہے جو خاکہ نگاری یا سوانحی خاکے کے علاوہ مرقع نگاری کی دلیل ہے اور یوروپی دنیا میں شاعروں اور ادیبوں کے گذر جانے کے بعد ان پر پیش کیے

جانے والے شخصی مضامین کو یادنگاری کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس طرح ہجرت کے ذریعہ دوسرے ممالک میں آباد ہونے والے اردو کے نثر نگاروں نے دیار غیر کی سرزمین میں اپنے اسلاف کی یادوں کو تازہ رکھنے کی ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے جس کے لئے بلاشبہ یوروپی شاعروں کی پذیرائی کی جانی چاہیئے۔

شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت کے بعد ان پر تعارف اور تبصرے کی روایت بھی تیزی سے فروغ پارہی ہے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف قلم کار کا تعارف منظر عام پر آتا ہے بلکہ اس کی تخلیق کی ہوئی کتاب کے محاسن اور معائب پر بھی توجہ دی جانے لگی ہے۔ یہ سلسلہ یوروپی دنیا میں برسہابرس سے جاری وساری ہے۔ جس کے ساتھ ہی ترجمے کی روایت کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان جیسے ممالک میں عام طور پر یوروپی زبانوں کی تخلیقات اور نگارشات کے ترجمہ کی روایت عام ہے چنانچہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ انگریزی میں لکھی جانے والی شاہکار کتابیں اردو میں ترجمہ کی جاتی ہیں یا پھر علاقائی زبانوں کی تخلیقات کے ترجمے کی طرف اردو ادیبوں کی توجہ مبذول ہے لیکن یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ یوروپ میں بسنے والے شاعروں اور ادیبوں نے مشرقی ممالک سے شائع شدہ تصانیف پر توجہ دیتے ہوئے ترجمے کی روایت کا آغاز کیا چنانچہ ترکی، عربی، فارسی اور ازبک زبانوں کی تخلیقات کو اردو میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ ترکی افسانہ نگار خدیجہ ائر چلیبی کے افسانے ''خنداں'' کا اردو ترجمہ اور تاثر اور تبصرہ یوروپی رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ بلاشبہ غیر افسانوی نثر کے قلمکاروں کی تعداد یوروپ میں بہت کم ہے لیکن وہ ترجمہ، رپورتاژ، تبصرہ، یادنگاری اور خاکہ جیسی اصناف کو اختیار کر کے نثر کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بلاشبہ اس حقیقت کا انکشاف کرنا پڑتا ہے کہ یوروپی ممالک میں ادب کی خدمت انجام دینے والے شاعروں اور ادیبوں کو اس سرزمین میں ناقدین میسر نہیں۔ اس لئے ان ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر تجزیہ اور تبصرہ کرنے والے بیشتر نقاد ہندوستان اور پاکستان کے ادیب ہیں، جنہیں یوروپی قلمکار صرف امریکہ اور برطانیہ ہی میں نہیں بلکہ کنیڈا، یوروپ اور دوسرے مقامات پر اپنی آبادیاں بسا چکے ہیں اور انہوں نے قلم کی کاشت کے ذریعہ ادب کی توسیع کا ارادہ کرلیا ہے۔ یہ بات بھی بڑی خوش آئند ہے کہ یوروپی دنیا کے قلمکاروں میں ایسے ادیبوں کی کمی نہیں جو سائنسی علوم وفنون کے علاوہ عمرانیات، فلسفہ اور منطق پر بھی اپنے مضامین قلمبند کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوروپی دنیا میں نثر نگاری کی فضا ہموار ہو چکی ہے اور تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی ادب کی کئی اصناف کی طرف اردو کے یوروپی ادیبوں کی توجہ مبذول ہوتی جارہی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یوروپ میں بسنے والے اردو کے ادیب اور شاعر اپنی مصروف زندگی میں روزگار کے مسائل حل کرتے ہوئے شعر وادب کی تخلیق اور اشاعت کے لئے بھی اپنا وقت مختص کرتے ہیں۔ چنانچہ وہاں منعقد ہونے والی شعری اور نثری نشستیں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش سے ہجرت کر کے یوروپی دنیا میں آباد ہونے والے اردو ادیبوں نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کا سازگار ماحول پیدا کیا ہے اور مستقبل میں اس کے ثمر آور نتائج برآمد ہوں گے۔

❀❀❀

پروفیسر افتخار اجمل شاہین، کراچی (پاکستان)

''یادوں کی دستک'' پر ایک نظر

مندرجہ بالا کتاب صوفیہ انجم تاج کی خودنوشت ہے جو ان کی پہلی نثری کتاب ہے۔ اس سے پہلے ان کا ایک خوبصورت شعری مجموعہ ''سرگوشی بہار کی'' شائع ہو چکا ہے، یادوں کی دستک ان کی یادنگاری کا ایک خوب صورت مرقع ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے بچپن سے لے کر اب تک کی یادداشتوں کو سوانحی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ آج کل یادداشتیں لکھنے کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے، بعض نے تو منظوم یادداشتیں کہی ہیں ان میں حمایت علی شاعر اور امریکہ ہی مقیم ایک معروف شاعرہ رشیدہ عیاں کے نام مجھے خاص طور پر یاد آ رہے ہیں۔

مشفق خواجہ بھی یادداشتوں یا خودنوشت سوانح پر بڑا زور دیتے تھے اکثر ادیبوں کو اپنی یادداشتیں لکھنے کو کہتے تھے۔ انہوں نے افسر ماہ پوری کو بھی اس کام کے لئے آمادہ کر دیا تھا چنانچہ ان یادداشتوں کی چند قسطیں بھی شائع ہوئی تھیں مگر بوجوہ یہ سلسلہ آگے نہ چل سکا۔ مشفق خواجہ کہا کرتے تھے کہ خودنوشت سوانح یا یادداشتوں میں صرف اس کے مصنف کا ہی ذکر نہیں ہوتا ہے بلکہ اس وسیلے سے بے شمار اہم لوگوں کا ذکر بھی کتاب میں آ جاتا ہے۔ نیز اس زمانے کی تہذیب و ثقافت کا بھی حال یادداشتوں سے معلوم ہو جاتا ہے۔ میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ اس طرح کی تحریریں بڑی معلوماتی اور افادیت کی حامل ہوتی ہے یادنگاری کے سہارے بہت سے چہرے سامنے آ جاتے ہیں جن کو زمانہ بھلا چکا ہوتا ہے، نیز گزرے ہوئے زمانے اور اس سے وابستہ تہذیب و ثقافت، اور رسم و رواج کے تذکرے سے ہمارے سامنے اس عہد کی زندہ تصویریں سامنے آ جاتی ہے گو کہ زمانے کے انقلابات سے بہت سی تصویریں ہمارے ذہن سے دور ہو جاتی ہیں۔ ان یادداشتوں کے ذریعہ ہم اپنے ماضی کی بازیافت کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کا تذکرہ، گاؤں اور شہروں کا ذکر ایک فلم کی طرح سے ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ بعض لوگ تو ماضی کی ان تصویروں کو اپنی زندگی کا ایک اہم جزو یا حصہ تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شادانی کے اس شعر کا اطلاق ماضی کی ان سنہری یادوں پر ہونے لگتا ہے:

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں ☆ انہیں کی یاد میری زندگی ہے

صوفیہ انجم بھی اپنے ماضی کو یاد کرتی ہیں، زندگی کا جو حصہ وہ وہاں گزار آئی ہیں اسے یاد کرتی ہیں۔ اپنے بزرگوں جن میں ان کے سگے رشتہ دار، اور ہمسائے ہوتے ہیں۔ ان کا خلوص اور ان کی محبت یاد آتی ہے تو ماضی کے دور میں چلی جاتی ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں ایک جگہ خود لکھا ہے:

''مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر دو روحیں بستی ہوں ایک وہ جو بچپن کی حسین یادوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی آج تک اسی زمانے میں رہ رہی ہے۔ دوسری وہ ہے جو عصر حاضر کی بالغ عورت ہے، جس نے زندگی کے نشیب و فراز کو قدم بہ قدم چل کر طے کیا ہے، یہ دونوں روحیں آپس میں پرانی سہیلیوں

کی طرح کئی باریوں گلے ملتی ہیں کہ یہ قیاس کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ بچپن کی معصوم اور کھلنڈری روح کون سی ہے اور آج کی تعلیم یافتہ زمانہ شناس بالغ روح کون سی ہے"۔

اس طرح وہ بہت ہی خوبصورت اور موثر انداز میں اپنے بچپن کا موازنہ اپنی حالیہ عمر یا زندگی سے کرتی ہیں۔ صوفیہ انجم جن شخصیات سے متاثر تھیں ان میں گوری نانی کا ذکر خاص طور پر کیا ہے ان کی محبت، ان کی سادگی، اور ان کی بدنصیبی کا ذکر بھی اس طرح کیا ہے کہ پڑھنے والے کو گوری نانی سے عقیدت اور ہمدردی ہو جاتی ہے۔ وہ اس زمانے کا ذکر کرتی ہیں جب محبت اور خلوص کی حکمرانی تھی، غیر بھی اپنا نظر آتا تھا۔ پڑوسی ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کو یاد کر کے انجم تاج کہتی ہیں کہ:

"جس زمانے کی میں بات کر رہی ہوں اس زمانے میں رنگ نسل زبان مذہب دیکھے بغیر لوگ محبت کرتے تھے، مگر آج تو پڑوسی پڑوسی کو نہیں پہچانتا بالخصوص شہروں کا عجیب حال ہے مجھے اس وقت خود اپنا ہی شعر یاد آ رہا ہے:

شاہین کیسی چل گئی تفریق کی ہوا ☆ انسان آج کتنے قبیلوں میں بٹ گئے"

آج ساری دنیا زر کے پیچھے بھاگ رہی ہے خود غرضی کی وبا عام ہو گئی ہے کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ مگر انجم جس زمانے کا ذکر کر رہی ہیں وہ زمانہ پیار اور محبت کا زمانہ تھا۔ لوگ (غریب اور امیر دونوں) شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ چنانچہ وہ اس زمانے کا تقابل اس زمانے سے کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"آج کل کی یہ جگمگاتی اور دولت سے لدی پھندی دنیا اپنا سر فخر سے اٹھا کر کھڑی ہے لیکن اس کی چمک دمک میں نہ کوئی کشش ہے نہ آسودگی، نہ لذت نہ سرور۔ اس کی تیز روی میں دوڑتا، ہانپتا اور تھکاوٹ سے چور انسان کہتا تو ہے کہ وہ خوش ہے لیکن وہ خوش کہاں ہے۔"

مگر ایسے نا آسودہ اور گھٹن کے ماحول میں بھی وہ لوگوں کو خوش رہنے کی تلقین کرتی ہیں۔ انجم ہر حال میں خوش رہنا جانتی ہیں اور وہ زندگی میں رجائیت کی قائل ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

"جتنی بھی مصیبت پڑے تلخیوں کو اپنے اندر بسانا نہیں چاہئے، ہر حالت میں اسے خوشگوار ہی رہنا چاہئے۔ انجام تو سب کو پتہ ہے۔ کیوں نہ زندگی کو زندگی کی طرح جئیں۔ گھٹ گھٹ کر جینے میں کیا مزا۔"

ان جملوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فلسفۂ نشاط کی قائل ہیں۔ فلسفہ بھی ان کے زیر مطالعہ رہا ہے اسی لئے تو کہیں کہیں فلسفیانہ باتیں کرتی ہیں یا فلسفیوں کا قول دہراتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

"روم کا شہنشاہ Mar cus Auriclius جو ایک فلسفی تھا اس کی سادہ سی کہی ہوئی بات:

"دنیا میں جتنی چیز خوبصورت ہے وہ اپنی ذات سے۔ اسے کسی

دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ تعریف کسی کی زندگی کا جزو نہیں ہے کوئی چیز تعریف سے اچھی ہوتی ہے نہ خراب۔"

حالانکہ یہ لوگ شہر سے گاؤں جانا پسند نہیں کرتے مگر وہ اپنے گاؤں شیخ پورہ جب بھی جاتیں بہت خوش ہوتیں۔ بیل گاڑی کی سواری پر وہ گاؤں جاتیں۔ بیل گاڑی بہت سست رفتار گاڑی ہے مگر گاؤں جانے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کی اتنی خوشی ہوتی کہ وہ ہر کلفت خوشی سے برداشت کرتیں۔

"اپنے گاؤں شیخ پورہ کی پیچ دار گلیوں میں داخل ہوتے ہی ہم لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا تھا۔ دل تو اندر سے یہی چاہتا تھا کہ بیل گاڑی سے چھلانگ لگا کر کود جائیں اور سڑک پر ابا اور بھیا لوگوں کے ساتھ چلنے لگیں گویا کہ بقول ان کی اس وقت یگانہ کے اس شعر کے مطابق حالت ہوتی:

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا ٭٭ نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا"

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۸۶ء میں صوفیہ انجم گاؤں جاتی ہیں تو انہیں بہت کچھ بدلا بدلا نظر آتا ہے۔ ان کے گاؤں کا نقشہ بھی بدل گیا تھا اور بقول ان کے در و دیوار سے وابستہ ساری کہانیاں، ساری یادیں، ساری حکایتیں کیے بعد دیگرے آنکھوں میں رقص کرنے لگتیں، تاہم وہ یہ کہتی ہیں کہ:

"ان ہی یادوں پر تو میری شاعری کا انحصار ہے۔ ان ہی دھاگوں کو پرو کر تو میں اپنے ماضی کی چادر بنتی رہتی ہوں۔"

اکثر جگہ جب وہ گزرے ہوئے واقعات و حالات کا ذکر کرتی ہیں تو ان کا انداز شاعرانہ ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ماضی کے واقعات کو افسانے کا رنگ دے دیا ہے۔ ماضی کی یادوں کی طرح ان کی نثر بھی رنگین اور حسین ہو جاتی ہے۔

صوفیہ انجم تاج کی نثر بہت شگفتہ اور سادہ ہے۔ وہ خوبصورت نثر لکھتی ہیں اور اکثر جگہ اشعار کے حوالے سے اپنی نثر میں دلکشی اور معنویت بھی پیدا کرتی ہے، مگر اس کتاب میں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بہت سے اشعار غلط درج ہو گئے ہیں، یا تو کمپوزنگ کی غلطی ہے یا حافظے کا قصور۔ میں چند اشعار کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو غلط چھپے ہیں تا کہ آئندہ اشاعت میں ان کو درست کر لیا جائے۔ ہمارے بچپن کے زمانے میں تکیہ پر خوبصورت اشعار لکھے ہوتے تھے یعنی کشیدہ کاری کے ذریعہ وہ اشعار تکیے پر ہوتا تھا۔ ایک مشہور شعر وہ یہ ہے کہ:

یا الٰہی نرم تکیہ باعث صحت رہے ٭٭ سونے والا سو رہا ہے جاگتی قسمت رہے

مگر پہلا مصرعہ غلط درج ہوا ہے (نرم یہ تکیہ سرہانے باعث عشرت رہے) اس کے بعد علامہ اقبال کا مشہور شعر اس طرح درج ہوا:

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو ٭٭ مسافر یہ خلش دل سے بآسانی نہیں جاتی

جب کہ اس کا دوسرا مصرعہ اس طرح ہے "کھٹک سی ہے جو سینے میں غم منزل نہ بن جائے۔"

اکبر الہ آبادی کا مشہور شعر اس طرح رقم ہوا ہے:

ترقی کی راہیں زیر آسماں نکلیں ☆ میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

اکبر ہی کا ایک شعر جو اس سے پہلے رقم ہوا وہ بھی غلط ہے:

خود تو گٹ پٹ کے لئے جاں دیئے دیتے ہیں ☆ مجھ سے کہتے ہیں کہ پڑھ لیجیو قرآن مجید

اسی طرح مرزا غالب کا یہ مشہور شعر بھی اس طرح رقم ہوا ہے جو غلط ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لعیں ☆ تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

ان کی اس کتاب میں بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کو لوگ اب استعمال نہیں کرتے بلکہ نئی نسل تو ان الفاظ سے بالکل نا آشنا ہے۔ بعض اشیا جو اس زمانے میں استعمال ہوتی تھیں ان کا ذکر بھی اس کتاب میں ملتا ہے، مثلاً: چپیا، چوکی، تلخہ، ڈھکیی، بکھیرا، اکھورا، اسارا، ڈھیری، (چراغ) ڈھیلا، گھڑا، بدھنا، پرکی (پاک کی پیک) دوہر (دوہری چادر) بجنی (ٹن کا بکس) اس کے علاوہ کچھ ایسے الفاظ بھی لکھے ہیں جو آج کل کے لوگ نہیں جانتے یا ان کا استعمال نہیں ہوتا۔ یا اب متروک ہو چکے ہیں مگر ان لفظوں کو صوفیہ انجم نے اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ مثلاً: چاؤ ملو (بیٹھنے کا ایک انداز) منہ جھونسا، کھلی (پان کی کھلی) پیٹھا، بالو (ریت) بلی (چھت کی شہتیر) ٹھوری (زبردستی) تلنگی (پتنگ)۔

انہوں نے جہاں اپنے بچپن کے زمانے کے ہندو مسلمان کے اتحاد کا ذکر کیا ہے وہ بھی بڑا دلچسپ حصہ ہے۔ مسلمان بھی ہولی دیوالی میں ہندوؤں کے ساتھ حصہ لیتے:

''بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی جائیدادیں غیر منقسم تھیں کلیم عاجز کے نانا سید مظاہر حسین اور باسدیو کی کاشتکاری ایک ساتھ تھی نام الگ الگ تھے مگر ایک ساتھ دل کی آبپاشی ان کی بختی تھی اور دہا ہی ایک ساتھ ہوتی تھی۔''

اس ہندو میل ملاپ اور بھائی چارے کو بھی وہ تاریخ سے ملا دیتی ہیں، صوفیہ انجم لکھتی ہیں کہ: ''شہنشاہ اکبر کے بیٹے سلیم کو ایک ہندو پڑوس کی لڑکی نے راکھی باندھ دی تو وہ سلیم کی منہ بولی بہن بن گئی۔ جلد ہی سلیم کی تاج پوشی ہو گئی اور وہ جہانگیر بن گیا تو ہندو لڑکی گلابی پیشواز پہن کر ڈولی میں بیٹھ کر ڈھٹائی سے جہانگیر کے محل میں کود پڑی اور کمرے کمرے دوڑ دوڑ کر ناچتی پھرتی اور گاتی پھرتی کہ:

کیوں نہ پہنوں گلابی چندریا آج رے ☆ میرے بھیا نے پہنا ہے تاج رے

جہانگیر کو معلوم ہوا تو سارے محل میں ہنستا ہوا اس لڑکی کو پکڑنے کے لئے دوڑتا پھرتا تھا مگر وہ پکڑ نہیں رہی تھی بہت دوڑ دھوپ کے بعد پکڑائی تو جہانگیر نے پوچھا: ''تو نے یہ گلابی چندریا خود کیوں بنائی، یہ تو میں بناؤں گا۔''

غرضیکہ اس طرح کے اور دیگر واقعات کو انہوں نے اپنی اس کتاب میں شامل کر کے اس کتاب کی دلچسپی اور اس کی رنگینی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو پھر اسے ختم کر کے ہی دم لیا۔ امید ہے کہ دوسرے پڑھنے والے بھی اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ مجھے تو یہ کتاب پڑھ کر اپنا شیخ پورہ یاد آ گیا جو پہلے مونگیر ضلع میں تھا اور اب یہ خود ضلع ہے۔ اس شہر کی بھی خصوصیات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔

رؤف خیر، گولکنڈہ، حیدرآباد 500008

عطیہ ''تاثرات''

اردو اور لکھنؤ کی گود میں پلی عطیہ خان ایک زمانے سے لندن میں مقیم ہیں۔ ''تاثرات'' میں ماضی وحال کی بعض متاثر کن شخصیات پر محترمہ عطیہ خان نے بڑے موثر اور دل نشیں پیرایہ اسلوب میں اپنے تاثرات واحساسات کو قلم کے حوالے کیا ہے، عالمی گاؤں پر مشینوں کی حکومت کے اس دور میں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ہر معاملہ کمپیوٹرائزڈ COMPUTERISED ہو کر رہ گیا ہے۔

عطیہ خان صاحبہ کی نہ صرف عالمی سیاست پر نظر ہے بلکہ ادب اردو سے کما حقہ انہیں مس بھی ہے۔ ان کے لکھنوی ہونے کا اظہار بھی ان کی تحریر سے بولتا ہے.......... ان کی کتاب ان کے ناقص العقل ہونے کی نفی کرتی ہوئی سی لگتی ہے۔ بیشتر مضامین انہوں نے مردانہ وار لکھے ہیں.......... انہوں نے جو کچھ محسوس کیا ہے اسے بڑے سلیقے سے زبان دی ہے۔ میرا خیال ہے ہر عورت ناقص العقل نہیں ہوتی جس طرح ہر مرد عقل مند نہیں ہوتا۔ یہ عطیہ خداوندی ہے جسے مل گیا...... مل گیا یعنی تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

عالمی گاؤں کے سلسلے میں عطیہ صاحبہ لکھتی ہیں:

> ''جس طرح گاؤں میں کھیتوں اور زمینوں کے لیے لڑائیاں چلتی رہتی ہیں مقدمے چلتے ہیں اسی طرح عالمی گاؤں میں بھی زمینوں پر قبضے کے لئے لڑائیاں چلتی رہتی ہیں...... کہیں انہیں جہاد کہا جاتا ہے اور کہیں آزادی کی لڑائی۔ ان لڑنے والوں کو خوش کرنے کے لیے عالمی گاؤں کا مکھیا اور اس کے ساتھی زمینوں کے ٹکڑے کر کے انہیں دے دیتے ہیں لیکن لڑائیاں اس کے بعد بھی ختم نہیں ہوتیں مثلاً شمالی آئرلینڈ، سائپرس، فلسطین اور ہندوستان کے تو تین ٹکڑے ہو چکے ہیں اور چوتھے میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے ملک آپس میں لڑ بھڑ کر کمزور ہوتے رہیں تو فائدہ دوسروں کو ہوتا ہے''......
>
> اب جو عالمی گاؤں کا مکھیا ہے اس نے دوسرے مکھیا کو ہرانے کے لئے اپنے گھر میں بیٹھ کر ریموٹ کنٹرول سے لڑائی لڑی تھی۔ اس کے لئے اس نے مجاہدین تیار کئے تھے جن کے ذریعہ اس نے اپنے فریق کو ہرایا تھا اور جب مکھیا کا مقصد پورا ہو گیا تو انہیں مجاہدین کو اس نے دہشت گرد قرار دے دیا اور اب وہ عالمی گاؤں کو دہشت گردوں سے پاک کرانے کے نیک کام میں مصروف ہے۔''

مندرجہ بالا ٹھوس اقتباس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عطیہ خان کس ٹھسے کی خاتون ہیں۔ ڈکٹیٹر صدام حسین کو اس سے بڑے ڈکٹیٹر کی ایماء پر پھانسی دے دی گئی...... عالمی گاؤں کے مکھیا کی علامت کس قدر معنی خیز ہے۔ ''عالمی دہشت گردی'' کی حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

ان دنوں دنیا کے کاروبار انسانی ہاتھوں کے بجائے مشینی آنکھیں انجام دیتی ہیں۔ یہ بے روح مشینیں نہ رنگ ونسل میں امتیاز کرتی ہیں اور نہ رشوت طلب کر کے کام کو مقدم وموخر کرتی ہیں ایک IVRS (یعنی

(INTERACTIVE VOICE RESPONSE SYSTEM کیتحت ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ لیکن رشتوں کی پامالی بھی کڑوی حقیقت ہے جو انہی مشینوں کی برکت سے انسانی زندگی میں در آئی ہے۔ عطیہ خان صاحبہ نے ''مشینوں کی حکومت'' میں اس پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ ''نقطہ'' اور ''نکتہ'' پر بڑا نکتہ آفریں مضمون لکھ کر انہوں نے نکتہ دانی کا ثبوت دیا ہے جہاں تک شخصیات کا معاملہ ہے انہوں نے اپنے ممدوح کو ناراض کرنے کا کوئی پہلو اختیار نہیں کیا ہے۔ اپنے پھوپی زاد جناب عبدالقوی ضیا کی تاریخ دانی پر روشنی ڈالی ہے بیشتر پڑھنے والے ضیا صاحب کو ایک ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ عطیہ صاحبہ کی تحریر سے پتہ چلا کہ تاریخ پر بھی موصوف سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ کنول نین پرواز کے فکر وفن پر تعارفی خاکہ ان کی بلند پروازی کا غماز ہے۔ انجمن ترقی اردو برطانیہ کے بانی سید معین الدین شاہ صاحب کی بارعب شخصیت کی اپنائیت کی روداد بھی بیان کی۔ ذکی عباس اعلیٰ اللہ مقامہ کے ''منشور'' پر عطیہ صاحبہ کے دستخط بھی ہیں۔ مولانا ارشد تھانوی کی صاحب زادی بانو ارشد کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں پوشیدہ حسن کا اظہار بھی عطیہ خان صاحبہ نے بڑے افسانوی انداز میں کیا ہے۔ جناب ف س اعجاز کے ادبی ''موقف'' کی صراحت بھی حسب ''انشاء'' کی ہے۔ عطیہ خان صاحبہ سرسری انداز میں ٹالنے والے لہجے میں کتاب پڑھے بغیر نہیں لکھتیں بلکہ جس کتاب پر وہ لکھنے بیٹھتی ہیں پہلے اسے حرف حرف پڑھ لیتی ہیں اسی لئے ان کی تحریر غیر متعلق نہیں لگتی۔ مدیر ''گلبن'' جناب سید ظفر ہاشمی ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں مگر انہوں نے اپنی افسانہ نگاری کو منوانے کے لئے اپنے مدیرانہ موقف کو کبھی استعمال نہیں کیا، ظفر ہاشمی بھی بنیادی طور پر لکھنو کے متوطن ہیں گجرات کے ''فساد آباد'' سے اپنی اور اپنے ''گلبن'' کی جان بچالائے۔ ان پر میرا شعر صادق آتا ہے کہ:

قلم میں خون ہے لیکن، قلم پہ خون نہیں ☆ کہ لکھنے والے بڑے ہی ہنر سے لکھتے ہیں

ان کے افسانے پڑھ کر اگر کوئی آنکھ نہیں بھیگتی ہے یا کسی پہلو سے ہوک نہیں اٹھتی ہے تو یقیناً وہ انسان نہیں روبوٹ ہی ہوگا۔ ان کے افسانوں میں گاؤں کی سادگی اور شہروں کی عیاری وہ نہیں جو منشی پریم چند کی تخلیقات میں پائی جاتی ہے بلکہ یہ گاؤں اور یہ شہر آج کے دور کے ہیں جہاں انسان ایک دوسرے کا راستہ کاٹ کر آگے بڑھنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ظفر ہاشمی کا افسانہ ''سچ کیا ہے'' رشتوں کے کھوکھلے پن پر ایک ضرب کاری ہے۔ جس میں ایک بھائی کی موروثی جائیداد میں بہن کے شرعی حصے کے نام پر، بہن کا شوہر اصرار کرتا ہے مگر شرعی حصہ ادا کرنے کے باجود بھائی اپنی بہن کے ساتھ اپنے رشتے میں دراڑ آنے نہیں دیتا۔ ان کے دیگر افسانے بھی شاہ کار کا درجہ رکھتے ہیں۔ عطیہ خان صاحبہ نے ان کی کتاب ''جب ایسا ہو'' کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح صفیہ صدیقی صاحبہ کے افسانوں کے مجموعے ''چھوٹی سی بات'' پر بھی عطیہ صاحبہ نے کھل کر لکھا ہے۔ اردو ادب میں یوں تو کئی ساحر گزرے ہیں بلکہ ہر کس وناکس کو ساحری کا دعویٰ ہے۔ ان ساحرانِ ادب کے درمیان کم سے کم دو ساحر ایسے ضرور ہیں جن کا جادو عصائے موسوی نگل نہیں پاتا۔ ایک ساحر لدھیانوی اور دوسرے ساحر شیوی۔ عطیہ صاحبہ نے دونوں ساحرانِ وقت کی جادوئی تخلیقات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ گیارہ گیارہ ماؤں کے بیٹے ساحر لدھیانوی کمیونزم کے نورِ نظر بھی تھے۔ ان کے فکر وفن کو عطیہ صاحبہ نے بڑا پر خلوص خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مجاز کے فکر وفن پر بھی خوب لکھا ہے۔

ساحر شیوی کی ''پرواز'' الگ نوعیت کی ہے۔ کوکن سے کینیا اور کراچی سے برطانیہ تک ہر موڑ پر اس ساحر نے اپنے ساحرانہ نقوش چھوڑے ہیں۔ کیا غزل، کیا نظم، کیا ماہیے کیا ہائیکو اور کیا افسانہ اور کیا دوہے ہر صنفِ سخن میں ساحر شیوی نے اپنے ہنر کا جادو جگایا ہے۔ عطیہ صاحبہ نے ان کی تخلیقات میں سے دو اصناف ''افسانہ'' اور

"...ے کے حوالے سے سماجی تر شیوں کا جائزہ لیا ہے۔
پاکستان کے بارے میں انور شیخ نے لکھا تھا:
"...یہاں کے سماجی مسائل اس قدر تلخ ہیں کہ زندگی ایک سزا بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی ...، ہیں سیاست دانوں کی خود غرضی، پیروں کے استحصالی ہتھکنڈے، ملاؤں کی دین ...، ...پیروں کے سر کردہ لوگوں کی غنڈہ گردی، دن دہاڑے قتل و غارت، عورتوں کی آبرو ...، بچوں کا اغوا اور بے کاری، بھوک، افلاس، امراض، منشیات کا کاروبار، اشیائے خوردنی ... ملاوٹ، دھوکا دہی اور وعدہ خلافی کو کمال اخلاق سمجھنا، مجبور کی شادیاں اور جہیز کے ...، انصاف کا فقدان، رشوت، اقربا پروری وغیرہ۔"
... حال صرف پاکستان ہی کی نہیں۔ بیشتر علاقوں کا یہی حال ہے۔
عطیہ خان صاحبہ نے انور شیخ کی کتاب "سوز و ساز" کے حوالے سے ان کے بے باک انداز فکر کی ... ہے۔ انور شیخ کی ہم خیالی کی جسارت بجائے خود بے باکی کی مظہر ہے۔ اس میں شک نہیں مذہب کے ... جو خامیاں ہو رہی ہیں ان کا سد باب ضروری ہے۔ سوہن راہی، گلشن کھنہ، رویا سائر آنند، ستیہ پال ... ادیب و شاعر ہیں جو اجنبی ماحول میں بھی اردو کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ ان کی جس قدر ... سوہن راہی کے "کاغذ کا آئینہ" عطیہ خان صاحبہ کے لئے ایک تصویر سے زیادہ ثابت نہیں ہوا۔ البتہ ... "نئے آہنگ" سے مست ہوئیں۔ جناب خالد یوسف زبان و بیان پر بڑی دسترس رکھتے ہیں جتنے ... شعری مجموعوں کے خالق ہیں لیکن عطیہ خان صاحبہ شعر کے بجائے نثر کی رسیا ہیں اس لئے انہوں نے خالد ... کے مجموعہ "ارژنگ" کو اظہار رائے کے لئے چنا جو افسانوی حسن بھی رکھتا ہے..... اس میں شامل کہانیاں اور ... ہوئی سوانح پر مشتمل ہیں۔ ثروت اقبال طنز و مزاح کا ایک معتبر نام بنتا جا رہا ہے۔ "اک عرض تمنا اک طرز ..." کے عنوان سے عطیہ صاحبہ نے ان کا جائزہ لیا ہے۔ محترمہ سلیم عالم نے دنیا بھر کی سیر کے تاثرات "قصہ ایک شہر ... کا" کے عنوان سے بیان کروائے جس پر قابل رشک انداز میں عطیہ خان صاحبہ نے روشنی ڈالی ہے۔
انور نسرین کی کہانیوں کے مجموعے "محبت کی اذیت" کا جائزہ بھی "تاثرات" میں شامل ہے۔ ڈاکٹر خلیل ... نے اپنے جذبات و احساسات کو زبان دینے کے لئے کسی صنف کا راست احسان لینا گوارا نہ کیا "ایک قطرہ آنسو" کسی خاص صنف کا نمائندہ نہیں بلکہ غبار خاطر کا عکاس ہے۔ عطیہ خان نے اس کی پذیرائی کی ہے۔ امجد مرزا کے انشائیے ... دانش کے "اسلاف و اخلاف میر انیس" پر بھی عطیہ صاحبہ نے لکھا ہے۔ حیدرآباد دکن کے غلام عمر خان نے "قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلام کی بازیافت" کی تخلیق حالاں کہ مذہبیات سے ان کا تعلق اتنا ہی رہا ہے جتنا انور شیخ کا رہا ہے۔ غلام عمر خان پر سخت تنقیدیں کی جا رہی ہیں۔ عطیہ خان صاحبہ نے آزادی رائے کے تحت ان کی پذیرائی کی ہے۔ اس کتاب کا اہم مضمون "مسئلہ زن" ہے جس میں محترمہ نے مرد حاوی معاشرے میں عورت کی انفرادیت کی دہائی دی ہے۔ اسلام نے تو عورت کی ساکھ بحال کی ہے یہ الگ بات ہے کہ معاشرے میں یہ ساکھ افراط و تفریط کا شکار ہو رہی ہے۔ المختصر عطیہ خان کے "تاثرات" ایک سوچنے والے ذہن کے عکاس ہونے کی وجہ سے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں مگر ہندوستان میں یکساں سول کوڈ کی حامی عطیہ سے اختلاف کرنے کا مرد مومن کو حق حاصل ہے کہ اس اعتبار سے عطیہ بہر حال "عورت" ہی نکلیں۔

پروفیسر ایم اے ضیاء، شعبہ اردو، گیا کالج گیا

سہ رنگ امیجز کی شاعرہ: پروین شیر

پروین شیر کا دیدہ زیب حسین اور دلکش مجموعہ کلام "کرچیاں" دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اردو
ادیب و شاعر جو سات سمندر پار رہتے ہیں ان کا وژن کافی نکھرا اور ستھرا ہے۔ شعری بساط پر لفظوں کے مہرے [illegible]
اور اس سے کوئی تاثر پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ الفاظ اپنے اندر ساختی اور ہیئتی معنی تو رکھتے ہیں لیکن ان کے
برتنے کا فن ایک تخلیقی فن کار کو ہی آتا ہے۔ جس طرح قدرت آسمان کے پھیلے ہوئے وسیع و عریض سینے پر ستاروں اور
سیاروں کو بکھیر دیتی ہے اور پھر دیکھنے والا ہر دیدہ ور دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح شاعر کے جمالیاتی حسیت کی
بدولت شعری تخلیقات میں الفاظ اسی طرح بکھرتے ہیں اور جو حسن پیدا کرتے ہیں تو اس کی معنویت سے بے خبر انسان
میں گم ہو جاتا ہے۔

پروین شیر نے کینیڈا کی سرزمین پر رہ کر ہی اپنا تعلیمی سفر طے کیا لیکن اردو ان کی رگ و پے میں بسی
رہی........ حضرت امیر خسروؒ کی بات یاد آجاتی ہے۔ ہندوستان میں موسیقی کے بیشتر آلات کو بنانے کا سہرا
ان کے سر جاتا ہے۔ اور موسیقی کو اس کی نہج پر ڈھالنے کا کارنامہ بھی انہوں نے انجام دیا۔ موسیقی کے گراں قدر تخلیقی
کام بھی انہوں نے کیا۔ شاعری بھی کی، فارسی شاعری بھی کی۔ پہیلیاں بھی لکھیں۔ دربار کے آداب کے مطابق اپنا
مقام بھی متعین کیا۔ بادشاہوں کی قربت بھی نصیب ہوئی۔ روحانی مجاہدہ اور پیر و مرشد کی خدمت کا جذبہ بھی دکھایا۔
حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی نے حضرت امیر خسروؒ کو اتنا قریب کر لیا اور یہاں تک ارشاد فرمایا کہ اگر شریعت
اجازت دیتی تو میں ایک ہی قبر یعنی سونے کی آخری آرام گاہ میں امیر خسروؒ کو ساتھ رکھتا۔ آج بھی اس قربت کا اندازہ
اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ بھی ان کے قریب ہی لیٹے ہوئے ہیں بلکہ ان کے دوسرے شاگرد
چراغ دہلوی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا تو حضرت امیر خسروؒ جس میدان میں بھی کام کرتے تھے وہ کام ان کی عبادت
ہوتی تھی۔

پروین شیر کا مجموعہ کلام "کرچیاں" دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ایک تخلیقی فنکار ہیں۔
انہوں نے موسیقی، پینٹنگ اور شاعری تینوں میں ایک منفرد انداز کو اپنایا ہے۔ اور یہ تخلیقی اور تخیلی عمل ان کے درجہ کو
شاعر سے بلند کر دیتی ہے کیوں کہ شاعری کی غنائیت میں نکھار موسیقی سے پیدا ہوتا ہے اور لکیروں کے ابھرنے سے جو
نقوش بنتے ہیں وہ الفاظ سے کبھی کبھی زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ گرچہ ان کی پینٹنگ میں ہندوستانی آرٹ کو تو
نہیں اپنایا گیا ہے۔ لکیروں کے ذریعہ کوئی بات بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ برش کے ذریعہ نقوش کو تصویروں کو اور پیکروں کو
ابھارا گیا ہے۔ یہ یوروپی آرٹ کا Concept ہے۔ ہندوستانی آرٹ اور مغل آرٹ میں لکیروں کی اہمیت ہوتی ہے
لیکن سات سمندر پار کے آرٹ میں برش کے لوچ و لچک سے تصویریں ابھاری جاتی ہیں جہاں تک Colour

Combination کا سوال ہے اس میں مغل آرٹ کے Combination ملتے ہیں لیکن مغل آرٹ کی پیروی نہیں ملتی۔ انہوں نے Portrait میں بھی جو Expression ابھارے ہیں وہ برف کے بلفوں سے بنانے کی کوشش کی ہے۔ مکمل تجریدی آرٹ بھی نہیں ہے۔

پروین شیر کا جمالیاتی حسن بیشک قابل داد و تحسین ہے۔ ان کی غزلیں ان کی شاعری کچھ اس طرح ہیں:

وہ بادل تھا ہوا کا ہم سفر تھا   میں تشنہ کام فصلِ رائیگاں ہوں

دوسری غزل کا یہ تصور آنکھوں اور خواب سے متعلق ہے کہتی ہیں:

آنکھوں سے خواب چھین لیے روزگار نے   آ پہنچے کتنی دور تمہاری گلی سے ہم

پروین سوچتے ہیں یہ ساحل کو دیکھ کر   گرداب سے نباہ کریں گے خوشی سے ہم

سچائیوں کو بیان کرنے میں کسی قسم کا Compromise نہیں کرتی ہیں اور کاروباری زندگی کی الجھنوں سے پریشان تو ہوتی ہیں لیکن اسے نیا رخ دینے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ کوائف میں لکھتی ہیں:

''انہوں نے یونیسیف کے تحت بین الاقوامی طور پر ضرورت مند بچوں کی مدد کے لئے سی ڈی تیار کی جس سے مالی وسائل میں آسانی ہوئی اور اس کے ساتھ اس کے لئے موسیقی بھی ترتیب دی۔ ستار جو کہ موسیقی کا ایک قدیم ترین اور مشکل ساز ہے مگر پروین شیر کو اس پر دسترس حاصل ہے۔'' (ص:۱۱)

پروین شیر نے اپنے بارے میں زیر عنوان ''اور پھر کرچیاں نے جنم لیا'' لکھتی ہیں:

''یہ دنیا ایک تجربہ گاہ ہے۔ جس میں ہم ہر گھڑی نت نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی حالات کے تیزاب سے احساسات کے جسم مجروح ہو جاتے ہیں۔ شیشے کا پیانہ دل سنگِ حقیقت سے ٹکراتا ہے تو اس کی کرچیاں دور دور تک بکھر جاتی ہیں۔ انہیں سمیٹنے میں مجھے میرے تین ہم سفروں نے ہمیشہ سہارا دیا۔ میرا قلم، موئے قلم اور ستار۔ یہ میرے تین ساتھی میرے ذہن کو منجمد ہونے اور سوچوں کو منتشر ہونے سے بچاتے رہے۔ جب بھی احساس کے آنچل کو دل کی انگلیوں نے تھام لیا اور خوابوں کے گلاب شاخ مژگاں پر کھل اٹھے تو سچائی نظموں اور غزلوں کی شکل میں سامنے آ گئی۔'' (ص:۲۱،۲۲)

ان کی نظمیں ان کے بیان کی سچائی اور ان کے حالات و کوائف کی ترجمانی کرتی ہیں نظمیں مختصر ہیں طوالت سے گریز کرتی ہیں۔ ماں کی نظم سے نظموں کے باب کی ابتدا کرتی ہیں پھر ''تجربہ گاہ'' میں یوں محسوس کرتی ہیں:

جو لوگ اپنا چہرہ لے کے آئے ہیں
وہ چہرہ کھو کے جائیں گے!

ان کی نظم 'خود فریبی' کے آخری دو مصرعے دیکھئے:

اپنی پیاس کو دھوکہ دے کر
جینے کی کوشش کرتا ہے!

مثل بمصداق ''بہار اب کے برس'' ''بے بسی آخری اسٹیشن'' ''تابوت'' ''سبھی رستے معطل ہیں''

''اندھیر، بیچارگی'' یہ بڑی ہی مختصر سی نظم ہیں۔ نظم ''بیچارگی'' تحریر کر رہا ہوں۔ اختصار میں بھی بات کرنے کا سلیقہ دیکھئے:

منزلوں کی جستجو میں آبلہ پا
چل رہا تھا کب سے وہ دشتِ بلا میں
آنسوؤں کی ٹھنڈی چادر میں سمٹ
سلگتی ریت پر بے سدھ پڑا ہے!

''تنہا ہاتھ'' ''شہر خوشاں'' ''چبھن'' ''سب سے بڑا دکھ'' ''رت بدلی ہے'' ''پچھتاوا'' ''کٹھن سوال'' ''عراق'' ''تشنہ لب آنچل'' ''قطرہ اور سمندر'' اور ''سروائیول'' جس کا ایک مصرعہ ہے:

یہ سب کے سب ادھورے ہیں

''قد آوری کا دکھ'' ''تذبذب'' ''اپنا قاتل'' ''ریزے'' ''رائگاں'' ''کاش'' ''شکست'' ''نیلا چاند'' ''میری بیٹی صبا اشرف تمہارے لئے'' ''واپسی'' ''مسیحا'' ''یہ گھر پھر سے مکاں ہے اب'' ''تلاش گمشدہ'' ''میرے بیٹے شیراز...... تمہارے لئے'' ''آئس کریم والا'' ''غم گسار'' ''اشرف المخلوقات'' ''اپنے بچوں کے نام'' ''الضعفاء'' ''تیسری آنکھ'' ''سماع اور صدا کے درمیان'' ''حل'' ''قتل'' ''پاسنگ'' ''آگاہی'' ''سراب'' ''ریٹائرمنٹ'' ''ہیلتھ اسپا'' ''انکشاف اور کب تک آخر؟'' وغیرہ نظمیں کافی متاثر کن ہیں۔

تجربے اور احساسات کی دنیا میں ان کے پاس ایک بڑا خزانہ ہے جس کو وہ سمیٹ رہی ہیں۔ دنیا بھر پر ان کی نگاہ ہے مگر انسانیت کا دکھ انہیں بے چین کرتا رہتا ہے۔ Self Centered ہونے کا تصور جس قدر امریکی اور کینیڈیائی معاشرے نے گھر بنا رکھا ہے وہاں اس احساسات کو زندہ رکھنا اور ہر کرب سے گزرنا ان کی انسان دوستی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ وہ بلا کی ذہین ہیں اور بات کو سلیقہ سے ادا کرنے اور شاعرانہ حسن پیدا کرنے کا ہنر جانتی ہیں:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے   پر نہیں قوت پرواز مگر رکھتی ہے

یہی ساری خوبیاں پروین شیر کو ایک عظیم شاعرہ بنانے میں مدد کرتی ہیں۔

اخیر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ جس کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں یہ چلن اب عام دیکھنے کو ملتا ہے کہ اردو مجموعے اردو رسم الخط کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم الخط کے بین بین چلتے ہیں گرچہ اس میں ترجمے کا کوئی عمل نہیں ہوتا لیکن پروین شیر نے اردو دنیا کی شاعرانہ قوت کا پیغام انگریزی میں اپنی نظموں کو ترجمہ کرا کر پہنچانے کی کوشش کی ہے جو بہر حال ایک گرانقدر کام ہے۔ اس طور انگریزی ادب پر بھی اردو شاعری کے حوالے سے باتیں پہنچیں گی اور اثر انداز بھی ہوں گی اور اردو زبان سے انگریزی ادب کی جو بے اعتنائی رہی ہے وہ شاید دور ہو سکے گی۔ پروین شیر کا یہ کارنامہ ہر لحاظ سے ستائش کے قابل ہے اور ادبی حلقہ میں اس کی پذیرائی یقیناً ہوگی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

❀❀❀

ڈاکٹر حسن رضا مظفر پور

غزل کا خمار: سات سمندر پار

اردو زبان اور شعر و ادب آج محض برصغیر کے دیار و امصار میں محصور نہیں اور نہ صرف مشرق وسطی کے مشاعروں اور مجلسوں تک محدود ہے بلکہ اردو زبان اور شعر و ادب کا تو اب باقاعدہ Globalisation ہو چکا ہے۔ خلیجی ممالک ہوں کہ یورپی اور امریکی ممالک ہوں، اردو شعر و ادب بالعموم اور غزل بالخصوص ہر جگہ خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔ غزل کی سحر آگیں غنائیت، فکری رمزیت و معنویت، خیال کی وحدت اور اسلوب و اظہار کی لذت و حلاوت نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور غزل کے ایک ایک شعر نے آتش عطش کے پیمانوں کی مانند قاری و سامع کو مخمور کر دیا ہے۔

اہل اردو اور صاحب قلم کی مادی مہاجرت نے اردو اور اصناف اردو علی الخصوص غزل، نظم اور افسانہ کی رسائی سات سمندر پار تک کر دی ہے۔ لیکن ان تمام اصناف کی دریافت اور تنقید و تحقیق سے گریز کرتے ہوئے میں صرف سات سمندر پار کی نو آباد اردو بستیوں کے ان غزل نگاروں کا کلام زیر بحث رکھوں گا جو ہندوستان کے موقر رسائل کی زینت گزشتہ دو تین دہوں سے بڑھا رہے ہیں۔ ایسے غزل گویوں میں حیدر قریشی (جرمنی)، شاہین (کناڈا) حمید صدیقی (انگلینڈ)، وسیم بٹ وسیم (کینیا)، پرکاش راحت (آسٹریلیا)، ستیہ پال آنند (کناڈا) جیسے شعراء اور عابدہ جعفری (کناڈا)، کنیز فاطمہ کرن (آسٹریلیا) جیسی شاعرات کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

سات سمندر پار کے شعراء نے غزل کی اقدار و روایات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فن غزل کو نئی فنی رعنائیوں، خیال کی شگفتگی و تازگی، اظہار کی جرأت و بے ساختگی، متنوع مسائل حیات کی ترجمانی کی اہلیت اور نغمگی و غنائیت سے آراستہ کیا ہے۔ اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

کبھی نہ تنگ ہو حوصلہ اس کا مرے مالک
جو زخم دے کر اسے کشادہ بھی کر رہا ہے

............حیدر قریشی، جرمنی

زمیں کی تشنگی کو آزمائیں گے کہاں تک
یہ بادل بار سیرابی اٹھائیں گے کہاں تک

............عابدہ جعفری، کناڈا

تیری ان بہاروں کو ورنہ پوچھتا ہی کون
رنگ سب کی تیرے، تازگی تو میری ہے

............شاہین، کناڈا

تڑپ رہی ہے جبیں کب سے بندگی کے لئے
جہاں قبول ہوں سجدے، وہ آستانے دے

............ہمایوں ظفر زیدی

راگ، رنگ، رقص کی بہ نسبت غزل ایک حسی تر صنف سخن ہے۔ یہ ایک مکمل انسان کی مکمل انسان

تک رسائی کا پراثر وسیلہ ہے۔ اس کی قوتِ احساس شدید تر ہے۔ اس کا خارجی مفہوم اور داخلی احساس عقلی اور حسی دونوں سطح پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جن احساسات وکوائف کو دوسری اصناف بیان کرنے سے قاصر رہ جاتی ہیں، غزل انہیں رمز وایماء، استعارہ وکنایہ اور صنائع وبدائع کے وسیلے سے فزوں تر کرکے ایسے قوائے داخلی عطا کردیتی ہے کہ معنوی جز از خود کل میں بدل جاتا ہے۔ اظہار کی یہ اثر اندازی واثر پذیری دوسری کسی صنف کو میسر نہیں:

ان گھروں کے اندر کی بے گھری تو میری ہے　　　میں جہاں ہوں، جیسا ہوں، زندگی تو میری ہے

............شاہین، کناڈا

اس کو میرے ذکر سے نیند آجاتی ہے　　　مجھ کو اس کی یاد جگائے پھرتی ہے

............عبید صدیقی، برطانیہ

کیا خبر، کہاں جاکر ساتھ چھوڑ دے میرا　　　خاک کا بھروسا کیا، خاک بھی تو میری ہے

............شاہین، کناڈا

تم نے جو درد دیئے تھے، وہ فراموش ہوئے　　　مہرباں ساتھ گزارے تھے، وہ لمحے جاگے

............کنیز فاطمہ کرن، آسٹریلیا

میرے لئے اک شخص پریشان بہت ہے　　　دنیائے محبت میں یہ پہچان بہت ہے

............پرکاش راحت، آسٹریلیا

سات سمندر پار کی نوآبادبستیوں میں بسنے والے شعراء وشاعرات کو سب سے زیادہ پریشانی نا آشنا ملک میں نامانوس لوگوں کے ساتھ ڈھلنے میں ہوئی۔ روزی روٹی کی تلاش میں ترکِ وطن کرکے سات سمندر پار آنے والے خوش آئند مستقبل کی چاہ میں سفر کی صعوبتیں بھول گئے۔ مادیت پرستی ان پر اس قدر حاوی ہوگئی کہ وہ روح کی حاجتوں کو فراموش کر بیٹھے اور تن پرستی کے گرویدہ ہوگئے۔ ''روح کی بدمستی'' کو انہوں نے حاشیہ پر رکھ دیا۔ کیوں کہ انہیں ''تن کو گھائل'' کرکے روح کی بدمستی کا سامان فراہم کرنا منظور نہ تھا۔ جہانِ نو کے کرّوفر میں وہ ایسے مستغرق ہوئے کہ وطن واہلِ وطن کی بھی انہیں ابتداءً سدھ نہ رہی:

روح کی بدمستی کی خاطر　　　تن اپنا کیوں گھائل کرتے

............شاہین، کناڈا

بہت مصروف رکھتی ہے یہ دنیا　　　ترے رستے سے بھی کترا گئے ہم

............شاہین، کناڈا

مگر یہ راہِ فرار اور شعارِ فراموشی محض عارضی ہے۔ جسمانی آسودگی کے ساتھ ہی انہیں اپنے وطن کی ''شامِ غزل''، ''یاد کی پائل'' اور ''عکسِ پا'' مضطرب کرنے لگتے ہیں اور یادوں کی آندھیاں ذہن کے دریچوں کو لرزاں وپریشاں کرنے لگتی ہیں:

کہاں شامِ غزل وہ گل کدے کی　　　کہاں اے شہرِ فردا! آگئے ہم

............شاہین، کناڈا

یاد کی پائل ہے، تیرا عکسِ پا ہے اور پھر | التماس آئینہ ہے، آہٹیں ہونے تو دو

............وسیم بٹ وسیم، کینیا

آندھیاں سی چلتی ہیں ذہن کے دریچوں میں | آج کتنی شدت سے پھر کسی کی یاد آئی

............جمشید مسرور

ایسے میں انہیں نئے رفیقوں کی رفاقت اور نئے ہمدردوں کی ہمدردی بھی راس نہیں آتی:

نئے رفیق، نئے ہمدموں کا ذکر نہ کر | جو نام یاد رہیں، ان کو بھول جانے دے

............ہمایوں ظفر زیدی

مذکورہ نوآباد بستیوں میں نوآباد ایشائیوں کو کشاکشِ حیات سے تو نجات مل گئی، مگر مسائل زندگی یہاں بھی نو بہ نو موجود تھے۔ اقتصادی کشادگی و فراوانی کے باوجود یہاں بھی بے انصافی، احسان فراموشی، نفسیاتی ناآسودگی، مکروفریب کو جب انہوں نے دیکھا تو ان کے لبوں پر ایک پھیکی مسکان سی کھیل گئی:

جو میرے لکھے سے استفادہ بھی کررہا ہے | خلاف باتیں وہی زیادہ بھی کررہا ہے

............حیدر قریشی، جرمنی

امیر شہر سے کوئی تو پوچھے کہ آخر | ہم اپنے ضبط کی قیمت چکائیں گے کہاں تک

............عابدہ جعفری

منصفوں سے بھی اک دن پوچھنے چلیں یارو! | تم نے کس طرح کاٹی، ہم نے جو سزا پائی

............جمشید مسرور

ہندو پاک کی مشترکہ تہذیب سے ہزاروں میل دور بس جانے کے باوجود انہوں نے اپنے اجداد کی تہذیب سے رشتہ استوار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں شعری روایات و اقدار کا پورا پورا پاس نظر آتا ہے۔ تاہم انہوں نے صوری و معنوی تنوع پیدا کرنے کی بھی بھرپور کاوشیں کی ہیں۔ نئے قوافی، نئی تراکیب، نئے استعارات اور صنائع لفظی پر بھی برصغیر کے باہر آباد ہونے والے شعراء نے مثبت توجہ صرف کی ہے، مثلاً رگوں میں رات کا اترنا، پیڑوں پر خواب کا اترنا، فصل حرف ولفظ کاٹنا، سکوت لفظ میں ترنم کی ترتیب، خواہشوں کے پاؤں، وسوسوں کی بیڑیاں وغیرہ ایسی ہی نادر اور اچھوتی ترکیبیں اور استعارے ہیں جن سے اردو غزل لذت آشنا ہو رہی ہے:

یہ زندگی رموز آشنائے قلزم ہے | سراب زار میں اک وقفۂ تیمم ہے

............شاہین

رگوں میں دھیرے دھیرے رات اتری | سمٹ کر پھر بدن میں آگئے ہیں

............شاہین

ہم ستائے جن کے نیچے | ان پیڑوں پر خواب اترے

............شاہین

کوئی آئے اور آکے فصل حرف ولفظ کاٹے | ذہن خاموشیوں کے دکھ اٹھائیں گے کہاں تک

.........عابدہ جعفری

یہ منکشف ہوا شاہینؔ ایک عمر کے بعد　　سکوتِ لفظ کی ترتیب میں ترنم ہے

.........شاہینؔ

خواہشوں کے پاؤں میں ہیں دھوپوں کی بیڑیاں　　برکتیں کچھ منتظر ہیں، گردشیں ہونے تو دو

.........وسیم بٹ وسیم

مذکورہ شعراء نے نہ صرف مشرقی اقدار اور لوازماتِ فن کو ملحوظ رکھا بلکہ مشرقی فن یعنی غزل میں مغرب کی تہذیبی قدروں کو پیش کر کے مشرقی فن کو مغرب کا ترجمان بھی بنانے کی سعیِ حسنہ بھی کی ہے۔ مغربی تہذیب میں جسم کا رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہاں ذہنی ہم آہنگی ہی رشتوں کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ دل کے اسی رشتے سے شادی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور پھر دل بھرتے ہی رشتوں میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ اس لئے مغرب کے شوہر اپنی بیویوں کو اپنے تعلق بے جا کے متعلق یوں فہمائش کرتے ہیں:

اس کے میرے بیچ بدن کا رشتہ ہے　　تو کیوں اپنے دل کو دکھائے پھرتی ہے

.........عبید صدیقی

اردو غزل کے لئے یہ خوش آئند مستقبل کا اشاریہ ہے۔

رفیق شاہین، تعلیم منزل، میرس روڈ علی گڈھ-202002 (یو۔ پی)

عصری لوازمات کے جمالیاتی شاعر: نقشبند قمر نقوی

زندگی کی حرارت اور تب وتاب سے روشن بھرا بھرا کشش انگیز اور دلآویز چہرا۔ قلب مومن کی طرح وسیع نورانی پیشانی جو اقبال مندی کی مظہر ہے۔ سر کے بال ایسے سیاہ اور گھنے کہ افق ذہن پر بیساختہ ہی افریقہ کے گھنے تاریک جنگلوں کے سائے لہرانے لگیں۔ گہراتی شام جیسی بوجھل پلکیں۔ غزل کی طرح اشاروں کنایوں میں بولتی اور رازدروں کھولتی کنول جیسی خوبصورت آنکھیں۔ غزل کے مصرعوں کی طرح آپس میں مربوط لب اور بالائی لب کی بالائی گوشے میں مردانگی کا اعلان کرتی ہوئی موچھوں کی سیہ جھالر عریض ٹھوڑی جو مضبوط قوت ارادی کی مظہر ہے۔ قد میانہ جسم تندرست وتوانا اور گٹھا ہوا۔ وجود مجسم سو فیصدی ہندوستانی اور طرز لباس سو فیصدی انگلستانی۔ جی ہاں یہ قلمی خاکہ حضرت نقشبند قمر نقوی صاحب کا ہے۔ وہ باعتبار شخصیت نہ صرف کرنل جمال ناصر قذافی اور کمال اتاترک کی یادیں تازہ کرادیتے ہیں بلکہ وہ خود بھی مشرق وسطی کی کسی ریاست کے قدآور سربراہ معلوم ہوتے ہیں۔ نہ صرف خارجی وضع قطع سے بلکہ داخلی اوصاف حمیدہ کے سبب بھی وہ قابل تعظیم ایک عظیم شخصیت ہیں۔ طرحداری وضعداری ملنساری غم گساری فیاضی مہمان نوازی، انسانیت نوازی، انسان دوستی جیسے اوصاف آپ کے بلند کردار اور تہذیبی واخلاقی اقتدار کے واضح ثبوت ہیں۔ آپ نجیب الطرفین سید بھی ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے فرزند بھی۔ آپ کا حسب نسب سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مربوط ہے۔ آپ نماز شریعت بھی ادا کرتے ہیں اور نماز طریقت بھی۔ صوفیانہ مسلک سے وابستگی کے سبب مدت سے راہ سلوک کے سفیر ہیں۔ مخدوم کے منصب پر متمکن اور سلوک کے دشت بیکراں سے گذرتے ہوئے حق سے دن بہ دن نزدیک تر ہوتے جارہے ہیں۔ صاحب نظر کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں یہ دیکھ پانا کہ ان کے قلب مصفی سے پھوٹتی نور کی شعاعیں ان کے رخ روشن پر ہمہ وقت عکس ریز ہوتی رہتی ہیں۔ یہانتک کہ تصویر میں بھی ان کا چہرہ مبارک اپنے جلووں سے نگاہوں کو دعوت شوق دیتا رہتا ہے۔

قمر نقوی صاحب کا وطن مالوف مدھیہ پردیش ہندوستان ہے۔ آپ یہاں سے ہجرت کرکے اوکلاہوما ریاست ہائے متحدہ امریکہ پہنچے اور تا حال اوکلاہوما میں ہی اقامت پذیر ہیں۔ وہاں دیار غیر میں اجنبیت اور تنہائی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے سہ ماہی رنگین جریدہ "روشنی" کے اجراء کے ذریعہ آفاقی معیار کی ایک ایسی عظیم الشان انجمن قائم کررکھی ہے جس کی رونق دنیا بھر کے قلمکاروں سے قائم ہے اور ان سب کی صحبتیں اور ان کا پیار انہوں نے دنیا کے دوسرے سرے پر بھی حاصل کررکھا ہے۔ بقول ان کے:

ہجوم قریۂ نا آشنا میں رہتا ہوں
کنارے دجلہ ہوں میں کربلا میں رہتا ہوں

قمر نقوی صوفی اور صحافی ہی نہیں وہ ادب کی مختلف النوع جہات کے قلمکار اور فنکار بھی ہیں۔ ادب

میں ان کی فتوحات اور کارنامے بقدر تعداد حیرت انگیز ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، ناول نگار، ماہر شکاریات، عالم دین، محقق، نقاد اور تاریخ داں بھی ہیں۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے "نیم سوز"، "ریشہ حنا؟؟" اور "میری نیند اُن کے خواب" منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر حلقہ اہل ادب سے بھرپور خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ آپ پندرہ ناولیں اور تحقیقی نوعیت کی چار عدد کتابیں قارئین کی نذر کر چکے ہیں۔ آپ نے تین تاریخی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ دو منظور تاریخی کتابیں بھی آپ کے نام سے منسوب ہیں۔ شکاریاتی ادب پر بھی آپ نے جم کر نو کتابیں اہل ذوق تک پہنچائی ہیں۔

ان کی تخلیقات کے انبوہ کثیر کو دیکھ کر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب ادب اور شکار کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف کر رکھا ہے۔

قمر نقشبندی کو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق ماہر عروض اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی شاعری روایت اور جدت کے درمیان ایک پل کا کام انجام دیتی ہے۔ فنی رچاؤ بساؤ سے معمور ان کی شاعری فکر و شعور کو مرتعش و متحرک کرنے کے ساتھ قلب وجگر کو بھی برانگیختہ کرتی ہے۔ ان کے حسن جمالیات میں رنگے الفاظ سے مرتب اشعار میں بلندی فکر کے ساتھ احساس کی چبھن جذبے کی فراوانی اور سوز و گداز کا سحر بھی شعر کو اثر انگیز بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار اپنے دیرپا تاثر سے دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں۔ جدت کے نام پر وہ لفظوں کے جنگل میں آبادیاں تلاش کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ایسی پیچیدہ کرخت اور روکھی پھیکی شاعری جن کے معنی و مطلب منگانے کے لئے خلا میں طیارے بھیجنے پڑیں انہیں جھنجلا دیتی ہے۔ ان کی یہ جھنجلاہٹ ان کے اس شعر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے:

کاغذوں کی سطح پر الفاظ کے جنگل اُگے
اور لاحاصل سخن آرائیاں ہونے لگیں

وہ اس شاعری کے قائل ہیں جو سادہ زبان میں خیال کی ادائیگی کا فریضہ انجام دے۔ ادھر شعر زبان پر آئے اور ادھر اس کا مفہوم خود بخود عیاں ہو جائے۔ یہی بات ہمیں ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ شاعری میں وہ میر، سودا، شیفتہ اور انشا کسی کے بھی پیرو یا مقلد نہیں ہیں۔ ذیل کا شعر اس کا گواہ ہے:

نہ میں میر ہوں نہ سودا نہ شیفتہ نہ انشا
مری اپنی منزلیں ہیں مرا اپنا ایک جادو

یعنی کہ میدان شاعری میں انہوں نے اپنا راستہ خود ہی نکالا ہے۔ خود اپنی شاعری کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں ان کے اپنے ہی اشعار میں مل جاتا ہے:

ہر حسیں بات کو اشعار میں ڈھالا میں نے
میرے مضمون مرے الفاظ کی رعنائی کو دیکھ
میں لکھوں تو حرف القابہ حریم دل کشادہ
حسیں الفاظ چن کر پھول سے چہرے بناتا ہوں

ہوں قلمکار میری حاشیہ آرائی کو دیکھ
ہے سخن فہم تو افکار کی گہرائی کو دیکھ
مرے لفظ حسن معنی مرے شعر صاف سادہ
لئے ہوں سنگ ہاتھوں میں مگر شیشے بناتا ہوں

جن مضامین میں لہو کا رنگ ہی شامل نہ ہو　　وہ کبھی تفسیر حرف مدعا ہوتے نہیں

واقعات زندگی میں ذکر جاناں نہ بھی ہے
میرے قصے میں حقیقت بھی ہے افسانہ بھی ہے

قمر نقوی دنیائے بے ثبات سے توقعات وابستہ نہ کر کے ہمیشہ ہی نگاہ آخرت و عافیت پر مرتکز رکھتے ہیں۔ جلوہ حق میں ضم ہو جانے کی تمنا میں انہوں نے عشق کو اپنا قبلہ گاہ بنالیا ہے اپنے آئینہ عشق میں وہ اپنے معبود کو دیکھنے اور دریا میں فنا ہو کر عشرت قطرہ ہو جانے کے تمنائی اور آرزومند ہیں یہ بات ان کے حمد یہ قطعے کے چوتھے مصرعے سے بھی آشکار ہے:

مہر تاباں کو یہ سمجھے کہ ہے معبود مرا　　چاند نکلا تو کہا ہے یہی مسجود مرا
ڈوبنے والوں سے رشتے نہ ہوئے جب قائم　　بول اٹھا شوق کہ ہے عشق ہی معبود مرا

کلمہ طیب میں حق کے ساتھ رسول مقبول صلعم کا نام بھی جڑا ہوا ہے۔ قرآن جو صحیفہ احکام الٰہی بھی ہے محمد صلعم پر اترا اور آپ بانیٔ اسلام اور شافیٔ محشر بھی ہیں۔ ایسی عظیم اور مقدس ہستی سے بھی ان کی عقیدت و محبت ان کے نعتیہ قطعے میں اُبھر کر سامنے آئی ہے:

نور گنبدوں تو میری زیست منور ہو جائے　　ان کا ذکر آئے تو مضمون معطر ہو جائے
ان کے در پر جو جھکا دوں میں عقیدت کی جبیں　　سلطنت شہر عبادت کی مقدر ہو جائے

انہوں نے مدینہ شریف کو سلطنتِ شہر عبادت کا نام دیکر اپنی شعری قوت تخلیق کا مظاہر کیا ہے۔ وہ روضے کی جالی کو "چلمنِ عرش اعظم" سے تعبیر کرتے ہیں:

اے عرش اعظم کی چلمن بھی سمجھو
یہ صرف ان کے روضے کی جالی نہیں ہے

قمر نقوی صوفی منش ہی نہیں بلکہ حقیقتاً نماز عشق میں محو رہنے والے صوفی ہیں۔ لہٰذا متصوفانہ خیالات بھی انہوں نے نظم کئے ہیں اور وحدت الشہود اور وحدت الوجود جیسے مضامین بھی شعری پیکر میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں:

مرا گلشن حکایت بھی وحدت الوجودی　　نہ تو احتیاج ساقی نہ وجودِ جام و بادہ
غرق ہونے کو مرے آیا ہے اب موزوں مقام　　دور نظروں سے مرے کچھ بھی تو اب ساحل نہیں
تم کو اگر آنا ہو تو آساں ہے پتہ مرا　　دیوار گری ہوگی بجھتا سا دیا ہوگا
نہ میں بوذر ہوں نہ سلماں نہ غزالی لیکن　　میری خلوت میں در آ انجمن آرائی کو دیکھ
ہم ادھر ہیں موت کا دریا ہے اور تم اس طرف　　کچھ ہمارے درمیان اس کے سوا حائل نہیں

قمر نقوی اگرچہ عشق و عاشقی کے مضامین کو حرمت شاعری سے تعبیر کرتے ہیں لیکن عشقیہ معاملات اور قلبی واردات سے ہٹ کر وہ عصری مسائل اور عصر حاضر کے تقاضوں پر بھی پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ عصر حاضر میں زبردست مادی ارتقا کے ساتھ ہی جو روحانی علمی، تہذیبی اخلاقی زوال زدگی کا نقشہ سامنے آیا ہے قمر نقوی اس

سے بری طرح دل برداشتہ ہیں۔ مذہبی عصبیت فرقہ واریت رنگ و نسل کی منافرت بزرگوں کے بے قدری رشتوں کی پامالی وفاداری طرحداری اور وضعداری کا فقدان زرگری وزر پرستی فحاشی و عریانیت بے حیائی و بے ضمیری، غیر جنسی اور جنسی نوعیت کے جرائم، قتل و غارتگری، سیاست مذہب معاشرت اور ادب میں بھی طرح طرح کی بدعنوانیاں۔ عدم تحفظ اور عدم انصاف اور عدم مساوات کے مسائل قمر نقوی کے لئے سوہان روح بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب سے اٹھی سرخ آندھیاں، مغربی اجارہ داری۔ صیہونی استعماریت و عسکریت اور امت مسلمہ کی بے بسی و بے چارگی بھی انہیں خون کے آنسو رلاتی ہے۔

یہ سب دیکھ کر ان کی فکر و شعور میں شعلے بھڑ کنے لگتے ہیں اور زبوں حال معاشرہ اپنی تمام تر بدنصیبیوں کے ساتھ ان کی شاعری میں سمٹ آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رہزنی تاوان کاری قتل و خوں و خود سری
یعنی سارے کام تم ناچار کرتے ہو کرو

یہ نہ سمجھو زخم خود تم کو نہ آئے گا کبھی
بے نیام اب خنجر و تلوار کرتے ہو کرو

لہو بے گناہوں کا ارزاں تھا کل بھی
یہ امر فی الواقعہ آج بھی ہے

ارتقائے دشت میں تہذیب غائب ہوگئی
تھا جہاں دریا وہاں یہ خشکیاں ہونے لگیں

اصل صورت تو کسی کی اب نظر آتی نہیں
اب تو ہر جانب فقط پرچھائیاں ہونے لگیں

ذہن کی تہذیب میں ہے بے لباسی کا یہ دور
جو نہ کہتی تھیں وہی باتیں عیاں ہونے لگیں

نقش پائے رفتگاں پر دھول جم کر رہ گئی
دھوپ میں راہیں جھلس کر بے نشاں ہونے لگیں

پھر مجھ کو دلاتے ہیں یقیں اپنی وفا کا
وہ لوگ جو کہتے تھے سیاست نہیں ہوگی

اس فصل میں خوشیوں کا بہت قحط ہے یارو
مجھ پہ ہی جو ہنس دو تو شکایت نہیں ہوگی

نہ غیر سے ہے کوئی اور نہ آشنا سے گلے
میرا یہ دشت تو آبادیوں سے بہتر ہے

نقشبند قمر نقوی مغربی استعماریت عسکریت اور غاصبانہ جارحیت پر بھی ملول خاطر رہتے ہیں افغانستان و عراق میں غاصبوں کی موجودگی ساری دنیا کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہے اور ہر کوئی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ:

آج وہ کل ہماری باری ہے

وہ عراق کو نگاہ میں رکھتے ہوئے بڑی بے بسی سے فرماتے ہیں:

گلستاں سارا ہی سہما ہوا ہے
ابھی صرف ایک ہی پتہ گرا ہے

کمزور بے بس امت مسلمہ جو لادھی ہوئی تباہی و تاراجی کے سمندروں سے گھری ہوئی ہے۔ وہ شناوری یعنی دفاعی قوتوں سے محرومی کے سبب ظالموں کے ستم سہنے پر مجبور ہے:

جہاں اسیر ہوں میں ہر طرف سمندر ہے
شناوری نہیں ممکن کہ جسم پتھر ہے

قمر نقوی کی شاعری کی امتیازی صفت ان کی شاعری میں تغزل ہے۔ معروف شاعر اور اقبال شناس منگر جگن ناتھ آزاد نے ببانگِ دہل کہا ہے کہ میں اس شاعری کو ہرگز بھی شاعری تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جس میں تغزل نہ ہو۔ تغزل ایک مخصوص دلآویز و دل نشین کیفیت کا نام ہے جو کبھی لفظی تکرار کی موسیقی سے کبھی حسن معانی اور کبھی ندرت اسلوب سے معرض وجود میں آتی ہے۔ لفظوں کی جمالیات اور ان کے دروبست کے ترتیبی نظام میں قمر نقوی کا فنی مظاہر ان کی شاعری میں وہ سحر جگا دیتا ہے جسے تغزل کہتے ہیں۔ تغزل کی تعمیر میں حسن و عشق کے پاکیزہ خیالات بھی اہم کردار نبھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سوز و ساز اور قلبی گداز سے ہم آہنگ ایسی لطیف شاعری ہے جس میں شعریت و شیرینی موسیقی کی حلاوت اور کیف و سرور کی وحدانیت اپنا جادو چلاتی اور رنگ جماتی نظر آتی ہے خود ہی دیکھئے ان کے ذیل میں پیش کئے اشعار اپنی نزاکت و لطافت جمالیاتی سحر اور اپنی تمام تر جولانیوں رعنائیوں اور زیبائیوں کے سبب لطف و الطاف اور نشاط و انبساط کا شدت سے احساس دلاتے ہیں۔ ذیل کے اشعار اس کے گواہ ہیں:

جان کر جاں سے گذرتا کون ہے — عشق ہو جاتا ہے کرتا کون ہے
چاندنی بن کر سرِ شام فراق — صحن میں میرے اترتا کون ہے
ان سے میرا رابطہ ہو یا نہ ہو — شام سے لیکن سنورتا کون ہے
چاند بھی قربان کی جس پر قمر — پوچھتا ہے اس پہ مرتا کون ہے

نہ وصال ہو نہ فراق ہو مگر اتنی ہے مری آرزو — کوئی ایسا ربط رہے کہ بس مجھے دوستی کا گماں تو ہو
پھول اس کی طرف چاندنی شب اس کی طرف ہے — جو پیار کا موسم ہے وہ سب اس کی طرف ہے
محفل میں توجہ کا تری ہے عجب عالم — ہر اک کو یقیں ہے نظر اب اس کی طرف ہے
نہ جانے کس طرف سے اس کی خوشبو گھر میں آجائے — دریچے جالیاں دالان دروازے بناتا ہوں

نقشبند قمر نقوی عاشق مزاج ہیں ان کی جوانی کا عشق عمر کی اس منزل پر پہنچ کر متصوفانہ رنگ اختیار کر چکا ہے۔ اصل عشق تو اب انہیں اللہ تعالیٰ سے ہے۔ چوں کہ شاعر ہیں اس لئے عشق حقیقی سے عشق مجازی کی طرف بھی نکل آتے ہیں۔ عشقیہ جذبات اور قلبی واردات سے غزل میں دل گداختگی اور سوز و ساز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے یوں بھی دنیا کی ساری تہذیبوں میں عشق کو عظمت و فضیلت حاصل ہے حسن و عشق اور ان کے باہمی معاملات جیسے لطیف مضامین سے انہوں نے اپنی شاعری کے گلدستے کو سجایا ہے۔ ان کی شاعری میں وصال کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ ہجر و فراق کا منظر نامہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔

البتہ ان کے عشقیہ اشعار سارے عشقیہ جذبات و احساسات قلبی واردات اور معاملات اپنے دامنے میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تم نے ان کی انجمن میں سب کو دیکھا ہے مگر — سچ بتانا کیا کوئی مجھ جیسا دیوانہ بھی ہے

الف لیلیٰ کے شبستاں خوش جمالوں کے نقوش   دل میں کوہ قاف بھی ہے آئینہ خانہ بھی ہے
یوں بھری محفل میں کہ بیٹھے قمر رازِ جنوں   یہ نہ سوچا بزم میں اپنا بھی بے گانہ بھی ہے

دل کی دنیا نجانے کہاں کھوگئی اتنا معلوم ہے بس کہیں رہ گئی
ہم سے جس موڑ پر وہ جدا ہو گئے زندگی دل پکڑ کر وہیں رہ گئی

گیا تھا جن کی طرف میں محبتوں کے لئے   انہوں نے نام کئی بار نفرتوں کے لئے
کوئی شہید وفا میرا جیسا کیا ہوگا   کہ جس نے کی ہے محبت بھی فرقتوں کے لئے

زندگی کے ایک اک لمحے سے ہم آغوش ہوں   ہے مجھے ان سے بچھڑ جانے کا ڈر مت پوچھنا

سننے والو مجھ سے رخصت ہوچکی میری غزل
دھڑکنیں لکھتا ہوں اب میں فرقتوں کی بحر میں

قمر نقوی اختراعی اور خلاقانہ ذہن کے مالک ہیں انہوں نے رواں دواں الہڑ اور شوخ بحروں میں اپنے نادر و منفرد اسلوب سے محفل غزل میں سماں باندھ دیا ہے۔ سوال و جواب کی شکل میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ سے متعلق ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

اس نے کہا مسلک ہے کیا؟ میں نے کہا عشق و وفا   اس نے کہا مقصد ہے کیا؟ میں نے کہا پانا ترا
اس نے کہا محشر ہے کیا؟ میں نے کہا رخصت تری   اس نے کہا پھر روز عید؟ میں نے کہا آنا ترا
اس نے کہا ابر بہار؟ میں نے کہا گیسو ترے   اس نے کہا اور ماہتاب؟ میں نے کہا چہرا ترا
اس نے کہا کیا نام ہے؟ میں نے کہا تیرا قمر   اس نے کہا پھر چاندنی؟ میں نے کہا ہنسنا ترا

ایک اور مختصر بحر میں ان کی غزل دریا کی موجوں پر کشتی کی طرح ہچکولے کھاتی محسوس ہوتی ہے:

جگنو شبنم تارے سب   آوارہ ہیں پیارے سب
خوشبو والے جھونکے ہیں   لفظوں کے ہرکارے سب
کشتی ہی سے کھیلے ہیں   ندی دریا دھارے سب
سوچوں کی زنجیروں میں   قیدی ہیں بے چارے سب

قمر نقوی نقشبندی صرف غزل کے ہی شاعر نہیں ہیں انہوں نے رباعی قطعہ گیت اور پابند و آزاد نظمیں بھی تخلیق کی ہیں اہم معاملات میں جہاں انہیں بہت کچھ کہنا ہو وہ نظم کا سہارا لیتے ہیں۔ ''لبنان'' اور ''کراچی'' میں پچھلے دنوں شیعہ سنی فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں خوب شائع ہوئی تھیں جس نے امت مسلمہ کے دلوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ انسانیت نواز اور انسان دوست نقشبندی مسلمانوں کی باہمی فرقہ پرستی اور سفاکانہ جارحیت و بربریت کے واقعات سے بے حد متاثر ہوئے تھے مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل و غارتگری کے واقعات کی مذمت کرتے ہوئے آپ نے بہترین پابند نظمیں تخلیق کی ہیں۔ کراچی میں اقلیت کے قتل عام اور ان کی تباہی کے تعلق

سے فرماتے ہیں:

کوئی ہوگا اس سے بڑھ کر قایدُ التجار کیا
کر سکے گا قتل وخوں کا ایسا کاروبار کیا
شہر کا نام اب محاذِ جنگ رکھنا چاہئے
خون سے رنگین نہیں ہیں کوچہ وبازار کیا

ان کی نظم ''لبنان'' کا بھی یہ بند ملاحظہ ہو:

پہلے تو نہ شیعہ تھے نہ سنّی نہ دروزی
اب کس لئے یہ فرقہ پرستی ہے ضروری
بیروت کے ہو دشمن بیروت بنے ہو
طالوت بنے ہو کبھی جالوت بنے ہو
تم اور تو کچھ بھی نہیں طاغوت بنے ہو
سب جبہ ودستار دکھانے کے لئے ہے
مذہب بھی گھر اپنوں کا جلانے کے لئے ہے
سایہ نہیں جس میں کوئی ہو پیڑ گھنے ہو
پیشانیٔ دوراں پہ تم اک داغ بنے ہو

مضمون کے اختتام پر نقشبند قمر نقوی کا ایک قطعہ بھی ملاحظہ کر لیجئے:

دین وایمان بھی ان کا ہے فقط نام نہاد
ظاہراً صاف ہیں باطن میں تو رکھتے ہیں عناد
اہل کوفہ پہ بھی موقوف نہیں ہے یہ فریب
اس زمانے میں بھی ہوتے ہیں کئی ابن زیاد

اب اواخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت نقشبند قمر نقوی کو انگریزی اردو ہندی عربی اور فارسی زبان پر مکمل طور پر قدرت حاصل ہے۔ آپ نے اپنی آواز کو دور تک پہنچانے کے لئے انگریزی زبان کا بھی سہارا لیا ہے اور اس طرح دو عدد انتہائی اہم دینی اور تاریخی کتابیں The Last Sunrise اور The Prophet کے نام سے تصنیف کی ہیں۔ ان کی پہلی کتاب حضرت محمد صلعم کی سوانح حیات ہے جب کہ The Prophet محبوب الٰہی اور فخر رسالت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب اور عظمت وفضیلت کو احاطہ کرتی ہے۔ آپ کی یہ دونوں کتابیں آپ کے عاشق رسول ہونے کا سراغ بہم پہنچاتی ہیں۔ آپ نے اپنی کتابوں کو بڑی عرق ریزی جانفشانی اور جانکاہی سے تصنیف کیا ہے۔

آپ کا عنقریب آنے والا تازہ مصور شعری مجموعہ ''خیال کا منظر'' زیر ترتیب ہے۔ اس میں آفاقی مصور صوفی فضل الرحمان نے قمر نقوی کے بیس اشعار کو تصویروں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے جریدے 'روشنی' میں قسط وار شائع ہونے والا تاریخی نوعیت کا معرکتہ الآرا مضمون جو محبوب حقانی سرچشمہ سلطانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر ہے ایک اہم ترین تاریخی دستاویز کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ادب میں اتنا کچھ پیش کرنے کے باوجود آپ مطلق بھی طالب شہرت نہیں ہیں اور نہ ہی داد وستائش کی تمنا رکھتے ہیں۔ ان کا یہ سارا کام ان کی افتادِ طبع کا نتیجہ ہے البتہ اپنی بخشش کے لئے وہ بھی سے دعاؤں کے ملتجی ہیں اور یہ التجا آپ سب سے بھی ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ (بہار) 846004

اقبالؔ اور غالبؔ: مخفی گوشے اور ڈاکٹر سید تقی عابدی

ڈاکٹر سید تقی عابدی اردو کے معروف و معتبر شاعر، نقاد، محقق اور دانشور ہیں۔ ان کی کئی معرکتہ الآرا کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور داد و تحسین وصول کررہی ہیں۔ پیشہ سے ماہر امراضِ قلب ہیں لیکن تحقیق سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ تحقیق کرنا عرق ریزی کا کام ہے۔ تحقیق میں صرف منطق اور استدلال سے کام نہیں چلتا ہے۔ تحقیق میں حقیقت کے لئے ثبوت فراہم کرنا پڑتا ہے اور ثبوت فراہم کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کینیڈا میں رہ کر یہ اور بھی مشکل کام ہے۔ پورے برصغیر میں سید تقی عابدی کے تحقیقی کارنامے بڑی وقعت اور اعتبار رکھتے ہیں اور بعضوں کو دیکھ کر تو اہل نظر و اہل قلم کی آنکھیں کھلی کھلی رہ جاتی ہیں۔ فروعی اور غیر ضروری باتوں سے ناطہ جوڑ کر کوئی بات طے کرلینا اور بھونڈی دلیلوں سے منوانے کی کوشش کرنا ایک عام سی بات ہے لیکن عرق ریزی کر کے سند کے ساتھ کوئی نئی بات پیش کرنا اور ندرت کے ایسے پہلو کھوج نکالنا جہاں تک عام افراد کی رسائی مشکل ہو ایک ایماندار شخص کا کام ہے۔

اقبالؔ سے متعلق ان کی تحقیقی کتاب ''چوں مرگ آید'' ہے جس میں علامہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام، ان کی علالت اور ان کی تشخیص، طب سے واقفیت، جدید ایلوپیتھی سے استفادہ اور دیگر مخفی پہلوؤں کو اس کتاب میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی وہ تمام باتیں جو غیر مستند تھیں ان کو رد کیا گیا ہے۔ سید تقی عابدی چوں کہ خود بھی سرجن ہیں، بیماری اور اس کی علامتوں کے اثرات اور اس کے دفعیہ کی صورتوں سے واقف ہیں اس لئے ایسی باتیں جو محض اقبال سے اپنی قربت ثابت کرنے کی کوشش میں علامہ سے منسوب کردی گئی ہیں ان پر بے لاگ تبصرہ بھی کیا ہے۔ چند اقتباسات یہاں نقل کررہا ہوں:

> ''ہم یہاں پر عادلانہ قضاوت کرکے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اگر یہ کوتاہیاں علاج کے راستے میں حائل نہ ہوتیں تو علامہ کا علاج شاید کامیاب رہتا اور یہ چراغ جو بقول خود اقبال ؎ با پرستارانِ شب دارم ستیزم۔ ظلمت اور اندھیرا پھیلانے والوں سے لڑ رہا تھا اور کچھ مدت اپنی روشنی سے فیض پہنچاتا۔'' عنوان: تشخیص اور علاج کی کوتاہیاں۔ ص: ۱۱۰

> ''ایسا لگتا ہے چڑیا کو مارنے کے لئے توپ استعمال کی گئی۔ چنانچہ چڑیا تو اڑ گئی لیکن دیوار گرگئی۔ بھوپال میں تین برقی کورس جسے علامہ نے اپنے خط میں Ultra violet rays کا غسل لکھا ہے غیر ضروری اگر نہیں تو ضروری بھی نہیں تھے۔ یہاں علامہ کی زندگی اور موت کا سوال نہ تھا اس غیر کنٹرول ابتدائی برقی اکسپوژر کے کئی مضرات ضرور ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ علاج کے بعد آواز

ٹھیک نہ ہوئی لیکن علامہ کا چہرہ زرد چہرے پر کبھی کبھار ورم، ضعف اور دمہ قلبی کا اثر نمایاں اور زیادہ ہو گیا شاید اس علاج نے ہڈیوں پر اثر کر کے خون کو جلا دیا ہو اور علامہ کم خونی (Anemia) سے دوچار ہو گئے ہوں جس کا منفی اثر پھیپھڑوں اور قلب پر پڑا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کمزور پھیپھڑوں کو برقی علاج کی وجہ سے نقصان پہونچا اور وہ سخت ہو کر پھیلنے اور سکڑنے کی کیفیت کو کھو چکے ہیں۔ اس علت کو Pulmonary Fibrosis کہتے ہیں جو Radiation کے مضر اثرات میں شامل ہے۔" ص:۱۱۱

"کہتے ہیں بڑے آدمی کی چھوٹی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مختلف خطوں میں خود علامہ نے لکھا کہ لوگ میری بیماری میں اس لئے دلچسپی لے رہے ہیں کہ تا کہ وہ دیکھیں ڈاکٹروں کو کب شکست ہوتی ہے یعنی ایلو پیتھک (انگریزی دواؤں) کو طبی (یونانی دواؤں) سے کب شکست ہوتی ہے......
نیویارک کے ممتاز طبیب اور شاعر ڈاکٹر عبدالرحمن عبد جو علامہ اقبال سے والہانہ محبت کرتے ہیں مجھے ایک کتابچہ کی فوٹو کاپی روانہ کی جسے انہوں نے حکیم نابینا کے نبیرہ ڈاکٹر انصاری صاحب سے حاصل کی جن کے ہم مشکور ہیں جس میں روح الذہب کے معجزہ نما خواص پر گفتگو کی گئی ہے کہ یہ نسخہ پانچ ہزار سال قدیم ہے جس میں سونے کو بطور دوا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کتابچہ کے صفحات (30) اور (31) پر مزید لکھا ہے کہ............ افتخار قوم وملت علامہ اقبال مرحوم اعلی اللہ مقامہٗ کے بائیں گردے میں اس قدر بڑی پتھری تھی کہ ایکس ریز دیکھ کر ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ گردہ اس کی ضخامت کی تاب نہ لاکر پھٹ جائے گا اور آپریشن اس کے لئے محال بتلایا گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو عرصے سے قلبی عارضہ تھا۔ روح الذہب کے استعمال سے صرف (۲۴) گھنٹے میں پتھری بلا تکلیف ریزہ ریزہ ہو کر پیشاب سے خارج ہو گئی۔ راقم نے درد گردہ Renal Colic کے بیان میں اس پر گفتگو کی۔ اس قسم کے معجزات کو جدید طب قبول نہیں کرتی۔"
عنوان: دواؤں کے نام (ص: ۱۲۰۔۱۲۱)

یہ ایسا کام ہے جو تحقیقی ہونے کے باوجود الفاظ کی بازیگری سے احتراز کرتے ہوئے سامنے لایا گیا ہے جس سے اردو دنیا ناواقف تھی۔ یہ تحقیق اقبال سے متعلق اور اقبال کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کتنے زبردست قوت ارادی کے مالک تھے۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن دنیاوی طریقوں اور علمی بصیرت سے اس کی مدافعت کرنے کی کوشش نہ چھوڑی۔ ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا اور زندگی کے آخری دور میں بھی وہ دینی اور ملی جذبہ سے سرشار رہے۔

پیش نظر دوسری کتاب بنام ''غالب: دیوانِ نعت ومنقبت'' بھی خالص تحقیقی نوعیت کی ہے۔ میرے خیال میں غالبؔ دنیائے شاعری میں اردو دیوان کی بدولت غالب ہوئے۔ اس لئے عام طور پر خود غالبؔ شہنشاہ غزل کے طور پر جانے جاتے ہیں لیکن غالباً پہلی بار ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اردو فارسی دونوں زبان میں غالب کی حمد، نعت، منقبت ومرثیے کا دیوان مرتب کیا ہے اور ان پر ناقدانہ نظر ڈال کر قدر معین کی ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ایسی کتاب برصغیر میں اب تک موجود نہیں جس میں غالب کے حمدیہ ونعتیہ اشعار، مرثیے اور منقبت پر علیحدہ سے بحث کی گئی ہو۔ دنیا کے سامنے غالب کو ہمیشہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہی پیش کیا گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تنگنائے غزل کے شکوے کا مداوا غالب نے غزل کے کینوس کو وسیع کر کے کیا۔ اسی طرح غالب کے دست قدرت میں مذکورہ اصناف نے بھی خوب گل کھلائے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان سب کے فن، جذبہ، عقیدہ، مسلک، مذہب اور محبت ہر پہلو کا ناقدانہ ومحققانہ نظر سے جائزہ لیا ہے جو اردو تحقیق میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ غالبؔ بھی معتقد میر تھے اور اس ضمن میں ڈاکٹر عابدی نے غالبؔ کی غزل پر غالب ہوتے ہوئے بھی میر سے مغلوب کیوں ہیں؟ انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا مباحثہ پیش کیا ہے:

''ہم نے اس مضمون میں غالبؔ کی مشہور غزل ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا'' کو منتخب کر کے اسی بحر، ردیف اور قافیہ میں کہی گئی چار متقدمین کی غزلوں سے مقابلہ کیا ہے جو ادب کے طالب علموں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ غالبؔ کی اس غزل میں، جو ان کے دیوان کی سب سے پہلی غزل قرار دی گئی ہے، صرف پانچ اشعار ہیں جن کے چھ مصرعوں میں قافیے تحریر، تصویر، شیر، شمشیر، تقریر اور زنجیر باندھے گئے ہیں.......... ایک ہی بحر میں ہم قافیہ اور ردیف اشعار کا مقابلہ اس لئے دلچسپ ہے کہ مختلف عظیم شعراء کی قوتِ تخیل اور فن تغزل کو کسی حد تک ایک ہی معیار پر تولا جا سکے۔'' ص: ۶۲

ظاہر ہے ہر بڑے شاعر کی زمین میں اس سے عمدہ غزل کہنے کی روایت قدیم ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے غالبؔ نے اس روایت کو جاری رکھا۔ لیکن سب سے بڑی چونکا دینے والی بات سید تقی عابدی نے یہ کہی ہے کہ جب Paradise lost جو خالص عیسائی عقیدہ کی تشریح پر مبنی ہے، لکھ کر ملٹن عالمی شعر وادب کا عظیم شاعر قرار پاتا ہے تو لگتا ہے کہ غالبؔ کی مذہبی ومسلکی شاعری کو سازشی طور پر پس پشت ڈال کر غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر غالبؔ کے مذہبی عقیدے اگر اس کے اشعار میں موجود ہیں تو اس کو ہائی لائٹ کرنے میں اردو کے محققین کو کیا دشواری تھی۔ اس لئے سید تقی عابدی نے اپنا یہ فرض منصبی سمجھا کہ وہ غالبؔ کے مذہبی عقائد اور شعری پیرایۂ اظہار جس سے ان کا مسلکی تعلق اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے اسے پیش کیا جائے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کیا جائے۔ یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے اور اردو تحقیق میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

اس تصنیف کی بابت خود ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لکھا ہے کہ:

''سچ تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ غالبؔ کی نعت ومنقبت کے بارے

میں اجمالی گفتگو کرنا حقیقت میں بحر بیکراں کو کوزے میں بند کرنے سے کم نہیں۔
پھر بھی اس سنگِ گراں کو میں نے تک و تنہا بلند کر کے محراب عشق پر جما دیا ہے۔
راقم نے بعض مقامات پر خود فارسی اشعار کا ترجمہ کیا اور بعض مقامات پر اگر عمدہ
فارسی ترجمہ حاصل ہوا تو شکریہ کے ساتھ اس بیاض عشق میں شامل کیا تاکہ میرا
مقصد اور ان علمائے ادب کے کام کی قدر دانی ہو سکے۔ اس کتاب میں مرحوم
ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مرحوم عبدالباری آسی کے ترجموں کے ساتھ ساتھ آنجہانی
کالی داس گپتا رضا کے مقدمہ کے اقتباس کو بھی شامل کیا گیا ہے۔'' حرفے
چند۔ ص:۱۰

سید تقی عابدی ایک بصیرت افروز، ایماندار اور مستند محقق کی صف میں کھڑے ہیں۔ ان کا کوئی بیان محض قیاس آرائیوں پر مبنی نہیں ہے۔ تحقیق کے جملہ شرائط کا نفاذ وہ اپنے تحقیقی کاموں میں کرتے ہیں اور بہت ہی عرق ریزی کے ساتھ۔ بقول غالب:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

تو جوئے شیر لانے سے کم یہ تحقیقی کارنامے نہیں ہیں۔

❀❀❀

فیاض احمد وجیہہ، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اُردو عالمی گاؤں کی فن کارہ: نعیمہ ضیاء الدین

سوچ بھر آنکھوں میں دور رس بینائی اور حساس دل میں انسانی عظمت کو محسوس کرنے والی فن کارہ نعیمہ ضیاء الدین اُردو کے نو عالمی معاشرہ اور گاؤں (جرمنی) میں ایک عرصے سے پرورش لوح وقلم کررہی ہیں۔ نعیمہ کے افسانے پاک وہند کے متعدد رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کا اوّلین افسانوی مجموعہ ''منفرد'' ۱۹۹۸ء میں چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ اور دوسرا افسانوی انتخاب ''ایک شبد کا جیون'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس طور پر ان کا تعلق بہت حد تک ۱۹۸۰ء کے بعد کی نسل سے ہے۔ اس کے باوجود ان کے انفراد وامتیاز کا تعین بہت سہل نہیں ہے۔ اُردو کی نئی بستی سے ابھرنے والی اس فن کارہ کو سیر وسیاحت کا موقع بھی میسر آیا ہے ''شہر پری تمثال'' (۲۰۰۴ء) لندن کا سفرنامہ بھی ان کے تشخص کا قابل قدر اظہاریہ ہے۔ اس سفرنامہ کے توسط سے ان کے ذہنی رویے اور ایک انسان کی سائیکی کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سیاست اور مذہب کو نعیمہ زندگی اور دوستی کے لئے قاتل خنجر جانتی ہیں۔ انسان کی عظمت اور شناخت کے لئے نعیمہ جیسی حساس فن کارہ عشق وعقل کے مابین ایک نوع کے بُعد میں فلسفۂ انسان پر اصرار کرتی ہیں۔ اس میں نئے انسان کا فلسفہ، اس کی عظمت اور قدر وتمکنت سے عبارت ہے۔ نعیمہ بہ ہر دو اعتبار عقلیت پسند ہیں۔ بقول کسے انسان کے ظاہر اور باطن کو جاننا مقصود ہو تو اس کے ساتھ سفر نہایت ضروری ہے۔ یقین جانئے ''شہر پری تمثال'' کی قرأت کسی بھی قاری کے لئے ایسا ہی خوبصورت تجربہ اور مشاہدہ ہے۔

'خود کو دریافت کرنا سہل نہیں، اپنی ذات کے عرفان کی طلب میں نعیمہ اس حقیقت سے آگاہ ہوکر ہی تخلیقی کرب سے مسلسل آشنا ہورہی ہیں۔ اپنی ذات میں غوطہ لگانا اور نت نئے کرداروں سے روبرو ہونا ہی تخلیقی عمل ہے، بلاشبہ یہ بے حد سخت مرحلہ ہے اور اس عمل میں ادھورے پن کا احساس ہی کئی معنوں میں نئے بھیدوں کا سراغ ہے۔ نعیمہ کے فکر وفن میں بھی یہ ادھوراپن خود کو دریافت کرنے کا عمل ہے۔ ان کی تارک الوطنی کے پس پردہ بھی اک نئے طور کا احساس ہے۔ اس کیف کو نعیمہ کے لفظوں میں دیکھئے:

> ''ذہنی لحاظ سے میں مشرقی معاشرے کی عورت نہیں تھی۔ لیکن پیدا مشرق میں ہوگئی۔ جہاں کا مرد بھی آزادی اظہار کا حق دار نہیں تو عورت کا کیا سوال۔ جس کے بارے میں وہاں ابھی تک انسان ہونے کا تعین ہی نہیں کیا جاسکا۔''

اپنے تشخص کے اس اظہاریہ میں نفی اور اثبات کا جو معاملہ درپیش ہے، اس کی متعدد سطحیں ہیں۔ دراصل ذہنی وجود ہی انسان کا مکمل وجود ہوتا ہے۔ ان کی عقلیت پسندی کے باعث ان کے اقدار وافکار کی اساس میں مشرق کی طہارت بھی بہ ہر دو اعتبار نمایاں ہے۔ اس طور پر ان کے فکر وفن کا مطالعہ ایک قاری کے لئے کئی معنوں میں دلچسپ ہے۔ شمیم حنفی نے ''نئی شعری روایت'' میں ایک جگہ بے حد فکر افروز خیال پیش کیا ہے کہ: ''نئی حسیت

کشمکش کا مرکزی نقطہ یہی مسئلہ ہے کہ حال کو کس طرح اپنا حال بنایا جائے۔'' میرے خیال میں نعیمہ کے سامنے بھی یہی مسئلہ درپیش ہے۔ گویا کہ انہوں نے نفی اور اثبات کے تعین میں خود کو دریافت بھی کیا ہے اور بعض امتیازات کے ساتھ تضادات کو بھی اپنی ذات سے مختص کرنے کی جہد کی ہے۔ بعض ان ہی تضادات نے ان کے فکروفن کی تعمیر وتشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے اور یہی ان کے فکروفن کی کلید ہے۔ اسی کے باعث فن پارے میں تشخص کا اظہار یہ حضور اور غیاب کی شکل میں نظر آتا ہے، اور بعض کرداروں کے ذہنی رویے اور ان کے اعمال وافعال میں تضادات کی جو صورتیں ہیں، ان کو ہم نئے انسان کے فلسفے اور نئی عورت کی حسیت سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ ان کے یہاں تضاد لفظی اور معنوی دونوں صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ بلاشبہ ان کی شعریات میں انسان کے مطالعہ کا ایک نیا تناظر ہے، جس میں انسانی عظمت اور اس کی گاتھا سے سروکار بہرحال ہے۔ اس ہنرمندی کے باعث دو جغرافیائی حدود کے مابین تہذیب وثقافت اور معاشرت کے امتیازات بھی واضح ہوتے ہیں۔ لیکن یہ انفراد وامتیاز دو تہذیبی جہات کے رُخوں کو روشن کرنے سے زیادہ انسان کی سائیکی کا خوش اسلوب مطالعہ ہے۔ بعض مرتبہ انسانی سائیکی ان کے یہاں ثقافتی مظاہر اور نقوش کی قدروقیمت کو پیش کرنے میں بھی حد درجہ معاون ہوتے ہیں۔ اسی کے باعث ان کے افسانوں کا ایک نیا تناظر بھی سامنے آتا ہے، جس کو ہم عصری اور مکانی صورتحال کے بیانیہ سے تعبیر کرتے ہوئے آفاقی ادب کے خانے میں رکھ سکتے ہیں۔ دراصل ہر لحظہ تغیر پذیر معاشرہ ان کے افسانوں میں Indirect-Narration کے پیرایے میں Un-Said کے طور پر نمودار ہوتا ہے، اور جہاں جہاں Direct-Narration میں صورتحال کی ترجمانی ہے وہاں ان کی نسوانی حسیت متوجہ کرتی ہے۔ اس طور پر یہ بھی کہنا چاہئے کہ ان کے یہاں کم وبیش تمام کرداروں کا ایک ہی اور مخصوص پس منظر ہے اور اپنے جداگانہ اختصاص کے باوجود یہ مخصوص پس منظر مصنفہ کے ذہنی رویے سے حد درجہ ہم آہنگ ہے۔ بعض دفعہ اسی ذہنی رویے کے نتیجہ میں کرداروں کے تشخص کا بحران بھی سامنے آتا ہے، جو بین السطور بیانیہ سے مربوط ہوکر ایک Innocent-Position حاصل کرلیتا ہے۔ ڈسٹ بن، جیسا افسانہ ان کے فکروتفکر کی چیدہ تمثال ہے، نعیمہ کی صنفی حسیت اور عصری صداقتوں کا گہرا مشاہدہ جنسی تفریق کے جس صورتحال کی ترجمان ہے اس کو انہوں نے اپنے بیانیہ میں خوش اسلوبی سے پیش کردیا ہے۔ یہاں دو نسلوں کی سائیکی میں افکارواقدار کے نئے روپ کا درشن بھی ہے۔ نعیمہ نے اپنے افسانوں میں جس طرح کے موضوعات اور مسائل کو فن کے قالب منقلب کیا ہے اس میں حد درجہ عصریت ہے جہاں تک اس کی مکانی حیثیت کا سوال ہے تو مشرق میں بھی مشرقی طہارت سوالیہ علامت ہے۔ اس طور پر ان کے افسانوں کو وسیع تر تناظر اور ان کے کرداروں کو عالمی کینوس میں دیکھنا زیادہ بامعنی ہے۔ مراجعت، اور وصیت، وغیرہ میں جنسی سائیکی کے نظام اور تہذیب وثقافت کے بعُد کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کے بعض کرداروں کے ذہنی رویے کو اُجالنے کے لئے Pray اور نماز کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح کی سوچ وفکر کے نمائندہ کرداروں کی مکانی حیثیت کا تعین محال ہے، چوں کہ مشرق ومغرب کے امتیازات اور ان کے روایتی تصورات موجودہ زمانے میں بعض ذہنوں کا حوالہ محض ہیں۔ گلوبل نظام کی تعریف وضع کرتے ہوئے ہر ہر سطح پر ان کے افسانوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

نعیمہ کی عقلیت پسندی قابل داد ہے کہ انہوں نے بعض جگہوں پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنے کرداروں کی تربیت کی ہے۔ اس طور پر یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ نعیمہ کو مذہبی جنون قطعی پسند نہیں ہے۔ دراصل ان کے بیانیہ میں بین السطور کا معاملہ بے انتہا اہمیت کا حامل ہے، انہوں نے بڑے مؤثر انداز میں مذہبی جنون اور دیگر متعلقات پر طنز کیا ہے۔ ان باتوں کو ان کے افسانہ ''پرائے راستہ اور اپنے ہم سفر'' میں بھی بعض متعلقات کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ رہائی، جیسے افسانہ میں روزمرہ کے معمولات اور شکوک شبہات کے درمیان ایک نئی عورت کی حسیت ان کے شعریات کی انوکھی جہت ہے۔ نعیمہ کی شعریات میں بیانیہ کا بہت اہم رول ہے، انہوں نے کرداروں کی زبان کا خاص خیال رکھا ہے۔ نعیمہ نے ہندی لفظیات کو بھی اپنے بیانیہ میں متشکل ہے۔ ایک شبدھ کا جیون، بقول قمر رئیس: ''شاید اُن کے اور اردو کے شاہکار افسانوں میں جگہ پائے گا۔'' اس افسانہ سے ایک سطر ملاحظہ فرمائیں: ''کہیں وہ اس کی جوان ہوتی بیٹیوں کو گابھن نہ بنا دیں۔'' اس طرح کے بیانیہ میں ایک مخصوص پس منظر کے تحت ثقافتی مظاہر اور نقوش کا علم ہوتا ہے۔ اس طرح کے ٹھیٹ اُردو کو اگر وہ اپنے بیانیہ میں حاوی طور پر اپنا لیں تو متن در متن کی کئی صورتیں ان کو میسر آ جائیں گی۔ نعیمہ ایسے ہی افسانوں میں ایک فن کار کے قدر و مرتبہ سے آگاہ معلوم ہوتی ہیں، دراصل وہ مشرق و مغرب کی تہذیبی جہات اور انسانی سائیکی کا تجزیہ بلا تفریق کرتی ہیں اور یہی ان کا مخصوص ذہنی رویہ ہے۔ اسی کے باعث ان کے یہاں بعض جگہوں پر تہذیب و معاشرت اور مذہبی جنون ایسے متعلقات کے ردعمل میں سماجی تفاعل سے زیادہ حد درجہ انفرادی رویہ بھی سامنے چلا آتا ہے۔ دھیان، پریم چند کے افسانہ کفن کے قرأت کا تفاعل ہے، دراصل نعیمہ نے کفن، کے ایک خاص نوع کی قرأت کو آج کے تناظر میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے دوسرے افسانوں میں قرض کی فصل، سراب کا بھنور، سبز رات، ناک اور حلال نشہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نعیمہ کے افسانوں کا ایک طویل سفر ہے، جس کو مرگ و حیات کا چنتن بھی کہہ سکتے ہیں۔

ان کے یہاں موضوع کا تنوع اور رنگارنگی ضرور ہے، مگر ان کو قصہ گوئی کے فن سے ابھی واقف ہونا ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں کرداروں اور واقعات کی بھرمار ہے۔ بعض دفعہ ان کے افسانے اتنے طویل ہو جاتے ہیں کہ عیوب نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ نعیمہ اگر اپنے کرداروں کو اپنے مخصوص ذہنی رویے سے آزاد کر دیں تو فکر و فن کا حسن دوبالا ہو جائے گا۔ یہ کوئی جملہ معترضہ نہیں ہے، بلکہ نعیمہ کے فنی محاسن کو نمایاں کرنے کی جہد ہے۔ جوگندر پال جیسے شہرہ آفاق فکشن رائٹر کو نعیمہ کے موضوعی تنوع کا احساس ہے۔ انہوں نے بہت اچھی بات لکھی ہے کہ: ''ان کی کہانیوں میں بیک وقت مانوس اور غیر مانوس وقوعی تناؤ کا سماں بندھنے لگتا ہے۔'' گوپی چند نارنگ جیسے دیدہ ور نقاد کا خیال ہے: ''نعیمہ ضیاء الدین کا مرکزی Protagonist ایک ایسی عورت ہے، جس کی اپنی انفرادیت، اپنی ذہنی آزادی، اپنی آواز اور اپنی نظر ہے......... ابھی ان کا سفر شروع ہوا ہے اور ان کو بہت آگے جانا ہے۔'' اُردو عالمی گاؤں کی اس نئی فن کارہ کے پاس اپنی نظر ہے۔ چنانچہ ان کے فکر و فن میں وہ مقام بھی آئے گا، جب ان کے اسالیب بیان سے ان کی شناخت ہوگی۔

❀❀❀

پروفیسر سید منظر امام، فاطمہ ہاؤس، واسع پور، دھنباد (جھارکھنڈ)

یہ سرگذشت ہی ہے (ساتویں قسط)

جمشید پور کے ساتھ یادوں کے بہت سے سلسلے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں میری باجی اور برادر نسبتی منظر شہاب کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے وہاں جاکر کتنے ہی نئے رشتوں کو جنم دیا ہے، کتنے ہی نئے تعلقات کی بنیاد ڈالی ہے۔ میری بیوی شاہینہ بھی اسی شہر کا عطیہ ہیں۔ سید احمد شمیم بھی اپنے بڑے بھائی منظر شہاب ہی کی وجہ سے وہاں گئے۔ اور میرا بھی نزول اس شہر میں انہیں کی وجہ سے ہوا۔

آج بھی جمشید پور میں کئی احباب بلکہ دوست ہیں جو سرمایۂ جاں بنے ہوئے ہیں، ان ہی میں ایک شیدا چینی ہیں جن کا اصل نام وائی ڈی لیو ہے اور چوں کہ ڈینٹل سرجن ہیں اس لئے ڈاکٹر کا سابقہ لگ گیا ہے۔

شیدا نسلاً چینی نژاد ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ان کا خاندان برما ہوتے ہوئے ہند کی سرزمین پر وارد ہوا تھا۔ شیدا کے والد نے دنداں سازی کا پیشہ اپنایا۔ عرصے تک اس پیشے پر چینیوں کا قبضہ رہا ہے۔ شیدا نے بھی تعلیم کی تکمیل کے بعد یہی آبائی پیشہ اختیار کیا۔ پیسے بھی کمائے اور نام بھی۔

شیدا چینی سے میرا پہلا تعارف ایک ادبی نشست میں ہوا تھا۔ میں پٹنہ کالج کا طالب علم تھا اور چھٹیوں میں باجی کے پاس جمشید پور آیا ہوا تھا۔ ان ہی دنوں میری ادارت میں سہ ماہی ''رفتار نو'' شائع ہو رہا تھا۔ دو شمارے نکل چکے تھے اور اچھی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔ چوں کہ میری حیثیت مدیر اعلیٰ کی تھی اور سید احمد شمیم اس کی ادارت میں شامل تھے اس لئے انہوں نے بی زیڈ مائل سے مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے میرے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کر دیا۔ مائل جمشید پور کی بہت ہی فعال ادبی شخصیت کا نام تھا۔ وہ میرے ہم وطن تھے۔ میرے بھائیوں کے ملنے والوں میں تھے اس لئے ہمارے گھر امیر منزل میں ان کی آمد و رفت تھی۔ جمشید پور میں ترقی پسند تحریک کو جلا بخشنے میں مائل صاحب کی کاوشوں کا بڑا دخل ہے۔ یہاں پر میں منظر شہاب کے مضمون ''بی۔ زیڈ۔ مائل...... ایک کج کلاہ شاعر'' سے چند سطریں پیش کرنا چاہوں گا جن سے مائل صاحب کی شخصی اور ادبی حیثیت متعین ہوتی ہے:

> ''جمشید پور کے ادبی افق پر بی زیڈ مائل کا کارنامہ ایک تابندہ ستارہ کی مانند چمکتا رہے گا۔ اردو زبان کی نشو و نما اور تحفظ کی جد و جہد میں مائل نے نمایاں کردار ادا کیا۔ شہر کی مختلف ثقافتی انجمن سے وابستہ تھے۔ لیکن ان کی سب سے زیادہ وابستگی انجمن ترقی پسند مصنفین سے تھی۔ انجمن کی تشکیل، توسیع اور تحریک کے لئے انہوں نے زندگی وقف کر دی تھی۔ ادب میں ترقی پسند نظریات کی ترویج ان کا حاصل حیات تھا۔ ان کے جوش جنوں کے طفیل انجمن ترقی پسند مصنفین جمشید پور کی شمع روشن تھی اور جب ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے تو

انجمن کی رگوں کا خون بھی سرد پڑ گیا۔‘‘

مائل صاحب کی ایک غزل کے یہ اشعار اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں:

رہ پر خطر میں چلنا میرا شیوہ ہو گیا ہے ۔۔۔ یہ خلوص شوق ہمت کوئی لے سکے تو لے لے
میں غموں کا بادشاہ ہوں میری مملکت ہے غربت ۔۔۔ یہ نظر کشا ریاست کوئی لے سکے تو لے لے
جہاں تیرگی کو دیکھا وہیں اپنے گھر کو پھونکا ۔۔۔ میرا یہ جنوں خدمت کوئی لے سکے تو لے لے

ہاں، تو ذکر تھا کہ میرے اعزاز میں ایک نشست رکھی گئی۔ میں بی۔اے کے پہلے سال میں تھا۔ ویسے بھی شروع سے بہت شرمیلا ہوں، بھیڑ بھاڑ سے اب بھی کتراتا ہوں اور چوں کہ بزرگوں کی توقیر کرتا آیا ہوں اس لئے جتنی دیر محفل شعروسخن رہی اپنے آپ کو بونا سمجھتا رہا اور کیوں نہ سمجھتا جب کہ وہاں کئی بزرگ شعراء موجود تھے۔ منظر شہاب، بی زیڈ مائل، احمد عظیم آبادی، سہیل واسطی، دل رضوی یہ سب میری عمر سے کافی بڑے تھے۔ شمیم اور شمس فریدی تو تھے ہی، ایک اور صاحب جو شکل سے ہرگز ہندوستانی نہیں لگتے تھے بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ تعجب ہوا مگر فوراً ہی یہ استعجاب شمیم نے دور کر دیا۔

’’منظر امام ان سے ملو، یہ شیدا چینی ہیں۔‘‘

شیدا نے زیر لب تبسم کے ساتھ میری طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ اسی شب میں نے ان کی غزل سنی اور تلفظ اور کلام دونوں سے متاثر ہوا۔ چلتے وقت شیدا نے شمیم کو تاکید کر دی تھی کہ مجھے لے کر ان کے غریب خانے ضرور آئیں۔

دوسرے روز مجھے شمیم شیدا کے کلینک لے گئے جو ٹاٹا نگر اسٹیشن کے قریب لب سڑک تھا۔ وہ دانت بنانے میں مصروف نظر آئے۔ دو چار مریض بھی براجمان تھے۔ شیدا بڑی گرم جوشی سے ملے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک صحت مند جوان عورت گاؤن پہنے ناشتے کی ٹرے لے کر حاضر ہوئیں اور ہمیں سلام کیا۔ تب مجھے علم ہوا کہ یہی شیدا کی رہائش گاہ بھی ہے۔

’’یہ میری بیگم ہیں اور یہ منظر امام، ان کے تعارف کی ضرورت تو ہے نہیں؟‘‘ شیدا نے شمیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شیدا چینی کی بیگم جنہیں میں نے پہلے ہی دن سے بھابھی کہنا شروع کر دیا تھا خلوص و محبت کا پیکر ہیں۔ اس دل آزار دنیا میں وہ دلداری کا ایک خوبصورت نمونہ ہیں۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں ٹسکو میں ملازمت کرنے لگا اور شیدا سے میرے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔ میرا قیام مائنس میں تھا جو شیدا کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہر دو چار دن پر ان کے یہاں چلا جاتا۔ کبھی وہ میرے گھر آ جاتے۔ عام طور پر شیدا اپنا کام نپٹا کر رات کے نو بجے آتے۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تو نیم شب کے بعد ہی رخصت ہوتے۔ ان کے پاس ایک پرانی سائیکل تھی وہ اسی سے آتے تھے۔ اسی سائیکل پر بیٹھ کر میں کتنی بار ان کے ساتھ بسٹو پور اور ساکچی گیا ہوں۔ نٹ راج، کریم اور بسنت میں فلمیں دیکھی ہیں۔

شیدا چینی باتیں بڑی دلچسپ کرتے ہیں۔ محفل کو قہقہہ زار بنانے کا ہنر انہیں آتا ہے۔ افراد خانہ سے وہ چینی زبان میں باتیں کرتے ہیں لیکن باہر بڑی شستہ اور رواں اردو میں گفتگو کرتے ہیں۔ انہیں بی زیڈ مائل سے

شرف تلمذ رہا ہے۔ اپنے ادبی استاد کے لئے ان کے دل میں بڑی قدر ومنزلت ہے۔ اب بھی مائل صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

غالباً سن ۶۵ کی بات ہے۔ کلکتہ سے نکلنے والا مشہور روزنامہ ''آزاد ہند'' عید کے موقع پر ضخیم خاص نمبر شائع کرتا ہے۔ ادبی حصہ بھی بے حد وقیع ہوتا ہے۔ یہ روایت ہنوز قائم ہے۔ اس اخبار کے بانی مولانا رزاق ملیح آبادی (مشہور عالم، مفکر، صحافی، مولانا آزاد کے رفیق خاص) تھے۔ ان کے بعد ان کے لائق فرزند احمد سعید ملیح آبادی اس کے مدیر ہیں جو ان دنوں راجیہ سبھا کے ممبر بھی ہیں۔ احمد سعید صاحب کو جب اس چینی شاعر کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے مجھے اور شمیم کو خط لکھا کہ آپ دونوں اس چینی نژاد شاعر کے بارے میں مضامین لکھ کر بھیجیں تاکہ میں انہیں آزاد ہند کے عید نمبر میں شائع کر سکوں۔ شمیم نے شیدا کی شاعری پر اور میں نے شخصیت پر مضامین لکھے جو آزاد ہند کے عید نمبر میں طبع ہوئے اور اس طرح ایک بڑا ادبی حلقہ اس کے فن اور شخصیت سے واقف ہو سکا۔ افسوس میرے مضمون کا مسودہ محفوظ نہیں رہ سکا اور نہ ہی آزاد ہند کا وہ نمبر موجود ہے۔

دھنباد آنے کے بعد شیدا چینی سے ملاقاتیں کم ہوتی ہیں۔ اب وہ شہر کے سب سے پوش بستو پور میں اپنے بیٹے بہو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ عمر رواں کسی کو نہیں بخشتی ہے شیدا بھی اس کی زد میں ہیں۔ کمزور ہو گئے ہیں اور کسی حد تک معذور بھی۔ ان حالات میں بھی شعر وادب کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ شمیم اور شمس دوستی کی شمع فروزاں کئے ہوئے ہیں۔ سنا ہے کہ جلد ان دونوں کی کاوشوں سے شیدا کی پہلی شعری کتاب ''صداؤں کی لکیر'' منصۂ شہود پر آ چکی ہے۔ خدا کرے وہ لمحہ زرّیں جلد آئے۔

جمشید پور بھی واقعی ''ایک شہر تھا عالم'' میں انتخاب۔ قومی یکجہتی کی خوبصورت مثال۔ فرقہ واریت، عصبیت کے نام سے بھی لوگ ناواقف تھے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے یہاں بالکل ایسا ہی تھا۔ مختلف مذاہب کے لوگ، مختلف صوبوں کے رہنے والے، الگ الگ زبانیں بولنے والے مگر سب کے سب ایک ہی دھاگے میں پروئے تھے...... لیکن نہ جانے کیا ہوا۔ مارچ سن ۶۴ء، گرمی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اچانک فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ روشنی کے اس شہر کو اندھیرے نے ڈس لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر ایک سیل بے پناہ میں گھر گیا۔ پہلے سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ میں برمامائنس میں تھا، شہاب بھائی جگسلائی میں اور شمیم اپنے کوارٹر ادتیہ پور میں۔ کسی طرح جان بچا پائے ہم لوگ۔ سب کچھ لٹ گیا۔ کیمپوں میں پناہ لینی پڑی۔ شمیم کو سب سے زیادہ غم اپنی کتابوں کے لٹ جانے کا تھا۔ بڑی قیمتی اور نایاب کتابیں تھیں اس کے پاس۔ مجھے برمامائنس کی مسجد میں پناہ لینی پڑی۔ وہ تاریخی دن آج بھی یاد ہے۔ دوپہر کا وقت تھا جب ہم کوارٹر سے جانیں بچا کر مسجد میں داخل ہوئے تھے۔ مسجد پریشان حال لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرد عورتیں، بچے بوڑھے جوان وہاں پناہ گزیں تھے۔ مسجد کے صحن میں ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اسی کے پتے پر ہمیں کھانے کیلئے کھچڑی دی گئی تھی کیوں کہ پلیٹ کسی کے پاس نہیں تھا۔ پہلی بار اس شہر میں رہنے والوں کے ذہن میں خوف، دل میں بے اعتباری اور آنکھوں میں بدگمانی کو جنم دیا۔ اس وقت شاہینہ میری زندگی میں نہیں آئی تھیں۔ وہ آٹھویں درجے میں پڑھ رہی

تھیں۔ ان کا بھی پورا گھر لٹ گیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے جانیں بچ پائیں تھیں۔ ان کے ایک بے حد قریبی رشتہ دار کو جام شہادت بھی پینا پڑا تھا۔ اس ہولناک منظر کو یاد کر کے شاہینہ اب بھی پریشان ہو جاتی ہیں۔

مگر وقت تو ماں کی مہربان تھپکیوں کی طرح ہے۔ ہر ٹیس کو سلا دیتا ہے۔ ہر غم کو بھلا دیتا ہے۔ ہر آنسو خشک کر دیتا ہے۔ زندگی میں ایسے موسم آتے ہی رہتے ہیں جب صبا اور سموم قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔

پھر وہی شہر تھا، وہی رونقیں، وہی ہنگامے، وہی دفتر، وہی قہقہے...... کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا...... ایک ہی ماہ کے اندر ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ خوف کے بادل چھٹتے جا رہے تھے۔ موسم خوشگوار ہونے لگا تھا، راتیں دلچسپ ہونے لگی تھیں اور بے یقینی یقین میں تبدیل ہو رہی تھی۔

شمس فریدی ان لوگوں میں ہیں جنہیں اپنا دوست کہتے ہوئے مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ وہ دوست کیا جس سے مل کر آپ کے خوابیدہ جذبات بیدار نہ ہو جائیں، جس کا قرب آپ کو جینے کا حوصلہ نہ بخشے، جس کی باتیں آپ کے شریانوں میں چنگاری نہ بھر دیں۔ شمس فریدی سے میری ملاقات انہیں دنوں کی ہے جب میں نے کوآپریٹو کالج میں داخلہ لیا تھا۔ وہ جگسلائی میں رہتے تھے اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ شمیم سے ان کی دوستی ہو چکی تھی اور شاعری کے جراثیم ان کے اندر بھی سرایت کرنے لگے تھے۔ یہ سچ ہے کہ شمس کو شاعر بنانے بلکہ ادبی منظرنامے پر لانے میں شمیم کی رفاقت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آج بھی میں شمیم اور شمس ایک دوسرے کے بے حد نزدیک ہیں اور جب ملتے ہیں تو دل کے تمام بند دروازوں کو وا کر کے ملتے ہیں۔ شمس خوش مذاق ہے، خوش گفتار ہے، خوش مزاج ہے، خوش جمال کا لفظ نہیں استعمال کروں گا لیکن اتنا ضرور ہے کہ چہرے پر ہمیشہ معصومیت کھیلتی رہتی ہے۔ برسوں کی ادبی ریاضت نے اسے شاعری کے فنی تقاضوں سے آگاہ اور شعری کیفیات کا مزاج داں بنا دیا ہے۔ اسی سال اس کا خوبصورت شعری مجموعہ ''بے کنار'' منظر عام پر آیا ہے اور ارباب فن سے خراج وصول کر رہا ہے۔

شمس میرے ان دوستوں میں ہیں جن سے راز و نیاز کی باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں حالاں کہ کبھی کبھی وہ راز دوسروں پر منکشف بھی ہو جاتا ہے اور یہ سب اس کی اسی معصومیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر میں اسے یہ مصرعہ ضرور سناتا ہوں:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

وہ مسکرا کر رہ جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ دل کا بہت صاف ہے، معصوم ہے، حد سے زیادہ نیک ہے لیکن جیسا کہ مہاتما گاندھی کی شہادت پر برنارڈ شا نے کہا تھا:

''How lengerous it is to be Sometimy good''

اس کی اسی سادہ لوحی اور بے وقوفی کی حد تک معصومیت نے اسے نقصان بھی پہنچایا ہے۔ شمس کی بیگم انوری بڑی مخلص عورت ہیں۔ مہمان نواز، کم سخن، ان کے حسن اخلاق کے اسیر میں اور شمیم دونوں ہیں۔

یادوں کے البم میں اور بھی کئی تصویریں ہیں، کئی چہرے ہیں جن سے جمشید پور میں گذارے ہوئے لمحات روشن اور تابندہ ہیں۔ (جاری)

تشنہ اعجاز، خیرآباد، بگہا، مشرقی چمپارن (بہار)

باتیں ان کی یاد رہیں گی

ماضی میں اگر دیکھئے تو امیر ہو کہ غریب سب کئی کئی روز پہلے سے شادی کی تیاریوں میں لگ جاتے تھے۔ گھر کے بھی افراد نہایت ذوق شوق سے تیاریوں میں حصہ لیتے۔ دولہے کو مہندی ابٹن لگایا جاتا تھا تاکہ چہرے کی چمک بنی رہے۔ گھر کی عورتیں ہوں یا پڑوس کی۔ بڑی محبت سے راتوں میں گیت گاتی تھیں۔ راتوں کو جاگتی تھیں۔ بڑے شوق سے گلگلے پکاتی تھیں پھر عورتوں کا جھنڈ نصف شب کو مسجد کا رخ کرتا کنواری بچیاں گلگلوں سے مسجد کی طاق بھرتی تھیں۔ پھر دعائیہ گیت گاتے ہوئے لوٹتی تھیں اگر گھرانہ پڑھا لکھا ہوتا تو لڑکے والے کئی کئی سہرے لکھواتے۔ بعض گلدستے کی شکل میں نکاح کے بعد مہمانوں کو پیش کرتے۔ مغل دور میں اس کا عروج رہا۔ غالب نے جب یہ کہا:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

تو ذوقؔ نے فوراً جواب دیا:

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنادے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

غالبؔ اور ذوقؔ کی چشمک اہل علم سے کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ مغل دور میں جب بھی کسی امراء کے یہاں کوئی تقریب ہوتی تو شعراء کی موجودگی لازمی ہوتی۔ اس زمانے میں شعراء کی اہمیت مسلم مانی جاتی تھی۔ بعضے امراء تو میراثیوں کو بلواتے تھے جو نہایت ذی علم قابل اور جانکار ہوتے تھے۔ ان کی حاضر جوابی بذلہ سنجی قابل دید ہوتی تھی۔ بہت سے رؤسا طوائفوں کو اپنی تقریبات میں خصوصی طور پر بلواتے تھے جو اپنی جان لیوا اداؤں اور حاضر جوابی سے مجلس کو گلزار بنا دیتی تھیں لوگ باگ ان کی حاضر جوابی کا مزہ لیتے تھے۔ دور دور سے انہیں دیکھنے اور سننے آتے تھے وہ اپنی عشوہ طرازیوں اور اپنی جان لیوا اداؤں سے حاضرین مجلس کو لاجواب کر دیتی تھیں۔ انہیں ہزاروں اشعار موقعے کے یاد رہتے تھے۔ یہی حال میراثیوں کے تھے جو مشہور شعراء کے اشعار بر وقت بے تکلف بلا جھجھک پڑھا کرتے تھے امراء ان کے پڑھنے کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ہی ایک صاحب سے ایک تقریب میں بہت دنوں پہلے میں نے یہ کہتے سنا کہ کسی نواب صاحب کے بھتیجے کی شادی تھی جو نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ کھانے کے بعد شب میں طوائفوں کا رقص لازمی تھا انہوں نے اپنا رقص شروع کیا۔ ایک طرحدار طوائف نے جو اپنے ہیجان انگیز رقص کا نمونہ پیش کیا تو نواب صاحب قبلہ بے اختیار بھری مجلس میں اس سے لپٹ گئے اور عالم وارفتگی میں آ گئے پورا مجمع ورطۂ حیرت میں آ گیا اس کے لچکنے اور اٹھلانے کے انداز مستانہ نے لوگوں کو بیخود کر دیا اس نے نواب صاحب سے چھٹکارا پانا چاہا تو وہ اور لپٹ گئے دراز دستی جب حد سے بڑھنے لگی تو اس طوائف نے

برجستہ کہا:

جو یونہی تڑورا مڑوری رہے گی — تو یہ انگیا کا بے کی نگوڑی رہے گی

اس دور میں افلاس وغربت کی مار شعراء جھیلتے اور ان امراء کی جی حضوری میں رہا کرتے۔ بہت سے شعراء کی یہ خواہش ہوتی کہ ان کے اشعار امراء کے دربار اور مجلسوں میں پڑھے جائیں۔ بعضے شعراء کو جب یہ معلوم ہوتا کہ مشہور زمانہ طوائفوں نے اپنی مجلسوں میں میری غزلیں پڑھی ہیں تو وہ سارے غم وافلاس کی مار بھول جاتے۔ بہت سے شعرا بہت سی طوائفوں سے فیض یاب بھی ہوتے تھے۔ شادی بیاہ میں شعراء کی اہمیت امراء کے یہاں بڑھ جاتی تھی۔ جب شہنشاہ اکبر نے راجہ بھگوان داس کی صاحبزادی جگت گسائیں سے جہانگیر کی شادی کی تو بوقت رخصتی راجہ بھگوان داس رقت آمیز لہجے میں اکبر سے کہا: ''مہاری رے بیٹی تہارے محلوں کی چیری ہم باندگلام رے۔'' تو شہنشاہ اکبر نے برجستہ کہا: ''تہاری رے بیٹی تہارے محلوں کی رانی تم سردار رے۔'' (طبقات اکبری تاثر العلما، جلد دوم)

مسلم سلاطین کے عہد میں شعر وشاعری نغمہ وموسیقی کو کافی ترقی ملی۔ بادشاہ اور امراء کا ذوق اعلیٰ اور ستھرا ہوتا، بہت سے شعراء امراء کے دربار سے وابستہ ہوتے تھے، شادی ہو یا جشن عید یا جشن تاجپوشی شعراء اس میں اپنے فن شاعری کے کمال سے محفل کو کشتِ زعفران بنادیا کرتے تھے۔ اورنگزیب عالمگیر جب دکن میں تھے تو شاہنواز خاں صفوی کی لڑکی سے ان کی شادی طے پا گئی۔ شادی کے دن جیسے جیسے نزدیک آتے گئے اورنگزیب کی عدم موجودگی شاہجہاں کی پریشانی کا سبب بننے لگی، تو شاہجہاں نے ایک اسپیشل ہرکارے کو اورنگزیب کے پاس طالب آملی کا یہ شعر لکھ کر بھیجا:

بامژدہ اگر زود در آئی چہ شود — پاتاختہ پیش از خبر آئی چہ شود
زود آمدنت نظر شوقم دیر است — از زود اگر زود تر آئی چہ شود

یہ پڑھتے ہی اورنگزیب آگرہ فوراً حاضر ہوا۔ پھر نہایت تزک واحتشام سے اورنگزیب کی شادی ہوئی۔ اس شادی کے جشن میں ابوطالب کلیم نے موقع کے مناسبت سے چند اشعار پڑھے:

جہاں کردہ سامان بزم نشاطی — کہ گلبانگ عیشش گہر دوں رسیدہ
قرآن کردہ سعدین وزیں سال قرانی — فرح خیز وفرخندہ دوراں ندیدہ
زبیوند ایں گلبن باغ دولت — زمانہ گل عیش جاوید چیدہ
فلک رتبہ اورنگزیب آنکہ ایزد — سزاوار تائید غمیش دیدہ

اورنگزیب کی یہ شادی بڑے تزک واحتشام سے انجام پذیر ہوئی۔ شاہجہاں نے اپنے ہاتھوں سے سہرا باندھا تھا۔ قاضی چار لاکھ مہر پر اورنگزیب کا نکاح پڑھایا تھا۔ سہرے اور قصیدے پر ہمارے دور کے اہل علم نے غور نہیں کیا جو محنت جدیدیت مابعد جدیدیت۔ ساختیات پس ساختیات تشکیل در تشکیل کے اجاگر پر کی گئی ان پر ہوئی ہوتی تو اردو داں طبقے کو کچھ جاننے پڑھنے کا موقع ملتا۔ جب مغل دور پر زوال آیا تو امراء بھی اس سے بچ نہ سکے۔ پھر آپسی رسہ کشی، آپسی چشمک، سازشیں، وفاداریاں بدلنے کا دور شروع ہوا۔ اور ساری چیزیں ڈھیرے ڈھیرے دم توڑتی گئیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ لاکھ مغل دور زوال پذیر ہوا۔ شہزادے شہزادیاں اپنے ذوق اور

مذاق کالحاظ وخیال رکھا کرتے۔ برجستہ شعر کہنا یا کسی شاعر کا شعر پسند آجائے تو اسے نوازنا ان کا خاصہ رہا اور ان کی یہ قدر دانی ان کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کرتا ہے۔ شاہجہاں کی چاروں لڑکیوں میں جہاں آرا پہلی لڑکی تھی، اس کی تعلیم و تربیت کا شاہجہاں نے خاص نظم کیا تھا۔ اس نے تعلیمی تکمیل کے بعد مونس الارواح نامی مشہور کتاب لکھی۔ وہ نہایت عمدہ اور ستھرا شاعری کا مذاق رکھتی تھی۔ ایک بار جہاں آرا شاہی باغ کے سیر کے لئے ہاتھی پر ہودہ مع عماری کے کسوا کر نکلی۔ پردہ ڈال کر بیٹھی کہ کسی غیر کی نظر نہ پڑے اس دور کا ایک مشہور شاعر صیدی طہرانی چھپ کر دیکھنے لگا جب دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ پاکیزہ باوقار حسن جمال دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ جب ہاتھی اس کے پاس سے گذرا تو بے ساختہ اس کے منہ سے یہ شعر نکل گیا:

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش — تانکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

جہاں آرا نے جب یہ شعر سنا تو حکم دیا کہ اس گستاخ شاعر کو حاضر کیا جائے۔ جب اسے کھینچتے ہوئے جہاں آرا کے حضور لایا گیا تو اس نے اس شعر کو پھر سے پڑھنے کو کہا۔ جب صیدی طہرانی شعر پڑھ چکا تو جہاں آرا نے حکم دیا کہ اسے پانچ ہزار شاہجہانی سکے عطا کئے جائیں اور سختی سے یہ حکم بھی دیا کہ اس گستاخ شاعر کو فوراً شہر بدر کیا جائے کہ مجھے اس کے شعر تو پسند آئے مگر یہ گستاخی پسند نہیں آئی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کی بے حد عقیدت مند تھی۔ جب اس دار فانی سے کوچ کر گئی تو خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہی دربار میں نیند ابدی سونا پسند کیا۔ اس کا مزار سنگ مرمر کا ہے تعویذ سبزہ سے ڈھکا ہے۔ اور اسی مناسبت سے یہ شعر بھی کندہ ہے:

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا — کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

شادی بیاہ کے موقعے پر امیر خسرو نے بہت سے گیت لکھے ان کے بابل کے گیت کافی مشہور رہے ہیں۔ دولہا جب بارات لے کر سسرال آتا ہے۔ سر بنے کے سونے کا سہرا۔

لڑیاں لگے ہیرے لال بنے کو میں جانے نہ دوں گی
ساسو جوگنیا کے دیس بنے کو جانے نہ دوں گی
گہری ندی کے پار بنے کو جانے نہ دوں گی

جب دلہن رخصت ہو رہی ہے اس وقت تمام اہل خانہ عزیز و اقارب نمدیدہ اور غمگین ہو جاتے ہیں تو عورتیں گاتی تھیں:

جا جگ جگ جئے میرا بھیا بیرن بھیا۔
بھیا اماں کا سنگ مت چھوڑیو کہ ہم بڑی دور بسے ہیں۔
اک کوس گئے دوئے کوس گئے ارے تیسرے میں۔
پردا اٹھائی جب دیکھا میرا وا بڑی دور بسے جی۔
بھیا اماں کا سنگ مت چھوڑیو کہ ہم بڑی دور بسے جی۔

یہ گیت سن کر سننے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ آج کے اس مشینی دور میں یہ باتیں کچھ عجیب سی لگتی ہیں۔ پہلے غیر مسلم برادریوں میں بھی جب شادی بیاہ کا موقع ہوتا تو وہ لوگ بھی کافی دھوم دھام سے

مناتے تھے۔ شادی کی رسوم کی ادائیگی کے بعد برات ایک روز مزید قیام کرتی تھی اسے مرجاد کہتے تھے دونوں طرف کے لوگ آمنے سامنے اپنی اپنی مجلسیں لگا کر بیٹھتے تھے پھر ایک طرف سے ایک آدمی کھڑا ہوتا کچھ اشعار پڑھتا پھر جواب مانگتا تو دوسرے طرف جواب دیا جاتا تھا۔ جس میں طنز و مزاح لطیفے اور من پسند باتیں کی جاتی تھیں۔ اسے جن واسا کہتے ہیں۔ اسی طرح یوپی کے کسی رئیس کے یہاں شادی تھی لوگ باگ جمع تھے مجلس جمی تھی شادی کے اس رونق میں چھوٹے بڑے سب شامل تھے۔ اسی مجلس میں ایک طرف سے مشہور زمانہ طوائف جو نہایت حاضر جواب تھی مشتری آئی تھی لڑکے والوں نے اس زمانے کے مشہور میراثی سجان رائے کی خدمات حاصل کی تھیں جب مجلس جمی تو دونوں طرف کے لوگ نہایت اشتیاق سے ان دونوں کی حاضر جوابی کے لئے جمع تھے۔ جب مشتری اس مجلس میں آئی تو حاضرین اس کے آؤ بھاؤ تاؤ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ابھی لوگ مشتری کے دیکھنے کا شوق پورا بھی نہ کر پائے تھے کہ سجان رائے فوراً اٹھا اور بولا کہ:

حمل ہے مشتری کو کہ بچہ ہوا چاہتا ہے

مشتری نے فوراً جواب دیا:

کرو کرتے ٹوپی کا فکر بھیا
کہ بھانجا تمہارا ہوا چاہتا ہے

محفل لاجواب ہوگئی۔ دھیرے دھیرے لوگوں کا مذاق بدلتا گیا۔ لوگ اسی حساب سے محفلیں سجانے لگے۔ مغل دور اہل علم امراء اور روساء کے دربار میں رہا کرتے تھے جو اپنے علمی جوہر کے کمال دکھلاتے تھے اپنی شعری وفکری صلاحیتوں کے جوہر بکھیرتے تھے۔ شادی بیاہ میں جب سہرے کا چلن عام ہوا تو گلدستے کی شکل میں شائع کروا کر لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ جب میں میرٹھ میں تھا ایک ملنے والے تھے حفیظ اللہ بھائی ان کے بھائی کی شادی میں مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ عمدہ سہرا مختلف شعراء سے لکھوا کر گلدستے کی شکل میں شادی کے وقت پیش کیجئے۔ چاہے جو خرچ لگے۔ میں نے میرٹھ میں ہی ایک شاعر نورتقی نور صاحب کے در دولت پر حاضری دی انہوں نے وقت مقررہ پر ایک عمدہ گلدستہ شائع کروا کر دے دیئے۔ جو خرچ انہوں نے بتلایا اسے ادا کر دیا گیا تھا۔ آج جو مدیر شہر امام اعظم صاحب نے اس صنف کے تن مردہ میں جو روح پھونکی ہے کاش اس سے پہلے کے ادبا ناقدین اس پر توجہ دیتے تو نتیجہ بہتر سامنے آتا بہت سی ادبی ہستیاں ایسی ہیں جنہیں ہم نے ترقی پسندی کے مزار پر حاضری دیتے دیکھا۔ پھر انہیں سینگ کٹا کے جدیدیت کے بچھڑوں میں شامل ہوتے دیکھا۔ اب بیشتر مابعد جدیدیت کا ورد اونگھتے کرتے دیکھے جا رہے ہیں۔ سہرا۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ ان جملہ صنف پر محقق حضرات کی عام محنت ہوتی تو ہم لوگوں کو کچھ پڑھنے اور جاننے کو ملتا۔ اکبر کے دربار میں جشن نوروز کے موقع پر فیضی نے جو قصیدہ پڑھا اس کا کمال فن یہ تھا کہ ہر شعر میں تاریخ جشن نوروز نکلتا جب غالب نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے کے جشن نوروز میں قصیدہ پڑھا تو ذوق کیوں خاموش رہتے۔

قارئین حضرات! میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ امراء اپنے اپنے ذوق و مزاج کے حساب سے اپنی محفلیں سجاتے تھے اور جشن مناتے تھے۔ صاحب بہادر انگلشیہ کے دور میں راجے مہاراجے اور زمینداروں کا

عروج رہا کیوں کہ ان لوگوں کی وفاداریاں انگریزوں کے ساتھ رہتی تھیں اسی دور میں طوائفوں اور میراثیوں کا عروج رہا۔ ان کی شان وشوکت کا مثال نہیں تھا۔ بہت سے راجے مہاراجے اپنے اپنے بچوں کو مشہور زمانہ طوائفوں کے یہاں آداب وتہذیب کی تربیت لینے بھیجے جاتے تھے موجودہ مہاراجہ کران سنگھ کے والد مہاراجہ ہری سنگھ کے دربار میں ملکہ پکھراج کا خاص درجہ تھا۔ بیگم اختر جو کبھی اختری بائی فیض آبادی کہلاتی تھیں کبھی نظام حیدر آباد کے دربار سے وابستہ رہیں پھر بعد میں نواب رامپور کے دربار میں رہیں۔ مشہور زمانہ فلم ایکٹرس سائرہ بانو کی نانی شمشاد بیگم عرف چھمیا چاندنی چوک دلی کی بہت مہنگی طوائف رہی ہیں۔ ان کی بیٹی پری چہرہ نسیم کے شباب کا دور آیا تو کئی راجے مہاراجے اور نوابین طلبگار ہوئے مگر کامیابی نظام حیدر آباد کو ملی۔ جب ماں بیٹی نظام حیدر آباد کے دربار میں گئیں تو ان کی شاندار پذیرائی ہوئی۔ اور ان کے آرام وآسائش کا اعلیٰ نظم تھا۔ مگر گھاٹ گھاٹ کی پانی پینے والی چڑیوں کا من نہیں لگا لیکن نظام حیدر آباد کی ریاست سے نکل کر بھاگنا جوئے شیر سے کم نہیں تھا لیکن شمشاد بیگم چھمیا نے ایک خطیر رقم دے کر ایک موٹر والے کو طے کیا پھر چھپ چھپا کے یہ ماں بیٹی بھاگنے کو تو بھاگ نکلیں مگر نظام کے لوگوں کو اس کا پتہ چل گیا ان لوگوں نے موٹر سے ہی پیچھا کیا بھاگنے دوڑنے میں دونوں فریق نے جان کی بازی لگادی آخر ایک جگہ نظام کے لوگوں نے انہیں پکڑا وہ نظام کی ریاست میں نہیں آتی تھی وہ بمبئی کے نزدیک آگئی تھیں وہاں گورے فوجی والی بال کھیل رہے تھے جب انہوں نے دیکھا تو فوراً دوڑے نظام کے لوگوں کو پیٹ کر بھگا دیا اور یہ ماں بیٹی بچ گئیں۔ لوگ باگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ نرگس کی گوہر عصمت کو نواب پالن پور نے پہلے داغ دار کیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ راجے مہاراجے بھی اپنے اپنے ذوق کے ساتھ مجلسیں لگاتے تھے اور جشن مناتے تھے مہاراجہ بتیا۔ مہاراجہ ہتھوا۔ راجہ مدھوبن، راجہ رام نگر یہ لوگ بھی سال میں جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے میراثیوں سے سوال جواب کراتے تھے اور مزے لیتے تھے جو میراثی بہتر جواب دیتا اسے کافی انعام واکرام سے نوازا جاتا۔

ایک جشن میں مہاراجہ ہتھوا کے میراثی نے تمام راجگان کی موجودگی میں کہا: ''جگت جہاز اور سب ڈینگیں۔'' ہتھوا کے مہاراجہ کا نام جگت سنگھ تھا ڈینگیں چھوٹی ناؤ کو کہتے ہیں۔ جب اس نے تمام راجگان کے سامنے پھر پڑھا تو تمام راجے مہاراجے خاموش اور ہتھوا کے مہاراجہ خوش تھے اس کے کہنے کا مطلب تھا کہ میرے راجہ جگت کافی وسعت والے ہیں ان کے یہاں کافی لوگ جیتے ہیں ان کے مقابلے میں دوسرے راجگان چھوٹے ہیں۔ جب دوسرے دور کا آغاز ہوا اور مہاراجہ جگت کے میراثی نے پھر کہا کہ جگت جہاز اور سب ڈینگیں۔ تو بتیا راجہ کے میراثی جواب دینے کے لئے اٹھا بتیا راجہ بیسین راجپوت تھے اس نے فوراً جواب دیا: ''چڑھیں بیسین تو بھاگے جگ کے پینڈی۔'' تہلکہ مچ گیا بتیا مہاراجہ نے کافی نوازا۔ اس میراثی کو زمینیں معافی میں دیں۔ ان میراثیوں کو ادھر کی زبان میں بھانٹ کہتے ہیں۔ یہ اتنے ذہین اور قابل ہوتے تھے کہ انہیں حافظ شیرازی، عرفی، جامی کے سینکڑوں اشعار زبانی یاد رہتے۔ بعض ایسے میراثیوں کو میں نے کیا کوشی نگر میں دیکھا جو جونپور کے رہنے والے تھے۔ آغا حشر کاشمیری کے کئی کئی ڈرامے حفظ تھے۔ لفظوں کی ادائیگی اور بولنے کا انداز سننے کے قابل ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے لوگوں کا شوق اور ذوق بدلتا گیا۔ کہاں تو پہلے لوگوں کا ذوق یہ ہوتا تھا کہ شعراء سے اشعار کہلواتے لوگ باگ ایک ایک شعر پر سر دھنتے تھے۔ اب کہاں یہ ذوق بنتا گیا کہ میراثیوں اور طوائفوں کو بلواتے

ہیں اوران سے کہنے کہلانے کا مقابلہ آرائی کراتے ہیں ان کی فحش کلامی پسند کرتے ہیں اور مزے لے لے کر داد دیتے ہیں۔ مشرقی یو پی کے ضلع دیوریا اب ضلع کوشی نگر میں کسیا کے اطراف میں راجپوت زمینداروں کی ایک بستی ہے کرموتہ اسٹیٹ ایک بابو صاحب کے یہاں لڑکی کی شادی تھی۔ برات بھی بنارس سے آئی تھی۔ برات بہت دھوم دھڑاکے سے آئی تھی شان وشوکت کا یہ عالم تھا کہ دور سے ہی لڑکی والوں کے گھر تک خاص ناچنے گانے والوں کا ایسا نظم تھا کہ رقاص اور رقاصائیں طرح طرح کے اپنے رقص کا مظاہرہ کرتے لڑکی والے کے گھر تک پہنچے۔ برات کا استقبال ہوا شادی کی جملہ رسوم کی ادائیگی ہوئی براتیوں کی بہتر خدمت کی گئی برات کی خاطر مدارات کے بعد جب رات میں مجلس جمی تو طوائفوں نے اپنے رقص کے جادو جگانے شروع کر دیے۔

لڑکے والوں نے مظفر پور کی بھی کی مشہور زمانہ طوائف منیرن کی خدمات حاصل کی تھیں جو خود بھی ہیجان انگیز رقص کرتی اور اس کے طائفے میں خوش گلو اور مہ پاراؤں کی ایسی ترتیب تھی کہ ان کے فن کو دیکھ کر ناظرین دل تھام کر رہ جاتے۔ منیرن جب محفل میں جلوہ سرا ہوتی تو اس کا سراپا دیکھ کر اچھی اچھی ہستیاں دل تھام کر رہ جاتیں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدن والی کیفیت ہو جاتی۔ وہ نہایت منہ پھٹ اور بے حد حاضر جواب بھی تھی...... جب محفل جمتی...... منیرن محفل میں آتے ہی کہتی: آداب عرض ہے، آداب عرض۔ بندی کو امی جان کہتے ہیں۔ پھر ایک طرف سے مجمعے کا ہوش ربا انداز میں جائزہ لیتی اور کہتی کہ آداب عرض ہے، بندی کو، مادر جان کہتے ہیں، مادر جان، آداب عرض ہے، بندی کو سب مادر جان کہتے ہیں، مادر جان۔ کسیا میں بال باڑی جونیئر ہائی اسکول میں اردو کے ایک استاد تھے بابو مہادیو سنگھ۔ وہ جوک میں کئی جگہ گورنمنٹ سے میڈل پا چکے تھے یو پی مدھیہ پردیش اور بھی کئی جگہوں سے جوکنگ کے لیے ایوارڈ اور تمغہ پا چکے تھے انہیں بہت سے شعراء کے اشعار زبان زد تھے آغا حشر کاشمیری کے کئی ڈراموں کو حفظ کر چکے تھے ان کے پڑھنے کا انداز۔ لفظوں کی ادائیگی کا طریقہ دیکھنے اور سننے کے لائق ہوتا لڑکی والوں نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جیسے ہی مجلس میں منیرن اپنے طائفے کے ساتھ اتری۔ اور بولنا شروع کر دیا وہ جب بولتی تھی تو اس کی عشوہ طرازیوں میں لوگ کھو جاتے۔ لوگ ابھی اس کی عشوہ طرازیوں کا مزہ لے ہی رہے تھے کہ وہ اٹھلا کر کہنے لگی کہ آداب عرض ہے، بندی کو مادر جان کہتے ہیں، مادر جان، آداب عرض ہے، بندی کو لوگ مادر جان کہتے ہیں مادر جان۔ آداب عرض ہے۔ بندی کو لوگ مادر جان کہتے ہیں مادر جان۔ دفعتاً اس کے سامنے بابو مہادیو سنگھ جا کھڑے ہو گئے اور اس کے طرف دھیرے دھیرے بڑھنے لگے اور کہنے لگے آداب عرض ہے آداب عرض۔ بندے کو لوگ مادر...................... کہتے ہیں مادر...................... کہتے ہیں...... آداب عرض ہے۔ اس حاضر جوابی پر مجمع میں تہلکہ مچ گیا لوگوں نے اپنی گود میں اٹھا لیا پوری مجلس میں ان کو گھمایا گیا لوگوں نے انہیں کافی انعام واکرام سے نوازا۔ ایک ذوق لوگوں کا یہ بھی ہے۔ حالاں کہ اس محفل میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہستیاں بھی تھیں۔ الہ آباد یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات بھی تھے۔ قدریں بدل رہی ہیں لوگوں کا ذوق بدل رہا ہے اپنے اپنے مزاج ومذاق کے تحت لوگ جی رہے ہیں اور اہل علم بجائے محنت اور کوشش کے اپنی اپنی زندگی کے پسندیدہ چیزوں کی جلا میں لگے ہیں:

محو حیرت ہوں کہ یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ-۴ (بہار)

زندگی کے تلخ حقائق کا شاعر: احمد فراز

احمد فرازؔ اردو شاعری کے ایک ایسے ستون تھے جس نے اردو شاعری کو کلاسیکیت سے جدا نہیں ہونے دیا اور نئے ذائقہ سے ہمکنار بھی کیا۔ کہنے کا انداز اتنا رواں دواں سادہ اور مکالماتی ہوتا تھا کہ غزل میں ڈرامائی رنگ ابھرنے لگتا تھا۔ ایسا لگتا ہے غزل نہیں کہہ رہے ہوں گفتگو کر رہے ہوں۔ ان کی شاعری کا کوئی دوسرا نثری بدل نہیں ہوسکتا جس طرح نثر میں شاعرانہ حسن پیدا کرنے کے لئے شاعری کی جاتی ہے، شاعری کے ہنر اپنائے جاتے ہیں اسی طرح انہوں نے شاعری کی ہے۔ جس کی دوسری نثر نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ ملکہ بہت کم شعرا کے اندر پایا جاتا ہے۔ عشق کی معاملہ فہمی اور زندگی کے تلخ حقائق کے بیان کی آمیزش ان کے یہاں اس طرح ہے کہ غزلوں میں زندگی اور عشق دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہوجاتے ہیں۔ احمد فراز کی یہی خوبی ان کو منفرد بنادیتی ہے۔ ان کے عہد کا کوئی دوسرا شاعر اس انداز میں کہنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ ان کے اپنے اسلوب تھے جو شعری قالب میں ڈھل گئے۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا نے ایک ایسا شاعر کھو دیا جو ماضی و حال کی کڑی کی حیثیت رکھتا تھا جس سے کلاسیکی اور نئے زمانے کے تقاضوں کے درمیان جو حائل خلیج تھی اس کو پاٹ دیا تھا۔ احمد فراز نے روحانیت کو صحیح معنوں میں برتنے کی کوشش کی اور زندگی کے وہ نازک گوشے جو زندگی کے ہر موڑ پر ہر عمر میں کچھ کے دیتے ہیں ان زخموں پر مرہم بھی لگایا ہے اور اتنا ہی نہیں یاد ماضی کو بھی تازہ کردیا ہے:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب   چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

لیکن اس عذاب میں ایک لذت ہوتی ہے آدمی بھلانا بھی چاہتا ہے اور نہیں بھی بھلانا چاہتا ہے۔ احمد فراز کی شاعری کو پڑھ کر ایک معجزہ جاتی احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ تمام پردے حقیقت کے کھل رہے ہوں جو روحانیت کے راستے سے گذر جاتے ہوں۔ ایک انجانا سا احساس، ایک انجانی سی لذت جو لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی احمد فراز کی شاعری کو پڑھ کر اور سن کو ہوتا ہے۔ زندگی کی گہری باتیں جس رومانیت کے لہجہ میں بیان کی گئی ہیں ان کو سمجھنے کے لئے ایک اہل دل چاہئے۔ احمد فراز اسی لئے ایک بڑے شاعر ہیں۔

دلوں میں گھر بنانے والے احمد فراز کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر میں اور بیرون ممالک میں کتنے ہی گھرانوں کی نئی پود کا نام ان کے نام پر رکھا گیا ہے۔

شاعر جتنا بھی بڑا ہو مگر اس کے اشعار اگر دل کو نہیں چھوتے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے نہیں نکلے ہیں۔ بعض شعراء کی غزلیں مشاعروں میں سننے میں اچھی لگتی ہیں لیکن پڑھنے میں اچھی نہیں لگتیں۔ بعض شعراء مشاعرہ میں اچھا نہیں پڑھتے لیکن ان کی غزلوں میں روحانی تازگی موجود رہتی ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد اس کی شگفتگی کا احساس قاری کو بھی ہوتا ہے۔ احمد فراز اس لئے مقبول رہے کہ ان کی شاعری مشاعروں کو بھی لوٹتی رہی اور پڑھنے میں بھی بے پناہ لذت سے آشنا کراتی رہی۔ احمد فراز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے

شعری غنائیت کا بھرپور اہتمام کیا ہے اور اس غنائیت سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ایک انجانے سرور سے ہمکنار کرتی ہے۔ شاعر کی یہی خوبی اس کی شاعری کو یادگار بنا دیتی ہے۔ پہلو نشاطیہ ہو یا یاسیت کا پہلو ہو بیان کی لذتوں سے اگر خالی ہے تو وہ دل کو نہیں چھو سکتا۔ احمد فراز نے مایوسی میں رجائی پہلو اور حالات کے تقاضے کو اپنے شعری پیمانہ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ رنگ و بو سے آشنائی، قدرت کی جلوہ گری، دل کے اندر اٹھتے ہوئے جذبات، احساسات کی ترنگ یہ ساری چیزیں انسان زندگی کے ہر موڑ پر محسوس کرتا ہے۔ حسن کی لذت سے آشنا، محبت کی بے پناہ ستم گری، محبت سے حاصل شدہ خوشی، ہجر و وصال کے لمحے تمام کی تمام چیزیں اپنے طور پر انسان کی زندگی میں رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن ایک شاعر کا دل اس کو محسوس کرتا ہے اور اسے اپنی شاعری میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کے لئے اہل زبان ہونا ضروری نہیں۔ احمد فراز جن کی مادری زبان پشتو تھی ان کی شاعری میں بھی لفظوں کی بندش، احساس کی گرفت اور کیفیات کی جھنکار آپ محسوس کر سکتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ لکھنؤ کی سرزمین پر پیدا نہیں ہوئے، ان کی شاعری کی روانی، دلکشی، بے پناہ احساس کی ترنگ کی رواں دواں لہریں ان کی شعریات میں بکھری پڑی ہیں۔ وہ کسی ازم سے متاثر نظر نہیں آتے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا جو کچھ محسوس کیا بالخصوص واردات قلب کو جس خوبصورتی سے پرویا ہے ان کے کسی ہم عصر شاعر میں یہ لہجہ، یہ اسٹائل موجود نہیں ہے۔ وہ منفرد اور نئی آواز کے ساتھ اپنی نئی پہچان بنانے میں کامیاب و کامران رہے ہیں۔ ان کے یہ اشعار اس بات کی کھلی دلیل ہیں:

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ
آ، پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تم مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑگئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

وہ مروت سے ملا ہے تو جھکادوں گردن — میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں — سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کو بھی ہے شعر وشاعری سے شغف — سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں — یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے — ستارے بامِ فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں — سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے — کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت — مکیں اُدھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں
رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں — چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں
اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں — فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل — کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

اس نے سکوتِ شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا — ہجر کی رات بام پر ماہِ تمام رکھ دیا
اس نے نظر نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے — میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا
اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے — ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

شعری ڈکشن بدلتے ہیں لیکن دل کا معاملہ اور معاملات فہمی اپنی جگہ الگ الگ انداز میں بیان ہوتے ہیں اور یہی انداز کسی شاعر کو منفرد بناتا ہے۔ جس طرح احمد فراز کی شعریات۔ ان کے شعری غنائیت کے ساتھ ساتھ ان کے شعری فارم کے تجربے بھی قابل لحاظ ہیں۔ ان کی نظمیں اپنے دور کی عکاسی کرتی ہیں لیکن کہیں بھی اظہار کا براہ راست وسیلہ نہیں اپنایا ہے اور شعری محاسن اپنی جگہ مسلم ہیں۔ ان کی نظم ''انتساب'' کا ایک حصہ دیکھئے:

یہ تحریریں/ ہماری آرزومندی کی تحریریں
بہم پیوستگی اور خواب پیوندی کی تحریریں/ فراق و وصل و محرومی و خورسندی کی تحریریں
ہم ان پر منفعل کیوں ہوں/ یہ تحریریں/ اگر اک دوسرے کے نام ہو جائیں
تو کیا اس سے ہمارے فن کے رسیا/ شعر کے مداح
ہم پر تہمتیں دھرتے/ ہماری ہمدمی پر طنز کرتے
اور یہ باتیں/ یہ افواہیں/ کسی پہلی نگارش میں
ہمیشہ کے لئے مرقوم ہو جاتیں
ہماری ہستیاں مذموم ہو جاتیں

نہیں ایسا نہیں ہوتا / اگر بالفرض ہوتا بھی
تو پھر ہم کیا / سبک ساران شہر حرف کی چالوں سے ڈرتے ہیں؟
سگانِ کوچہ شہرت کے غوغا
کالے بازاروں کے دلالوں سے ڈرتے ہیں
ہمارے حرف جذبوں کی طرح
سچے ہیں، پاکیزہ ہیں، زندہ ہیں
گر ہماری قبر کے کتبے
تمہارے اور ہمارے نام سے منسوب ہو جاتے!

ان کی نظم ''سرحدیں'' بھی بے حد مقبول ہوئی اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیں:

روم کے بت ہوں کہ پیرس کی ہو مونالیزا — کیٹس کی قبر ہو یا تربتِ فردوسی ہو
قرطبہ ہو کہ اجنتا کی موہنجو داڑو — دیدۂ شوق نہ محرومِ نظر بوسی ہو

کس نے دنیا کو بھی دولت کی طرح بانٹا ہے — کس نے تقسیم کئے ہیں یہ اثاثے سارے
کس نے دیوار تفاوت کی اٹھائی لوگو — کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے پیاسے

ان کے علاوہ ''چلو اس شہر کا ماتم کریں''، ''نئی مسافت کا عہد نامہ''، ''ہم اپنے خواب کیوں بیچیں''، ''اے میرے سارے لوگو''، ''محاصرہ''، ''مت قتل کرو آوازوں کو''، ''ابو جہاد''، ''اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں''، ''حرف کی شہادت'' وغیرہ نظموں میں ان کی فکری اور شعری ٹریٹمنٹ کی غمازی ملتی ہے۔

احمد فراز کی نذر راقم السطور (ڈاکٹر امام اعظم) کی درج ذیل غزل ملاحظہ فرمائیں جس میں ان کے انتقال کے بعد جو تاثرات ابھرتے ہیں وہ انہی کی زمین میں موجود ہیں جو ان کی اہمیت کی نشاندہی کرتی ہیں:

تمہارے جاتے ہی ہر دیدہ تر کو دیکھتے ہیں — وہیں ہیں ماتم غم ہم جدھر کو دیکھتے ہیں
فراز ہو گئے رخصت ہوا ہے سناٹا — اداس اداس ہم شعری سفر کو دیکھتے ہیں
کہاں وہ عشق جواں کی ٹھہر گئیں کرنیں — رکی رکی ہوئی بامِ سحر کو دیکھتے ہیں
سنا ہے فیض سے آگے نکل گئے تھے فراز — غزل کے سوز دروں کے اثر کو دیکھتے ہیں
سنا ہے اس نے غزل کا بدل دیا لہجہ — اسی زمین کی ہم رہگزر کو دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کی غزل کا بڑا کرشمہ تھا — اسی دیار کے جادو نگر کو دیکھتے ہیں
وہ جب رہا تو بجی غمزدوں کی بزم سخن — سنا ہے لوگ اب اس کے ہنر کو دیکھتے ہیں
کہاں فراز کہاں اعظمِ شکستہ جاں — ذرا سی چل کے ہم اس کی ڈگر کو دیکھتے ہیں

احمد فراز کی شاعری ترسیل وابلاغ کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے اور اسلوب نگارش، کلاسکیت اور روایت سے قریب تر ہے۔

یونس حسن (قصور)

شاعر علی شاعر کے ناولٹ اوران کے اہم زاویے

اُردو ناولٹ کی تاریخ میں جن ناولٹ لکھنے والوں نے اپنی ایک الگ شناخت اور پہچان بنائی، ان میں ایک اہم اور معتبر نام شاعر علی شاعر کا بھی ہے۔

شاعر علی شاعر کے اب تک پانچ ناولٹ چھپ چکے ہیں۔ ان ناولٹوں میں ''خود فریبی'' ''دلاسہ'' ''وجود کے زخم'' ''جانور سے سبق'' اور ''کالی دنیا'' شامل ہیں۔ یہ ناولٹ اپنی جدت طرازی، موضوعاتی تنوع، تخیل کی رفعت وبلندی اور حقیقت پسندی کے حوالے سے اپنی ایک الگ شناخت اور پہچان رکھتے ہیں۔ ان کا موضوع براہِ راست انسان اور اس کی زندگی کی تلخ حقیقتیں اور سچائیاں ہیں۔ اس نے ان کے ذریعے زندگی کی جو تصویریں دکھائی ہیں وہ جہاں نہایت دلخراش ہیں وہاں انسانی سوچ کے متنوع زاویوں کو اُجاگر کرتی ہیں۔ یہ سوچ کیسے حالات و واقعات کے بدلنے کے ساتھ تبدیل ہوتی ہے؟ اور اس کی فطرت اور رذالت اور گھٹیا پن کھل کر سامنے آجاتا ہے اور قاری جب انسانی سوچ اور اس کی حفاظت کے یہ روپ اور اشکال دیکھتا ہے تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے اپنے حواس پر یقین نہیں آتا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ درست اور حقیقت پر مبنی ہے۔ شاعر علی شاعر کے ناولٹوں کے مطالعے سے ہمارے سامنے ایسی ہی ان گنت سچائیاں اُبھرتی ہیں۔

شاعر علی شاعر سچوایشن اور حالات کے مطابق کردار تخلیق کرتا ہے اور انہیں حقیقت کا روپ دیتا ہے۔ وہ سچوایشن اور حالات جن کا ہمیں روز مرہ زندگی میں روز واسطہ پڑتا ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی شاعر علی شاعر کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ جیتے جاگتے انسانوں کی زندگی میں پہلے خود جھانکتا ہے۔ ان کا گہرائی میں جا کر مطالعہ اور مشاہدہ کرتا ہے۔ خصوصاً انسانی نفسیات کی تہ در تہ پیچیدگیوں کو سمجھ کر ان کی حقیقت سے پردہ اُٹھاتا ہے اور کرداروں کی اصلیت لے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ناولٹوں کا ہر کردار ایک زندہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یہ اسلئے بھی ہمیں بھی متاثر کرتا ہے کہ ان کا خمیر ہماری معاشرتی اور تہذیبی اُٹھا ہے۔ ہم فطری طور پر ان سے مانوس ہیں۔ ان کی زندگی ہمارے سامنے آئینے کی طرح ہے ان کا تعلق کسی مافوق الفطرت یا ماورائی دنیا سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کرداروں کے اندر ہمیں اپنی ذات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے آج کے سماجی سیٹ اپ، کلچر، ثقافت اور تہذیبی زندگی سے وابستہ اور جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مصائب اور الیے ہمیں اپنی ذات کے محسوس ہوتے ہیں۔ اگر گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ تو ہماری زندگی کی کوئی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ زندگی کی مشکلات اور مصائب سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اور غالب آنے کی بجائے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ان سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ خیال بھی تقویت دیتا ہے کہ انہوں نے مقابلہ کرتے ہوئے شکست کھائی ہے اور میدان عمل سے راہ فرار اختیار نہیں کی۔

ہم اس کے ناولٹوں میں زندگی کے ان گنت رنگوں کو اُبھرتا ہوا دیکھتے ہیں، یہ وہ رنگ ہیں جن سے آج

انسان جڑا ہوا ہے۔ ناولٹ ''جانور سے سبق'' کی ''نہار''، ''زیبو خالہ''، ''بلقیس آپا''، ''ذکیہ'' اور ''ماہ نظیر'' کے درمیان ہونے والا مکالمہ ''دلاسہ'' میں قاسم ''خوندکر''، ''شہناز بیگم''، ''کمال'' اور ''شمی'' کے درمیان ہونے والی گفتگو ''خود فریبی'' کی ''روبی''، ''زمرد''، ''نیلم باجی''، ''پکھراج''، ''یاقوت'' اور عنبری کے درمیان ہونے والی بات چیت، انھی حوالوں کو سامنے لاتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ گفتگو اور مکالمے انسانی نفسیات کی مختلف جہات کو سمجھنے کے حوالے سے بھی اہم ہیں۔

منٹو کی طرح شاعر علی شاعر نے بھی جنس کے پہلو کو اپنے ناولٹوں کی اساس بنایا ہے۔ وہ جنس اور اس کی حقیقت کو محض روایتی انداز سے دیکھتا اور پرکھتا نہیں بلکہ گہرائی میں جا کر اس کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا ہے اور پھر نتائج اخذ کرتا ہے۔

اپنے ناولٹوں کے ذریعہ شاعر علی شاعر نے بنگلہ دیشی عورتوں کی زندگی کی بھی کتھا بیان کی ہے۔ یہ عوتیں کیسے معاشی بدحالی اور مفلسی میں گھر کر جسم فروشی پر مجبور ہو جاتی ہیں؟ اور کوٹھوں کی زینت بن جاتی ہیں، کیسے پیٹ کی آگ انہیں بکنے پر مجبور کر دیتی ہے؟ کیسے ساہوکار اور بنیے ایک جنس کی طرح ان کی بولی لگاتے ہیں اور ان کا سودا کرتے ہیں؟ اور ہر رات انہیں اپنی جسمانی ہوس اور درندگی کا نشانہ بناتے ہیں اور یہ سلسلہ کچھ اس طرح چلتا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ شاعر علی شاعر نے ان عورتوں کی بدحالی کے ساتھ ان کے معاشی و معاشرتی استحصال اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کی جو تصویریں دکھائی ہیں وہ نہایت دلخراش اور ہولناک ہیں۔ جس کو دیکھ کر انسان کانپ جاتا ہے۔ ان کے ناولٹ ''خود فریبی'' کی ''زمرد''، ''پکھراج''، ''روبی''، ''یاقوت''، ''عنبری'' ایسی ہی بے بس اور افلاس کا شکار لڑکیاں ہیں، جن کو ''سونا میاں'' اور ''نجم میاں'' جیسے مرد اپنی جسمانی ہوس کا نشانہ بناتے رہتے ہیں اور ان کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ یہ ایسے مرد ہیں جو ہر روز نئے مال کی تلاش میں نکلتے ہیں اور روزانہ ایک بے بس لڑکی ان کی جھولی میں گر جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس سماج میں ہو رہا ہے جہاں پر طاقت اور پیسے کی حکمرانی ہیں، جہاں انسانی عزت اور وقار کی کوئی قیمت نہیں۔ عورت کا بطور ماں، بہن، بیوی کے کوئی تقدس اور احترام نہیں اور نہ ہی معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اور انسانی اقدار کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔

شاعر علی شاعر نے اپنے ناولٹوں میں زندگی کی رنگارنگی، اس کے حسن و جمال کے ساتھ اس کی بد صورتی کے موقع بھی دکھائے ہیں، بظاہر حسن و جمال کا پیکر نظر آنے والی اشیاء اندر سے کتنا کریہہ منظر پیش کرتی ہیں؟ کہ ان کو دیکھ کر خود انسان کو ان سے گھن آنے لگتی ہے۔ یہ سب کچھ اس کے پیش نظر رہتا ہے۔ اس تناظر میں اس نے انسانوں کی زندگی کی بھی مثالیں پیش کی ہیں جن کا ظاہر اور باطن ایک نہیں۔ شرافت اور پارسائی کے لبادوں میں ان کے رذیل اور مکروہ چہرے چھپے ہوئے ہیں۔ لوگ ان کے ظاہری خدوخال سے ان کے دھوکے میں آ رہے ہیں لیکن جب ان کو ان کی اصلی صورت اور شکل نظر آتی ہے تو انہیں ان سے نفرت ہو جاتی ہے۔ ناولٹ ''کالی دنیا'' کے مردانہ اور زنانہ کردار اس کی واضح مثال ہیں۔ ان کرداروں کے ظاہری اور باطنی تضادات ان کی اہلیت کو کھول کر رکھ دیتے ہیں، ان کے تمام بہروپ کے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور ان کا اصلی چہرہ سب کے

سامنے آجاتا ہے۔

''کالی دنیا'' کی کہانی اور ان کے کرداروں کا مطالعہ کر کے ہم شاعر علی شاعر کی فکر اور حقیقت سے آگہی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ ان کے ذریعے کیا پیغام دینا چاہتا ہے؟ اور کیا سمجھانا چاہتا ہے؟ وہ غور طلب ہے؟ وہ ہمارے سامنے ایسی دنیا کے کیوں مرقعے پیش کرتا ہے؟ کا اس لئے کہ ہم تصویر کے دونوں رخ دیکھ سکیں۔ انسان اور اس کی نفسیات، اس کے جنسی میلانات، اس کے ابنارمل رویوں اور رجحانات کی تہ تک پہنچ سکیں؟ مزید یہ کہ کسی سراب کے تعاقب میں دور نکلنے کی بجائے اپنے اردگرد کی حقیقتوں اور سچائیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ وہ سچ ہے جو ہمیں شاعر علی شاعر کے تمام ناولوں اور ان کے کرداروں میں نظر آتا ہے اور اسی سے ان کے ناولوں میں انفرادیت آئی ہے اور قارئین کے ایک وسیع حلقے میں ان کی پذیرائی اور مقبولیت ہوئی ہے۔

حافظ منشی عبدالغفور، فاطمہ مدرسہ انوار القرآن نعمت پور، سہارنپور

حامیانِ اُردو کی خدمت میں

دعوتِ فکر و عمل

اُردو ہندوستانی زبانوں میں سے ایک اہم زندہ وجاوید، دلکش وشیریں، خیر سگالی، اتحاد پسندی، رواداری، آشتی اور انسانیت سے عبارت بھائی چارہ کی زبان تو ہے ہی زبانوں کی تاجدار بھی ہے، بقول ماہر تعلیم ولسانیات اور عظیم اردوداں پروفیسر گوپی چند نارنگ: ''اردو زبانوں کا تاج محل ہے۔'' یہ کشادہ دل اور وسعت نظر زبان ہے، جس کا اعتراف بھی لوگ کرتے ہیں، اس کا سب سے پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ۱۳ر مارچ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا، اردو کی پہلی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ آندھرا پردیش کی راجدھانی حیدر آباد میں ۱۹/۱۸/۱۸۱۷ء سالوں میں سے کسی بھی سال میں قائم ہوئی، آزادی سے قبل اردو ہر شعبۂ زندگی میں رائج تھی اور جنگ آزادی میں اس کا سب سے اہم اور نمایاں رول رہا ہے، آزادیٔ ہند کے ضمن میں اردو اور اردو شاعری نے جو خدمت کی ہے اس کی نظیر کوئی دوسری زبان پیش نہیں کر سکتی ''انقلاب زندہ باد'' جیسے تاریخ ساز جوش وولولہ پیدا کرنے والے نعرے نغمے اور مثالی حب الوطنی کے ترانے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' جو ذہنوں میں گونجتے اور دلوں میں ہلچل پیدا کرتے تھے، اردو کی ہی دین ہے۔ سیاسی اور تہذیبی طور پر اردو پورے ملک کے رابطے اور اتحاد و یکجہتی کی زبان ہے، یہ یہیں پیدا ہوئی یہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی لیکن اب حال اس بے چاری کا یہ ہے کہ:

اپنے گھر میں اجنبی اردو ہے آج
اہلِ اردو کاش رکھ لیں اس کی لاج

کی صحیح مصداق ہے، باہمی میل ملاپ کی مستحکم زنجیر وعلامت ہے، یہ ہماری قومی ملکی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب وتمدن کی ضامن ہے، اس کی جڑیں معاشرہ میں تہذیبی اخلاقیات اور ہندوستان کی عظیم جمہوری تاریخ میں پیوست ہیں، اردو کی معیاری اور ٹھوس تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سماج اور معاشرہ میں آج بھی اپنا ایک مقام ووقار بنا رہے ہیں اردو کا دائرہ کار ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، عالمی زبانوں میں اس کا نمبر تیسرا ہے، شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ایسا ہو جہاں اردو لکھنے، پڑھنے، بولنے اور سمجھنے والے افراد موجود نہ ہوں؛ لیکن افسوس اس پر ہے کہ آج اردو کے بڑے بڑے محقق، اُدباء، شعراء، نقاد، ومبصرین کے بچے اردو سے نہ صرف نا آشنا ہی نہیں بلکہ انہیں اردو سے کوئی سروکار بھی نہیں ہے، یہ لوگ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھانا تو دور کی بات اردو سکھاتے تک نہیں، عام طور پر نئی نسل کا اردو سے بتدریج لگاؤ کم تو ہو ہی رہا ہے، بیگانہ بھی ہوتی جا رہی ہے اور نابلد طبقہ برابر بڑھ رہا ہے، اردو کے تئیں عدم دلچسپی، بے حسی، بے توجہی کی انتہا ہو رہی ہے، اگر ہم نے اپنے بچوں تک اردو کی

وراثت نہ پہنچائی تو ہم مورد الزام ٹھہریں گے، اہل اردو کو اردو سے والہانہ تعلق ہونا چاہئے، اردو کے مایہ ناز پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے کہ مغلیہ حکومت نے ہندوستان کو تین چیزیں دیں:

(۱) اُردو (۲) غالب (۳) اور تاج محل

حال ہی میں جموں کے نامور اردو کے صاحب طرز ادیب و پروفیسر آنند لہر صاحب نے وکلاء کے ایک خاص مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو دفتروں میں ہو نہ ہو لوگوں کے دلوں میں ضرور ہے، اردو ان تمام لوگوں کی زبان ہے، جو اسے بولتے، سمجھتے اور جانتے ہیں، اس لئے نئی نسل میں اردو پڑھنے پڑھانے کا رجحان پیدا کریں، تا کہ وہ اپنی ادبی وراثت سے واقف ہو سکیں، حقیقت تو یہ ہے کہ زبانوں میں اردو نہ صرف سب سے زیادہ چاشنی والی زبان ہے، بلکہ سیکھنے میں بھی سب سے آسان ہے اردو میں جو کشش جاذبیت، جامعیت اور اختصاریت پائی جاتی ہے وہ دوسری زبانوں میں ناپید ہے، آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو آزاد بھارت کے پہلے وزیر اعظم اردو لکھتے پڑھتے بولتے تھے، ان کی مادری زبان اردو تھی موصوف کی تقریب شادی خانہ آبادی کا دعوت نامہ اردو میں مختصر اور انتہائی جامع شائع ہوا تھا، مگر افسوس کا مقام ہے کہ آج اپنے ہی وطن میں اردو بے یار و مددگار ہے، یہ تو اپنی اندرونی طاقت اور حسن و کشش کے باعث ہنوز زندہ و تابندہ ہے، حال میں بھی عوام و خواص کے ایک بڑے طبقہ کی زبان ہے، بقول عزیز برنی (ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو) آج وہی اردو جو ۱۹۴۷ء تک پورے ملک کی قومی اور رابطہ کی زبان رہی ہے، محض ایک ووٹ کی کمی کی وجہ سے قومی زبان بننے سے رہ گئی تھی گویا اب:

ظلمات کی صلیب پہ عیسیٰ بنی ہوئی
زخموں سے چور میر کی اُردو زباں ہے آج

اس لئے اردو کی اہمیت و افادیت نیز ضرورت کے پیش نظر اس کے فروغ و بقا ترویج و اشاعت کی ذمہ داری آئینی اور اخلاقی نیز ملی اور سیاسی طور پر ہم سب اہل اردو پر عائد ہوتی ہے، ہمیں یہ ذمہ داری اپنا فرض جان کر بڑی مستعدی، تندہی اور دلچسپی سے نبھانی چاہئے اردو کی ہمہ جہت ترقی اور بقا کے لئے تن من دھن سے کوشاں رہیں چوں کہ آگے آنے والی نسلوں کی اردو تعلیم و ترویج کا انحصار ہماری حال کی کوششوں پر ہے، مدارس عربیہ اردو کی فلاح و بہبود کے لئے بہت منظم اور مؤثر طرز و طریق پر کام کر رہے ہیں، ہمارے یہ مدارس پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، سب ہی محب وطن اور اردو دوست ہیں اس کی ترقی اور بقا کے لئے شب و روز کوشاں اور خواہاں ہیں، اب نہ صرف اردو والے کم ہو رہے ہیں؛ بلکہ اردو کا شوق اردو کا چلن اور اردو کا تحفظ و تلفظ بھی کھوتے جا رہے ہیں، اسکولوں میں جو بحیثیت اردو ٹیچرس لگے ہوئے ہیں وہ بھی ناقص اردو جاننے کے سبب غالب کو گالب، ذوق کو جوق، غلطی کو گلتی، ضرورت کو جرورت، حالات حاضرہ کو ہالات ہاجرہ، عارف انصاری کو آرف انساری لکھتے، پڑھتے، بولتے ہیں، گل اور غل نبات اور بنات کے تلفظ و معنی اور موقع محل میں کوئی فرق نہیں جانتے، اس لئے صحیح اردو کی ترویج و تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لئے ٹھوس اور گہری کاوشوں کی ضرورت ہے تا کہ اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ اور اس کا دائرۂ عمل زیادہ سے زیادہ وسیع ہو، اس لئے حامیان

اردو سے گزارش ہے کہ اردو کی بہرنوع تنظیم وترقی نیز اصلاحات واصطلاحات کے لئے حسب ذیل اُمور پر کمربستہ ہوکرعمل پیرا ہوں:

(۱) تجربہ ہے کہ بچوں کی علمی صلاحیتیں مادری زبان میں بسہولت اُبھرتی ہیں چوں کہ ہماری اور ہمارے بچوں کی مادری زبان اردو ہے، اس لئے اپنے بچوں کو بالخصوص ابتدائی تعلیم مادری زبان اردو میں دیں اور دلائیں۔

(۲) بچے اپنے گردوپیش اور گھریلو ماحول سے بہت کچھ سیکھتے ہیں، نئی نسل کو اردو سے روشناس کرانے کے لئے اپنے گھروں میں اردو کی تعلیم کا بہترین بندوبست کریں، گفتگو بھی صاف وشستہ اردو میں کی جائے اس طرح اردو کو گھروں کے اندر بھی جاری اور ساری رکھیں۔

(۳) اُردو اخبارات ورسائل خرید کر پڑھیں، اردو کی کتابیں خرید کر ناشرین کتب کی حوصلہ افزائی کریں، گھر کے تمام افراد میں اردو اخبارات، دینی رسائل وجرائد کے مطالعہ کارجحان پیدا کریں۔

(۴) کاروباری اداروں، کارخانوں، فیکٹریوں، سواریوں، رہائش گاہوں، دکانوں، مکانوں، بنگلوں، دفتروں نیز مارکیٹ اگر ذاتی ہوتو اس پر بھی نام وغیرہ کے سائن بورڈ واشتہارات اور تختیاں وغیرہ اردو رسم الخط میں لکھوا کر لگائیں۔

(۵) وزیٹنگ کارڈ، لیٹر پیڈ پر اپنا نام ومکمل پتہ اول اُردو میں لکھوائیں، خط وکتابت ہمیشہ اردو میں کریں، خطوط پر پتے پہلے اردو میں لکھیں، دستخط ہر جگہ اردو میں کریں۔

(۶) شادی بیاہ کی تقریبات، جلسہ وجلوس کے اشتہارات واعلانات کے فولڈر و پوسٹر اور دعوت نامے اردو میں چھپوائیں۔

(۷) گھر اور دکان کے سامان کی فہرست آمد وخرچ کا حساب اردو میں لکھیں۔

(۸) حامیانِ اردو جذبۂ ایثار سے بستی بستی، محلہ محلہ اردو کے تعلیمی سینٹر قائم کر کے رضا کارانہ طور پر اردو پڑھائیں، اردو پڑھاؤ تحریک پُرامن طور پر چلائیں۔

(۹) انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے والدین وسرپرستان اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کا مطالبہ ذمہ دارانِ اسکول وکالج سے کریں ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچے خود بھی ذوق وشوق سے اردو پڑھیں لکھیں، سمجھیں اور فخر سے بولیں۔

(۱۰) مَردُم شماری کے زمانہ میں مادری زبان کے خانے میں لفظ اردو اپنے سامنے پر کروا کر بعدہٗ جانچ بھی کرلیں۔

(۱۱) اپنے بچوں کا داخلہ ایسے اسکول میں کرائیں جہاں اردو کا مضمون بھی پڑھایا جاتا ہو۔

(۱۲) مرکزی اور ریاستی سرکاروں سے اردو کے آئینی حقوق کے دائرہ میں رہتے ہوئے محکمہ تعلیمات کے وزیر وزراء، افسران وذمہ داران سے مل کر اردو کی تعلیم وترقی کے لئے اردو میڈیم اسکول کھولنے کی

مانگ کریں اور قدیم اسکولوں میں مزید ماہر اردو اساتذہ بڑھانے پر بھی زور دیں جہاں اردو نہیں پڑھائی جاتی وہاں شعبہ اردو منظور ورائج کرائیں اردو کے اصحاب فکر ونظر کو اس بارے میں سعی بلیغ کرنی چاہئے تا کہ اردو کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہو اردو کی تنظیم وترقی اور بقا میں حائل تمام تر دشواریوں کو دور کرنے کرانے کی جدو جہد کریں تا کہ اردو کا چلن عام ہو کر اس کی عظمت رفتہ کی بازیابی ہو۔

(۱۳) ہر اردو داں اپنے حلقہ اثر میں ہر جاننے والے کو اردو پڑھنے کی طرف راغب کرے، نیز اپنے اندر بے لوث خدمات وجذبات کے ساتھ اردو کے لئے کام کرنے کی خواہش وتڑپ پیدا کرے سبھی طبقات کے افراد کو اردو پڑھنے کی ترغیب دیں۔

(۱۴) ان تمام محکموں کے دفاتر میں جہاں اردو کے مترجم موجود ہیں درخواستیں اردو میں ہی دیں، اقلیتی فلاح وبہبود کے دفاتر، اردو تنظیموں، اردو انجمنوں، اردو اکاڈمیوں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، غالب اکیڈمی جیسے اداروں میں اردو زبان وار دو رسم الخط ہی میں لکھ کر اپنی عرضیاں پیش کریں۔

(۱۵) اردو کو روزی روٹی سے زیادہ جذبات سے جوڑنا ضروری تو ہے ہی مفید سے مفید تر بھی ہے، اس لئے حامیان اردو، اردو کے فروغ کی خاطر کوشش تن من دھن سے کریں، توقع ہے کہ اردو کا ماضی جیسا شاندار و تابناک رہا ہے، انشاء اللہ مستقبل بھی ایسا ہی روشن ہو کر رہے گا۔

(۱۶) ہمارا بیشتر مذہبی اور ثقافتی اور تمدنی تاریخی اور تدریسی سرمایہ اردو زبان میں ہے، اس لئے اردو کی نئی نسل تیار کرنا ہم سب کا ملی اور اخلاقی فریضہ بنتا ہے، آنے والی نسل اگر اردو سے ناواقف رہی تو چوں کہ ہمارا تمام تر تہذیبی ثقافتی اور دینی سرمایہ ہماری تاریخ ہمارا تشخص وتمدن اردو زبان میں ہے گویا اردو ہمارا ملی، قومی اور مذہبی اثاثہ ہے، یہ سارے کا سارا اثاثہ ختم ہو کر رہ جائے گا، چنانچہ اردو ہمارے دین کی پہچان ہے، تہذیب وتمدن کی کان ہے، صلح وشرافت کی جان ہے، کتنی لذیذ وشیریں یہ اردو زبان ہے، اس لئے ہم اپنے بچوں کو اردو سے آراستہ کرنا لازم جانیں۔

❀❀❀

ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ، ہمدرد پبلک اسکول، نئی دہلی

''موجودہ ہندوستان میں اردو تدریس

...... مسائل اور حل......

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا:

''موجودہ ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بن گئی ہے۔ اہل علم کو کسی مجلس میں کچھ کہنا ہو تو اپنے افکار کو انگریزی الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔''

آج سے برسوں پہلے جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے یہ بات کہی ہوگی تو بہت کم لوگوں کو اس کی حقانیت پر یقین آیا ہوگا۔ لیکن آج یہ ایک کڑوا سچ بن گیا ہے۔ مغربیت کے پرستار نہ صرف اپنا رہن سہن اور طرز معاشرت بدل چکے ہیں اور نہ صرف اپنی تہذیب وتمدن کو بھلا بیٹھے ہیں، بلکہ اپنی مادری زبان میں اظہار خیال کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ لوگوں کی ایک کثیر تعداد یہ مسموم ذہن رکھتی ہے کہ ہماری مادری زبان اردو ناقص ہے اور اگر ناقص نہ سہی تو وقت وحالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ناکافی ہے۔ وہ اس احساس کمتری کا شکار ہیں کہ اردو کو بحیثیت مضمون پڑھنا ایک لایعنی عمل ہے جس سے کسی مادی مفاد کی امید فضول ہے۔ ان افراد کو یہ باور کرانا یقیناً ایک امر محال ہے کہ تعلیم کا مقصد طلبہ کو پیسہ کمانے کی مشین بنانا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کی ہمہ گیر نشو ونما ہے جو مادری زبان کی تعلیم کے بغیر یقیناً ناممکن ہے۔ طلبہ کو نصب العین سے آگاہ کرنا، ماضی کا رمز شناس بنانا اور مستقبل کے امانت دار ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لئے مادری زبان کی تعلیم دینا بہت ضروری ہے۔

یوروپ اور امریکہ تو بہت پہلے ہی اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ اپنی بات سمجھانے اور دوسروں کی سمجھنے کا فطری اور موثر ترین ذریعہ مادری زبان ہے۔ یہ سچائی روز روشن کی طرح بین ہے کہ مادری زبان میں دی گئی تعلیم کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ ذہن پر اس کے قائم کئے ہوئے نقوش ہمیشہ برقرار رہتے ہیں۔ جرمنی، روس اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک نے انگریزی زبان سے انحراف کرتے ہوئے اپنی مادری زبان کے ذریعہ سائنسی اور خلائی علوم میں ترقی کی اور آج صنعتی اور فنی میدانوں میں ان کی ترقیات موجب حیرت ہیں۔ انہوں نے اپنی مادری زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم وتحقیق اور وسیلۂ اظہار وابلاغ بنایا۔ ان کے علاوہ سری لنکا، انڈونیشیا اور ملیشیا میں بھی آزادی سے قبل بدیسی مغربی زبانوں کا رواج تھا مگر اب انہوں نے اپنی مادری زبان کو درباری، سرکاری کاروباری علمی اور تعلیمی طور پر رواج دیا۔ اسی کو ہر کام کے لئے وسیلہ بنایا۔ نتیجتاً ان کی زبانوں نے فروغ پایا اور آج وہ اس مقام پر ہیں کہ ان کی زبانوں میں قابل قدر علمی سرمایہ موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی پشت پناہی کے لئے حکومت اور ساتھ دینے کے لئے پورا ملک موجود تھا۔

ان مثالوں کو پیش کرنے کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ہمیں بھی اپنی مادری زبان پر فخر ہونا

چاہئے۔ یہ گنگا جمنی زبان ایک شان دار ماضی اور روشن مستقبل رکھتی ہے۔ اسے بولنا، پڑھنا، پڑھانا اور سیکھنا قابل فخر بات ہے کیوں کہ اس سے ہماری شناخت وابستہ ہے۔ یہ ہماری تہذیب وتمدن کی امین ہے۔ ہمارے علمی اور ثقافتی سرمایہ کی محافظ ہے۔ اس کی پامالی ہماری زبوں حالی کا اعلان ہے۔ اس سے بے اعتنائی ہمارے مستقبل کی بربادی کا ضامن ہے۔ یہ محض ایک زبان نہیں بلکہ ہماری ماں ہے اور ماں سے بچوں کو والہانہ پیار ہونا لازمی ہے۔ پھر ہماری اردو ماں کیوں اس پیار سے محروم ہے؟

حد تو یہ ہے کہ اردو پڑھانے والے اساتذہ اور پڑھنے والے طلبہ اور ان کے والدین بھی اس احساس کا شکار ہیں کہ اس زبان کو پڑھنا پڑھانا ہماری مجبوری ہے، ایک مقدس فریضہ نہیں اور مجبوری میں کیا گیا ہر کام مردہ اور بے جان ہوتا ہے کیوں کہ اس کی آبیاری خون جگر سے نہیں کی جاتی۔

اس لئے اردو تدریس کا جائزہ لینے یا اس کے مسائل پر بحث شروع کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے نظریات بدلیں اور اس زبان کی خدمت کر کے خوشی محسوس کریں۔ ہم چاہے ڈاکٹر ہوں یا انجینئر، آفیسر ہوں یا بزنس مین، ہمارا یہ فرض ہے کہ اس زبان کے دامن کو مختلف علوم وفنون کے جواہرات سے بھر دیں، ہم دیکھیں گے کہ جیسے ہی ہمارے نظریات بدلیں گے، عمل میں خود بخود ایک مثبت تبدیلی آجائے گی۔ اردو زبان کے فروغ واشاعت کی ذیل میں اٹھائے گئے ہر قدم کے پیچھے ایک مضبوط قوت ارادی کارفرما ہوگی جو اس قدم کو کامیابی کی منزل تک لے جانے کی ضامن ہوگی۔

اس مختصر تعارف کے بعد آیئے اب موجودہ ہندوستان میں اردو تدریس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

عام طور پر اردو کی تعلیم دو حیثیتوں سے رائج ہے:

(۱) اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم (۲) اردو بحیثیت اختیاری مضمون

وہ اسکول جن میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے، زیادہ تر سرکاری یا پھر مذہبی مدارس ہیں جہاں درجہ اول سے لے کر ہائر سیکنڈری تک سبھی مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ادارے ہیں جن میں اعلیٰ جماعتوں تک اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر گریجویشن، پوسٹ گریجویشن، طب اور انجینئرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ فی الوقت ہم اس بحث کو نہیں چھیڑ رہے ہیں کہ وہ اسکول یا کالج کس حد تک کامیاب ہیں کیوں کہ تعلیمی اداروں کی کامیابی وناکامی کا دارومدار صرف ذریعۂ تعلیم پر نہیں بلکہ اور دیگر عوامل بھی اس میں کارفرما نظر آتے ہیں۔

اردو تدریس کی دوسری صورت اختیاری مضمون کی ہے۔ طلبہ دیگر مضامین کی تعلیم اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں حاصل کرتے ہیں اور اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔ اس صورت میں اس کی حیثیت Second language یا Third language کی ہوتی ہے اور اس کی First language اس کی میڈیم کی زبان ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ہے جو اردو کو نہ تو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کرتا ہے اور نہ ہی مضمون کی حیثیت سے پڑھتا ہے بلکہ اپنے دیگر تعلیمی مشاغل اور مصروفیات میں وہ اس بات کی گنجائش رکھتا ہے کہ اردو کو فاصلاتی کورسز یا پارٹ ٹائم ڈپلومہ کورسز کے ذریعہ سیکھے اور اس سے مستفیض ہو۔

قابل مبارکباد ہیں وہ تمام افراد جو اس ماحول میں بھی اردو تعلیم وتدریس سے وابستہ ہیں جب کہ انگریزیت ذہن ودل پر غالب آچکی ہے۔ اہل علم حضرات کا فرض ہے کہ وہ تمام اردو سے وابستہ حضرات کے مسائل پر غور کر کے ان کا حل نکالیں تا کہ وہ بحسن وخوبی اپنے فریضے کی ادائیگی کر سکیں۔

اب وقت ہے ان تمام مسائل کو منظر عام پر لانے کا، جن سے ہم، آپ اور تقریباً ہر اردو داں شخص دو چار ہے اور جو تدریس اردو کے عمل کو ناکام بنانے کے لئے کسی حد تک ذمہ دار ہیں۔

تدریس کے عمل کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا عامل استاد ہوتا ہے۔ اس عمل کی تمام تر کامیابی اور ناکامی کا ذمہ دار بھی وہی ہوتا ہے۔ اس لئے استاد کی شخصیت کی ہمہ گیر نشو ونما نہایت ضروری ہے۔ کیوں کہ استاد کی شخصیت کے جادو سے طلبہ کی زندگی میں حیات تازہ کے چشمے ابلتے ہیں اور حیران و پریشان نوجوان نسل کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ استاذ کے اندر تدریس کے چیلنجز کو قبول کرنے اور اس کی مزاحمتوں پر قابو پانے کا عزم وحوصلہ ہوتا ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ باہر کی دنیا سے بے خبر نہ رہیں۔ حقیقی دنیا سے دو چار ہونے کی سبیل نکالیں۔ اس کے اندر تدریس وتربیت کی اہلیت ہو اور متواتر اس کی علمی لیاقت اور تدریسی ہنر میں اضافہ ہوتا رہے۔ ساتھی کارکنوں اور ذمہ داروں سے تعاون کا جذبہ اور حالات حاضرہ سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت ہو۔ اس کے لئے وقتاً فوقتاً اساتذہ کی ٹریننگ کا انتظام ہوتے رہنا چاہئے تا کہ وہ نئی تدریسی تکنیک سے واقفیت حاصل کر کے کلاس روم ونیچنگ کو پر اثر بنا سکیں۔ ترقی یافتہ ممالک نے تدریسی تکنیک پر بہت سے تجربات کئے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں جن کے نتائج امید افزا اور مفید برآمد ہوئے ہیں۔ اردو تدریس کے سلسلے میں ان تجربات سے فائدہ اٹھانا سودمند ثابت ہوگا۔ استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اچھا مقرر ہو۔ اس کی جڑیں محبت کے سرچشمے سے سرشار ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ جب بچے کی طرف سے ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو صرف دو افراد ایسے ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے۔ ایک ماں دوسرا استاذ۔ استاد کے اندر اس حد تک اعتماد اور یقین پیدا کرنے میں ان کے لئے منعقدہ ورکشاپ اور ٹریننگ سینٹر ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان میں انہیں اپنی زندگی کے تدریسی تجربات بیان کرنے اور دوسرے ماہرین تعلیم سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے۔ وہ تازہ دم ہو کر دوبارہ اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں لگ جاتے ہیں۔

اساتذہ کی ٹریننگ کے بعد جو دوسرا اہم مسئلہ ہمارے سامنے ہے، وہ اردو میں اضافی مواد کی کمی ہے۔ درسی کتابیں چاہے جتنی لگن محنت اور تیاریوں سے مرتب کی جائیں کسی مضمون کی تدریس کے لئے تنہا وہی کافی نہیں ہوتیں۔ آج کے اس برق رفتار زمانے میں جب کہ علوم وفنون میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ معلومات طلبہ کو بہم پہنچانے کے لئے بڑے پیمانے پر اضافی مواد جمع کئے جائیں ورنہ ہمارے طلبہ کنوئیں کے مینڈک بن کر رہ جائیں گے۔ حالاں کہ جتنی بھی تنظیمیں اردو سے وابستہ ہیں وہ اسی موقعہ کے حصول میں کوشاں ہیں لیکن کام زیادہ منظم اور Systematieway میں کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو زبان میں اضافی مواد کی کمی ہے وہیں بچوں کے ادب پر بھی کوئی خاص کام نہیں ہے۔ ان کے لئے کامکس اور کہانیوں کی کتابوں کا فقدان ہے۔ کامکس بچوں کے لئے کارٹون کی مدد سے تیار کی گئی کہانی ہوتی ہے

جس میں کیرکٹر کے مکالمے بھی درج ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعہ طلبہ لطف اندوز ہوتے ہیں کیوں کہ زیادہ تر کامکس مزاحیہ ہوتے ہیں اور ان کی زبان دانی کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ کامکس میں زیادہ تر مشہور کہانیوں کا کوئی حصہ یا ڈاکٹرس پولیس آفیسرز اور رپوٹرس کے کارناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جاسوسی کہانیاں خاص طور سے کامکس کا ایک حصہ ہیں۔ ایک سروے کے مطابق اخبار کا مقبول ترین حصہ کامکس ہوتا ہے۔ کچھ کامکس کو نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی اس قدر پسند کرتے ہیں کہ وہ دو ہزار اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کروڑوں کامکس ہر سال فروخت کئے جاتے ہیں۔ مگر افسوس اردو نے ابھی تک اس مؤثر عامل سے استفادہ نہیں کیا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے کارٹونسٹ دن رات محنت کر کے اس شعبے میں اپنی خدمات پیش کریں کیوں کہ جو طریقہ تدریس بچوں کی فطرت کے عین مطابق ہو وہی کارگر ثابت ہوتا ہے۔

کہانیاں تعلیم و تدریس کا نہایت دلچسپ اور مؤثر ذریعہ ہیں۔ خصوصاً بچے کہانیوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ کہانی پڑھتے یا سنتے وقت اپنے کو ہیرو کا قائم مقام بنا کر اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کر لیتے ہیں اور وہی کارنامے انجام دینا چاہتے ہیں۔ کہانی پڑھنے سے ان کی زبان رواں اور مافی الضمیر کی ادائیگی میں سہولت ہوتی ہے۔ الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ خیالات و جذبات کے اظہار پر قدرت حاصل کرنے میں کہانیاں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ خصوصاً پرائمری درجات میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے لیکن اردو کا دائرہ اس میدان میں بھی محدود ہے۔ ایک انگلش میڈیم کا اوسط طالب علم پانچویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے دو سو سے زیادہ کہانیوں کی کتابیں پڑھ چکا ہوتا ہے۔ لیکن یہ معاملہ اردو کے طالب علموں کے ساتھ نہیں کیوں کہ اول تو اتنی تعداد میں کتابیں دستیاب نہیں اور ہیں بھی تو بالکل روکھی پھیکی اور خشک۔ حروف بالکل چھوٹے چھوٹے جس کو ہاتھ میں تھامنے سے قبل ہی بچہ اپنی دلچسپی کھودے۔ بچوں کے لئے کہانیوں کی کتابیں خوبصورت، دیدہ زیب، تصویری اور رنگین ہونی چاہئیں۔ حروف کا سائز بڑا ہونا چاہئے اور ہر عمر کے بچے کے الفاظ کا استعمال اس کی عمر کو دھیان میں رکھ کر کرنا چاہئے۔ ہم دیکھیں گے کہ طلبہ میں اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہوگی اور وہ زیادہ ذوق و شوق سے اسے سیکھیں گے۔

بچوں کی معلومات میں وسعت، ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ، مطالعہ کی سکت، کتب بینی کا ذوق، خیالات کی بلندی، اظہار خیال پر قدرت، دوسروں کے نظریات و خیالات سمجھنے کی صلاحیت کے لئے اخبارات و رسائل کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ یہ پروگرام دو ناموں سے کام کر رہے ہیں ایک تو NIE اور دوسرا PACE۔

انگریزی زبان کی تدریس میں تو اخبار کو تدریس کا ہی ایک حصہ بنا دیا گیا ہے تو تعلیم بذریعہ اخبار کے تحت روزانہ طلبہ کو اخبار نسبتاً کم قیمت پر مہیا کرایا جاتا ہے۔ ہفتہ میں ایک بار تمام اخبارات کے شائع شدہ مضامین اور خبروں کو مدنظر رکھ کر طلبہ کی عمر کے لحاظ سے اسائنمنٹ تیار کئے جاتے ہیں۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ مضامین اور خبریں کسی نہ کسی طرح طلبہ کے نصاب سے متعلق ہوں۔ طلبہ اخبار پڑھ کر دئے گئے اسائنمنٹ کو حل کرتے ہیں۔ زیادہ تر پروجیکٹس ہوتے ہیں جن میں طلبہ کی خصوصی دلچسپی ہوتی ہے۔ ہفتہ میں ایک بار بچوں کا مخصوص اخبار آتا ہے جو خالص اسکولوں کی خبروں، تعلیمی مسائل اور بچوں کی تحریروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ کارٹون اور کہانیوں، معلوماتی کوئز اور ذہنی ورزش اور سائنسی معمے وغیرہ کا خاص طور پر ایک شعبہ ہوتا ہے جس سے بچے اس اخبار کو پسند کرتے اور

شوق سے پڑھ کر اپنا تعاون پیش کرتے ہیں۔ اردو تدریس کے لئے بھی یہ طریقہ کافی مفید اور مؤثر ہوگا۔ طلبہ حالات حاضرہ سے واقف ہوسکیں گے اور ان کی زبان دانی کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوگا۔

کمپیوٹر آج کی اہم ترین اور اولین ضرورت ہے، کیوں کہ موجودہ دور انفارمیشن اور ٹکنالوجی کا دور ہے، اس میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے زندگی کے ہر میدان میں ایک انقلاب پیدا کردیا ہے۔ اس ٹکنالوجی کے ذریعہ وقت کی رفتار کئی سوگنا تیز ہوگئی ہے۔ فاصلوں کا تصور مٹ گیا ہے۔ اس نے پوری دنیا کو ایک گلوبل ولیج میں تبدیل کردیا ہے۔ یوں تو زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر نظر آتا ہے لیکن بالخصوص علمی میدان میں اس کی مہربانیاں کچھ زیادہ ہیں۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات ہم بغیر کسی دشواری کے حاصل کرسکتے ہیں۔ تمام بیدار قومیں اس ماڈرن ترین ایجاد سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کررہی ہیں۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق طرح طرح کے پیکیجز تیار کررہی ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعہ تدریس کے نئے نئے طریقے بھی ایجاد کئے جارہے ہیں جو دلچسپ اور بچوں کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ ہم میں جو کمپیوٹر ایکسپرٹ ہیں ان کی مدد سے اردو تدریس کے لئے بھی کمپیوٹر کے پیکیجز تیار کئے جاسکتے ہیں تاکہ ہماری زبان اس ایجاد کی برکتوں سے محروم نہ رہے۔

اس کے علاوہ کسی زبان کی تدریس میں Audio visual aids بھی کافی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لفظ کا صحیح تلفظ، جملوں کی ادائیگی، انداز بیان سکھانا اور املے کی عام غلطیاں اس سے سدھاری جاسکتی ہیں۔ طلبہ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اثرات دیرپا اور دوررس ہوتے ہیں کیوں کہ اس میں صوتی و بصری دونوں قوتوں کو بروئے کار لاکر سکھانے کا عمل انجام پذیر ہوتا ہے۔ طلبہ دلچسپی کے ساتھ ان معاون اشیاء کی مدد سے زیادہ دل لگا کر اس مضمون کو سیکھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ توجہ اور دلچسپی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ جب طلبہ کو کسی چیز سے دلچسپی ہوتی ہے تو وہ اس پر توجہ دیتے ہیں اور جب وہ کسی مضمون پر توجہ صرف کرتے ہیں تو اس میں مہارت حاصل کرلیتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان معاون اسباب سے بھی اردو تدریس کے لئے کوئی مدد نہ لی اور نہ اس پر توجہ دی۔ ہم اب تک قدامت پرستی کا شکار ہیں اور اسی توضیحی، تشریحی اور بیانیہ انداز کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اس طریق تدریس کی افادیت سے ہمیں انکار نہیں لیکن زمانے کے ساتھ نہ چلنا بھی کوئی عقل مندی نہیں ہے۔

تنہا کتابی علم سے تعلیم کے ہمہ گیر مقاصد ہرگز حاصل نہیں ہوسکتے۔ اس لئے متعدد ایسے مشاغل و مصروفیات کا بھی بندوبست ضروری ہے جن میں عملی حصہ لے کر طلبہ اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرسکیں۔ ان کو غیر نصابی مصروفیات یا Co-curricular activities کہتے ہیں۔ ملک کے دیگر علاقوں میں بھی غیر نصابی مقابلے کئے جاتے ہوں گے۔ یہاں دہلی میں اس مقصد کے حصول کے لئے اردو اکیڈمی دہلی میں بہت سے اردو کے مقابلے منعقد کراتی ہے۔ اس میں طلبہ کی کارکردگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہمیں اس میدان میں بھی کافی ترقی کرنی ہے۔

اب تک ہم ان تجویزوں پر غور کررہے ہیں جن سے اردو تعلیم کو زیادہ مؤثر بنایا جاسکے۔ آیئے اب براہ راست ان مسائل کی طرف چلتے ہیں جو اردو تدریس سے متعلق ہیں۔ تدریس کا عمل جبھی وجود میں آتا ہے جب

قومی یومِ تعلیم

NATIONAL EDUCATION DAY

۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء - ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़े उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE

Ministry of Human Resource Development (Department of Higher Edution), Govt. of India

West Block - 1, R.K. Puram, New Delhi - 110 066

استاد، طالب علم اور زبان آلہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے حروف تہجی سے آوازیں، آوازوں سے الفاظ اور الفاظ سے اظہار کی طرف بچوں کو لے جانا آسان طریقہ نہیں۔ اس کے بجائے اظہار کو آواز پر اور آواز کو حروف تہجی پر فوقیت دینی چاہئے تاکہ تدریسی طریقہ فطری رجحان سے ہم آہنگ ہوجائے۔ اسے صوتی بصری نظام کہتے ہیں۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ مندرجہ بالا نظریہ کو مدنظر رکھ کر بچوں کے لئے اردو کی تعارفی کتاب، دیدہ زیب پرکشش، خوبصورت اور رنگین تصویروں سے مزین تیار کی جائے کیوں کہ تصویروں کے ذریعہ پیش کیا گیا مواد ذہن پر گہرے نقوش ثبت کرتا ہے۔ دماغ کی ایک خاص صلاحیت انسان کو رنگین تصویروں کی طرف متوجہ ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔

اب رہا لکھنا سکھانے کا مسئلہ تو اس کی ابتدا ڈرائنگ سے ہونی چاہئے۔ سادہ لکیروں، چوکور تکونی شکلوں میں جزوی تبدیلی کرکے تصاویر اور دلچسپ رنگین مشغلوں کے ذریعے گرفت، اعصاب پر قدرت اور آنکھ دماغ ہاتھ سے بیک وقت کام لینے کی مشق کرائی جائے۔ اس کے لئے رنگین پنسلوں کا استعمال زیادہ صحیح ہوگا۔ پھر رفتہ رفتہ حروف کی ڈرائنگ سکھائی جائے اور حروف کو ملا کر لکھنے کی مشق کرائی جائے۔ لکھنے کا کام جب ہی شروع کرایا جائے جب طلبہ حروف تہجی کی آوازوں اور اس کی بناوٹ سے واقف ہوجائیں۔

ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ درسی کتابوں کی معیار بندی کی جائے جو ادارے اردو تدریس میں مشغول ہیں ان کو ایک تنظیم سے منسلک کرکے ان کی درسی کتابوں کا ایک معیار مقرر کردینا چاہئے تاکہ ہر کوئی اپنی ڈیڑھ اینچ کی مسجد نہ بنا بیٹھے۔

اردو میں نمبرات کم آنا ایک اہم مسئلہ ہے۔ جس سے طلبہ حوصلہ شکن ہوجاتے ہیں۔ بورڈ کے امتحانوں میں دوسرے مضامین میں ۹۸ فیصد تک لایا جاسکتا ہے لیکن اردو کا تناسب اس کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے لئے پرچوں کا Pattern اور Marking scheme میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

چوں کہ میرا تعلق انگلش میڈیم اسکول سے ہے اس لئے اب میں مختصراً ان مسائل کا ذکر کرنا چاہوں گی جن سے انگلش میڈیم کے طلبہ دوچار ہیں۔

اردو اور انگریزی کے باہمی تعلقات کی ابتدا انیسویں صدی کی شروعات میں ہوچکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے اعلان کیا کہ برٹش حکومت رعایا کی خوشحالی اور فلاح و ترقی چاہتی ہے۔ اس کے لئے انتظامی اور تعلیمی معاملات میں نئے نئے تجربے اور اصلاحات کی گئیں۔ تعلیمی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور یہ محسوس کیا گیا کہ تعلیمی ترقی کے لئے مغربی تعلیم کے اصول اور نصاب کو انگریزی زبان کے ذریعہ یہاں کے لوگوں سے روشناس کرایا جائے۔ جبھی سے انگریزی میڈیم اسکول کثیر تعداد میں ہندوستان میں موجود ہیں۔ جن میں سے چند ایسے ہیں جہاں اردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کچھ اسکولوں میں اسے درجہ اول سے متعارف کرایا جاتا ہے تو کچھ اسکولوں میں درجہ سوم سے۔ آٹھویں کلاس تک اس کی حیثیت Third language کی ہوتی ہے اور نویں اور دسویں میں یا تو اسے دوسری زبان کے طور پر لیتے ہیں یا پھر اضافی مضمون کی حیثیت سے۔ ان اسکولوں کا سب سے بڑا مسئلہ اردو کی درسی کتاب کا ثانوی زبان کی حیثیت سے نہ ہونا ہے۔ اور بورڈ نے بھی اس بات کی

اجازت نہیں دی ہے کہ اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھنے والوں کے لئے کوئی الگ پیپر آئے۔ پچھلے دنوں ذکر آیا کہ N.C.E.R.T. دوسری اور تیسری زبانوں کی حیثیت سے اردو کی کتابیں شائع کروارہی ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ C.B.S.E بورڈ اسے اختیار کرنے کی اجازت دیگی جبھی انگلش میڈیم اسکول فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ اس کے لئے جناب سید حامد صاحب کی سرپرستی میں کافی کوششیں کی گئیں کہ اردو میں کورس۔ بی شروع کیا جائے لیکن اب تک کوئی امید افزا نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چنانچہ موجودہ درسی کتابیں ان طلبہ کے لئے کافی مشکل ہیں۔

اس اہم مسئلے کے علاوہ اور بھی دیگر مسائل ہیں جیسے نظام الاوقات میں اردو کے لئے کم پیریڈس مقرر کرنا، انگریزی پر بے جا زور، غیر نصابی مشاغل کا زیادہ تر انگریزی میں منعقد کرانا، بورڈ میں کم نمبر آنا، تدریس کے معاون سامان نقشے، چارٹ ماڈل وغیرہ کی کمی وغیرہ۔

ایک عام غلط فہمی طلبہ کے ذہن میں یہ بھی ہے کہ اگر نویں دسویں میں اردو لی اور ہندی نہ لی تو سرکاری ملازمتوں میں دشواری ہوگی اس لئے نویں کلاس میں آکر وہ اردو کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

مدرس معاشرے کا معمار اور مستقبل کا ضامن ہوتا ہے۔ اس کے اندر فرض شناسی، لگن، انہماک اور سرگرمی سے خود کام کرنے اور دوسروں میں یہی اسپرٹ پیدا کرنے کی فکر ہونی چاہئے۔ مدرس کا عمل اس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ گھر، والدین اور معاشرہ اس میں اپنا بھرپور تعاون نہ پیش کریں۔ اس لیے ہر اردو داں شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ دلسوزی اور دلجمعی کے ساتھ خلوص دل سے اس زبان کی خدمت کریں۔

آج کے اس مادہ پرستانہ دور میں ہر چیز مادّی مفاد کے نظریے سے دیکھی جاتی اور روپے پیسے کے ترازو سے تولی جاتی ہے۔ اخلاق واقدار کی گراوٹ اپنے عروج پر ہے۔ لوگوں کے پاس وقت کی قلت ہے۔ نظریۂ حیات یکسر بدل چکا ہے۔ ایک عجیب نفسانفسی کا عالم ہے۔ خود غرضی ذہنوں پر پوری طرح مسلط ہے۔ اس صورت حال میں ہم ان تمام افراد کی خدمت میں خراج عقیدت وتحسین پیش کرتے ہیں جو خلوص دل سے اردو تدریس وتعلیم اور اس کی فروغ واشاعت کے مقدس فریضے میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا انہیں جزاء خیر دے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم جس مقصد کو لے کر اٹھے ہیں اس میں کامیاب ہوں۔ اردو زبان محض ایک زبان نہیں ہمارا تشخص اور ہماری پہچان ہے۔ ہماری تہذیب وتمدن کا آئینہ ہے۔ ہمارے مذہبی سرمایہ کی امین ہے۔ میں علامہ اقبال کے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ:

نہیں ہے نا امید اے اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

جیوے جیوے ہندوستان
زندہ باد اردو زبان

❀❀❀

ڈاکٹر محمد ظفیر الدین انصاری، ریڈر و صدر شعبہ اردو، جی۔ایم۔آر۔ڈی، کالج (سمستی پور)

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

فورٹ ولیم کالج سے قبل اردو نثر ابتدائی حالت میں تھی۔اس عہد میں کچھ خاص ہندوستانیوں کے علاوہ چند غیر ملکیوں نے بھی نثر میں تصنیف وتالیف کا کام بخوبی انجام دیا۔اس سلسلے میں سب سے پہلا نام خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز کا ہے۔انہوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب ''معراج العاشقین'' سے اردو نثر کا باضابطہ آغاز کیا۔یہ کتاب ۱۳۹۴ء میں لکھی گئی۔خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بعد ۱۶۳۵ء میں قطب شاہی دور میں مشہور شاعر ملا وجہی نے ایک اخلاقی اور صوفیانہ قصہ ''سب رس'' کے نام سے تصنیف کی۔اس کی عبارت بہت مقفع اور مسجع ہے۔وجہی کی دوسری کتاب ''قطب مشتری'' ہے۔قطب مشتری ایک مثنوی ہے جس میں بادشاہ کی تعریف اور اس کے عشق کی داستان تفصیل کے ساتھ قلمبند کی گئی ہے۔

شمالی ہند میں اردو نثر نگاروں میں سب سے پہلا نام فضلی کا آتا ہے۔یہ دکن کے رہنے والے تھے۔لیکن تعلیم و تربیت دہلی میں پائی۔انہوں نے ۱۷۳۱ء میں ملا حسین کاشفی کی کتاب ''روضہ الشہدا'' کا اردو ترجمہ کیا۔اس کی زبان اور طرز تحریر نہایت شگفتہ اور سنجیدہ ہے۔ان تمام باتوں پر بحث و تکرار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے قبل انفرادی طور پر اردو کی خدمت میں شعراء اور ادباء مصروف تھے۔

فورٹ ولیم کالج کا قیام ٹیپو سلطان کی شہادت کے چودہ ماہ بعد یعنی ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کو عمل میں آیا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر سرپرستی بمقام کلکتہ یہ کالج اپنا کام بحسن و خوبی انجام دینے لگا۔اس طرح اردو ادب کا ایک زبردست مرکز قائم ہوا۔ابتدا میں یہ مدرسہ کی حالت میں تھا۔اسے وسعت دے کر کالج کی شکل میں منتقل کیا گیا۔فورٹ ولیم کالج اپنی ادبی خدمات کے سلسلے میں محتاج تعارف نہیں ہے۔عام طور پر لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ اس کے بانی جان گلکرائسٹ ہیں۔درحقیقت وہ صرف مشیر خاص تھے۔بلکہ اس کالج کے قیام و استحکام سے متعلق تمام کاوشوں کا سہرا گورنر جنرل لارڈ ویلزلی (Lord Wellesley) کے سر ہے۔لارڈ ویلزلی ذی ہوش اور عقل مند شخص تھا۔ان کی دوررس نگاہوں نے یہ دیکھ لیا کہ جب تک حکمراں طبقہ یہاں کی زبان اور تہذیب سے بخوبی واقف نہیں ہوگا اس وقت تک نہ تو نظام حکومت اچھی طرح چل سکے گا اور نہ انگریز حکومت کو استحکام مل سکے گا۔چنانچہ سول ملازمین کے بارے میں اس نے فیصلہ کیا:

> ''تعلیم لازمی طور پر مخلوط ہونی چاہئے۔جس کی بنیاد لازمی طور پر انگلینڈ میں رکھی گئی ہو اور بالائی تعلیم منظم طریقے سے ہندوستان میں مکمل کی جائے۔''

اس طرح اس کالج کے قائم کرنے کا خاص مقصد لارڈ ویلزلی (Lord Wellesley) کے زمانے

میں انگلینڈ سے آنے والے انگریز ملازمین کو ہندوستانی زبان کی تربیت دینی تھی۔ اس کالج کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ بحال ہوئے۔ انہوں نے اردو ادب کی ترقی واشاعت کے لئے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ملک کے چنیدہ انشاء پردازوں کو اکٹھا کر کے ایسی کتاب کی اشاعت کرائی کہ سلیس اور رواں عبارت کی فراوانی کے باعث اردو زبان سہل ہوگئی اور زیادہ دلکش نظر آنے لگی۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اردو اپنی انفرادیت واہمیت کے باعث فارسی کی جگہ سرکاری زبان قرار پائی۔ اس کالج میں جن پروفیسروں کی تقرری عمل میں لائی گئی ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ جان بیلی ...... برائے عربی زبان وفلسفہ
۲۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ ...... برائے ہندوستانی زبان
۳۔ فرانس گلیڈ ون ...... برائے فارسی زبان وادب
۴۔ پادری بکھانن ...... برائے یونانی، انگریزی کلاسیکی ادب
۵۔ جارج بابو ...... برائے ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے لئے نافذ کردہ قوانین

اسی زمانے میں ہندوستانی زبان وادب کو فروغ دینے کے لئے جان گلکرائسٹ کو پروفیسر مقرر کیا گیا جو جدید ہندوستانی نثر کے بانی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج سے جو کتابیں شائع ہوئیں اسے جدید ہندوستانی ادب میں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ ایسی حالت میں اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی ذی ہوش شخص ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جان گلکرائسٹ کے ادبی ذوق اور اردو ادب کی گرانقدر خدمات کو تمام ارباب ذوق نے تسلیم کیا ہے۔ خود تاریخ زبان اردو کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے ان کو اردو کا مربی اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے ولی کا ہم رتبہ قرار دیا ہے۔

اتنا ہی نہیں اردو کی صحت مند خدمات کے ضمن میں چند معتبر انشاء پردازوں کا تذکرہ کرنا لازمی ہے۔ اس کالج میں منسلک ہو کر جن انشاء پردازوں نے اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ایسے نامور ادیبوں اور انشاء پردازوں میں میر امن، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، میر کاظم علی جواں اور نہال چند لاہوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان میں بعض نے تصنیف کا کام انجام دیا اور بعض نے تالیف کا۔ میر امن دہلوی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے "باغ وبہار" نام کی کتاب تالیف کی جو عطا حسین تحسین کی تصنیف نوطرز مرصع (فارسی قصہ چہار درویش) کا سلیس ترجمہ ہے۔ اس کے مطالعے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ میر امن کو زبان پر دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے اردو نثر کو ایک نئی سمت اور ایک نئی جہت سے روشناس کیا اور داستان گوئی کے فن کو بام عروج تک پہنچایا۔ انہوں نے اپنی کتاب "باغ وبہار" کو فورٹ ولیم کالج میں اس خوبصورتی کے ساتھ لکھا کہ عوام وخواص دونوں میں یکساں طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ میر امن کی دوسری تصنیف "گنج خوبی" ملا حسین واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کا ترجمہ ہے۔ اس میں بھی سادگی اور متانت "باغ وبہار" سے کم نہیں۔ لیکن جو شہرت دوام "باغ وبہار" کو ملی ہے وہ میر امن کی

دوسری تصنیف کو میسر نہیں۔

سید علی افسوس دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہ اپنے والد کے ہمراہ پٹنہ آئے۔ لیکن چند دنوں کے بعد لکھنؤ چلے گئے جہاں ان کی ملاقات کرنل اسکاٹ سے ہوئی۔ وہ ان کی علمی صلاحیت اور ادبی ذوق سے کافی متاثر ہوئے۔ وہ دو سو روپے ماہوار کی حیثیت سے فورٹ ولیم کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری کتاب ''آرائش محفل'' ہے۔ جس میں ان کے وقت کی ہندوستان کی تاریخی اور جغرافیائی حالات درج ہیں۔ صفائی زبان اور صحت بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔ سید حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے تمام نثر نگاروں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مؤلف تھے۔ ان کی تالیف قصہ ''لیلیٰ مجنوں''، ''طوطا کی کہانی'' ''ہفت پیکر'' اور ''گلزار دانش'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کا وطن دہلی تھا لیکن تعلیم و تربیت بنارس میں ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کی شہرت کی بدولت بغرض ملازمت یہاں آئے۔ جان گلکرائسٹ نے ان کی علمی لیاقت اور صلاحیت سے متاثر ہو کر ان کو اپنے دار التصنیف میں جگہ دی۔

نہال چند لاہوری بھی فورٹ ولیم کالج میں اپنی علمی صلاحیت کے ذریعہ مشہور ہوئے۔ انہوں نے اردو زبان کی صحت بخش خدمت انجام دی۔

انہوں نے ''گل بکاؤلی'' نام کی کتاب تالیف کی جو فارسی قصہ کا ترجمہ ہے۔ ان تمام نامور ادیبوں اور انشاء پردازوں کے تصنیفات کے تذکروں کے بعد اور بھی انشاء پردازوں کی کاوشیں فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کے سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ لیکن بخوف طوالت چند معتبر انشاء پردازوں کے تذکرے پر ہی اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو ادب کی جو صحت بخش خدمات انجام دیں ان گرانقدر خدمات کو اردو ادب کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ متعدد اہل قلم کو بلا کر ادبی خدمات ان کے ذمہ سپرد کی گئیں جس سے ایک بیش بہا خزانہ تیار ہوا۔ نہ صرف قصہ کہانی کی کتاب لکھی گئی بلکہ اخلاق، تاریخ اور سوانح نگاری جیسے اہم اصناف پر طبع آزمائی کی گئی۔ اس کالج کے انشاء پردازوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مقفع اور مسجع عبارت سے اجتناب کر کے سیدھی سادی عبارت کو رواج دیا۔

اس کالج کا اثر تمام ملک پر پڑا۔ رفتہ رفتہ سبھوں نے فرسودہ طریقہ یعنی رنگین اور مغلق عبارت چھوڑ کر سادگی اختیار کی۔ زبان و ادب پر اس کالج کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ فارسی اور عربی کے دقیق الفاظ کا خاتمہ ہو گیا۔ ہندی اور اردو کے وہ الفاظ کام میں آنے لگے جو عام طور سے پسند کئے جاتے تھے اور عام فہم تھے۔

المختصر اردو زبان و ادب کی باضابطہ نشو نما کا کام غیر متوقع طور پر فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ ہوا جو بظاہر انگریزوں کے مفاد کی حفاظت اور استحکام کیلئے قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اسکے وسیلے سے اردو ادب کو کافی فروغ ہوا۔

❀❀❀

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ (بہار)

سید منظر امام: تری تحریر سے خوشبو پھوٹے

دنیائے شعروادب میں کئی فنکار ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی طویل عمر میں کم لکھا لیکن شہرت دوام پائی۔ اس کے اسباب کئی ہو سکتے ہیں، کبھی رہین ستم ہائے روزگار رہنے کی وجہ سے تو کبھی زندگی کے تئیں غیر سنجیدہ نظریہ رکھنے کی وجہ سے۔ پھر یہ کہ فنکار جو کچھ لکھتا ہے وہ جب تک اس کی میزان پر پورا نہیں اترتا وہ اسے لکھتا رہتا ہے اور تلف کرتا رہتا ہے۔ حالاں کہ کبھی کبھی اس کی رد کی ہوئی چیزیں بھی فنون لطیفہ کا ایک اہم حصہ بن جاتی ہیں مثلاً پیکاسو نے جنہیں رد کر دیا اس کی وہی مصوری عالمی شہرت حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ کلیم الدین احمد کی تنقیدی کتابوں پر پیش لفظ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے جو کچھ لکھا وہ کلیم صاحب کی تنقید سے کسی طرح کم نہیں اس کا اعتراف اکثر دانشوروں نے کیا ہے۔ فضل الرحمٰن صاحب نے اردو میں اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا لیکن یہ تحریریں ان کی اہلیت اور قابلیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے اور بھی لکھا ہوتا تو اردو کے تنقیدی سرمایہ میں گرانقدر اضافہ ہوتا۔ ایسی شخصیتیں عام طور پر جو کچھ لکھتی ہیں وہ کافی گہری معنویت کی حامل ہوتی ہیں۔ یوں بھی ضخامت کسی فنکار کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے کافی نہیں بلکہ چند تحریریں ہی اس کی پوری شخصیت کا آئینہ دار ہوتی ہیں اور اسے حیات جاوداں عطا کرتی ہیں۔ سید منظر امام افسانہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے رہے ہیں۔ انہوں نے بھی بہت کم لکھا ہے، لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی شخصیت، انکی اہلیت، ان کی صلاحیت اور انکی بصیرت کا احاطہ کرتی ہیں۔

سید منظر امام نے جب چشم شعور کھولا اس وقت ان کا گھر ''امیر منزل'' (قلعہ گھاٹ، دربھنگہ) ادباء و شعراء کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ دربھنگہ میں فروغ اردو کی تحریک ہو یا ادبی تحریک، خواہ وہ اردو اداروں کی شکل میں ہو، انجمن ترقی اردو کی شکل میں ہو یا انجمن ترقی پسند مصنفین کی صورت میں، ''امیر منزل'' کی دہلیز سے ہی نمو پذیر ہوئی۔ سید منظر امام دو برس کے تھے جب والد جناب سید امیر علی کا انتقال ہو گیا۔ والدہ سیدہ کنیز فاطمہ، بڑے بھائی معروف ادیب و شاعر حسن امام درد اور ممتاز شاعر و ادیب مظہر امام کے زیر سایہ پرورش پائی اور ''امیر منزل'' کے ادبی ماحول میں ذہن و شعور کی پرداخت ہوئی۔ ظاہر ہے گلشن میں بہار رقص کناں ہو تو اس کا ذرہ ذرہ وجد میں ہوتا ہے سو ان کا شعر و ادب سے لگاؤ عین فطری تھا۔ اس کے علاوہ جو صحبتیں انہیں نصیب ہوئیں وہ بھی ان کی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں معاون رہیں۔ انہوں نے بہت کم عمری میں شعر کہنے کی کوشش کی۔ لکھتے رہے اور ضائع کرتے رہے۔ پہلی نظم ''عزم جواں'' بچوں کے رسالہ ''کھلونا'' میں شائع ہوئی۔ یہ رسالہ اس وقت کا معیاری رسالہ تسلیم کیا جاتا تھا اور اس میں نظم کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے اندر شعر گوئی کی بے پناہ قوت موجود تھی۔ فن پر بھی دسترس تھی لیکن طبیعت شاعری سے افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہو گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ جب منجھلے بھائی مظہر امام حصول روزگار کے لئے کلکتہ چلے گئے تو ان کی لائبریری سے استفادہ کی کھلی آزادی مل گئی اور وہ افسانوی ادب کے سحر میں ڈوب سے گئے اور اسی سے افسانہ نگاری کی تحریک ملی۔ ان کا پہلا افسانہ ''بے وفا'' ۵۳ء میں ''چندن'' دہلی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے ۶۳ء تک کئی افسانے لکھے جو ''چندن'' دہلی ''سہیل'' گیا، ''صنم'' پٹنہ، ''صبح نو'' پٹنہ، ''کہانی'' کلکتہ، جام نو کراچی میں شائع ہوئے اور ان کی اچھی خاصی پذیرائی بھی ہوئی۔ ''جلتے چراغ، بجھتے چراغ''، ''نئی زندگی''، ''گیت

بے کیف ہے جب تک اسے نہ ساز ملے''، ''کچھ یادیں کچھ آنسو''، ''اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو''، ''انسان زندہ ہے'' ان کے خوبصورت افسانے ہیں۔ ''گیت بے کیف ہے جب تک نہ اسے ساز ملے'' کو پڑھ کرش۔ مظفر پوری نے بڑے سنجیدہ لہجہ میں کہا تھا: ''منظر امام بہار میں صرف دو ہی افسانہ نگار اچھی زبان لکھتا ہے ایک میں اور دوسرے تم''۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں انہوں نے بچوں کے لئے بھی کئی کہانیاں لکھیں جو ''کھلونا''، ''آج کل'' اور ''پھلواری'' دہلی میں طبع ہوئیں۔ ۶۰ء کے اوائل میں جب سید منظر امام انٹر میڈیٹ میں تھے، اپنے بزرگ دوست مجاز نوری کے اشتراک سے سہ ماہی ''رفتارِ نو'' در بھنگہ سے جاری کیا اس کے پانچ شمارے تواتر سے شائع ہوئے۔ اس جریدہ کو برصغیر کے بڑے بڑے قلمکاروں کا تعاون حاصل تھا۔ ''رفتارِ نو'' کے تیسرے شمارہ میں ہندی کے معروف اور معتبر کہانی کار وناول نگار فنیشور ناتھ رینو کا سہیل عظیم آبادی پر ایک دلچسپ خاکہ شائع ہوا جو صرف ''رفتارِ نو'' کے لئے لکھا گیا تھا۔ رینو جی پر لکھے گئے کئی مضامین اور تحقیقی کتابوں میں اس خاکے کا ذکر بطورِ خاص ہوا ہے اور حوالے میں ''رفتارِ نو'' کا نام پیش کیا گیا ہے۔ ''رفتارِ نو'' ہی میں مظہر امام کی ایجاد کردہ پہلی آزاد غزل اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ وہ ۶۴ء میں بغرض ملازمت جمشید پور چلے گئے۔ مگر صحافت کی یہ چنگاری سلگتی رہی۔ وہاں معروف افسانہ نگار اور اپنے دوست منظر کاظمی کے ساتھ مل کر چینی جارحیت کے خلاف لکھے گئے نمائندہ افسانوں پر مشتمل ایک انتخاب ''ہمالہ کے آنسو'' ترتیب دیا۔ ۷۳ء میں ایک بڑا ہی خوبصورت رسالہ ''ترسیل'' کا جمشید پور سے اجراء کیا۔ اسے بھی بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا مگر ''ترسیل'' کو دوسری اشاعت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ حالاں کہ اس میں اس عہد کے تمام بڑے فنکاروں کی تخلیقات شامل تھیں۔ جید نقاد شمس الرحمن فاروقی کو جب یہ اطلاع ملی کہ ''ترسیل'' کا دوسرا شمارہ منظر عام پر نہیں آئے گا تو انہوں نے خط میں لکھا ''یہ جان کر بے حد ملال ہوا کہ ''ترسیل'' بند ہو گیا۔ عرصہ بعد ایک خوبصورت رسالہ دیکھنے کو ملا تھا''۔ ۷۶ء میں منظر امام دھنباد آگئے۔ یہاں گرونانک کالج میں بہ حیثیت لکچرار ان کا تقرر ہو گیا۔ اس عرصہ میں انہوں نے کچھ مضامین ضرور لکھے مگر شاید کوئی افسانہ اشاعت پذیر نہیں ہوا۔ لیکن صحافت کی آگ بجھی نہیں تھی۔ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔

آخر کار ۲۰۰۰ء میں سہ ماہی ''وقت'' منصۂ شہود پر آیا۔ اس کے آٹھ شمارے منظر عام پر آئے۔ ان میں سید امین اشرف، محمد سالم، سید احمد شمیم، اسلم بدر، علیم صبا نویدی پر خصوصی گوشوں کی اشاعت سے ادبی دنیا میں نام ومقام پایا۔ ملازمت، احباب کی صحبت اور زندگی کی دیگر مصروفیتوں نے انکی علمی وادبی توانائی کو قلم کی کاشت پر مرتکز ہونے نہیں دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی بھی صنف ادب میں سنجیدہ نہیں رہے۔ شاعری، افسانہ نگاری، تنقید نگاری، خاکہ نگاری، سوانح نگاری سبھی اصناف پر انہوں نے طبع آزمائی کی۔ کاش کسی ایک صنف میں بھی وہ سنجیدہ ہوتے؟ انکی مختلف تحریروں سے یہ اقتباسات ان کی ادبی قدوقامت متعین کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی تصنیف ''منظر شہاب: حیات اور فکر وفن'' پر مرقومہ ''اعترافیہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ایم صلاح الدین کے یہاں دیانت دارانہ وژن کی کمی نہیں ہے مگر تخلیقی پہلوؤں کی جانب انگشت نمائی کی کمی صاف محسوس ہوتی ہے ورنہ ''ساقی نامہ''، ''ایک رات'' اور ''چاندنی رات'' جیسی بے مثال نظموں کا سیر حاصل جائزہ لے سکتے تھے۔ منظر شہاب نے مرثیہ کے مخصوص فارم سے گریز کرتے ہوئے خوبصورت مرثیہ بھی لکھا ہے۔ کوئی چاہے تو اسے Elegy کے نام سے بھی موسوم کر سکتا ہے۔ میری مراد ''ماتم زکی انور کا'' اور ''شجر کے چوتھے جگنو کا آخری سفر'' جیسی نظموں سے ہے۔ جس میں شاعر کی دردمندی پڑھنے والے کے اندر بوند بوند اترتی محسوس ہوتی ہے اور نس نس میں درد کی

لہر بن کر سرایت کر جاتی ہے.........ان میں الفاظ احساس کے آنچ سے پگھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ان آنسوؤں کی ترسیل بن جاتے ہیں جو کاسۂ چشم میں ٹپک بھی نہ سکے اور اندر کی جھیل باہر کی آگ سے خشک ہو کر رہ گئی۔ میرا موضوع اگر منظر شہاب کے کمالات شاعری سے متعلق ہوتا تو دکھاتا کہ ''دوستو شہر میں آگ ہی آگ ہے'' ''آگ میں کب تلک خون اپنا جلائیں''، اور ''بارشیں خوں کی تیز ہیں'' ''تیز ہیں خون کی آندھیاں'' جیسی غزلوں میں کیسی آتش سیال موجزن ہے۔''

''تمثیل نو'' میں ان کی خودنوشت ''در بھنگہ دل سے جاتی ہی نہیں یاد تری'' قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ اس کے حسن بیان اور الفاظ کی سحر کاری پر مشاہیر ادب اپنے مکتوبات میں رطب اللسان ہیں۔ دو اقتباس اس سے بھی ملاحظہ فرمائیں:

''سالم کی دوستی کو میں اپنی زندگی کا بیش قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اس کی رفاقت مجھے ایسے چشموں پر لے گئی جس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سرد تھا۔ اس کی ملاقات سے قبل میری زندگی بہت کمٹی ہوئی، سکڑی ہوئی اور ''امیر منزل'' کی چہار دیواری تک محدود تھی۔ سالم کا یہ احسان ہے کہ اس نے ایک جوئے آہستہ خرام کو راز سرشاریٔ رفتار سے آگاہ کیا۔''

ایک دوسری قسط میں اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر سادگی، نیکی اور خیر کو انسانی پیکر میں دیکھا جا سکتا ہے تو وہ میں نے اپنی اماں کو دیکھا جو محلے کی سن رسیدہ عورتوں کیلئے ہمیشہ بی بی رہیں اور کم عمروں کے لئے بی بی دادی۔ فصل کے فصل کے موقع پر گاؤں سے اناج وغیرہ آتا تو حاجت مندوں میں جھولیاں اور گھڑے بھر بھر کر بانٹتیں۔ خود بہت کم کہیں جاتی تھیں مگر گلی محلے کی غریب عورتیں اکثر ان کی پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھی رہتیں۔ اپنی اپنی پریشانیاں انہیں سناتی رہتیں۔ ان کے یہاں غریب، امیر، بڑے چھوٹے کا کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ اناج ہی نہیں محبتیں بھی جھولیاں بھر بھر کر بانٹنا جانتی تھیں۔''

''تمثیل نو'' میں ہی طبع اپنے مضمون ''عبدالمنان طرزی اور رفتگاں و قائماں'' میں ان کی تحریر کا جادو دیکھئے:

''تخلیق ادب بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ اتنی محنت درکار ہے کہ کبھی کبھی جسم کا خون پسینہ بن کر بہنے لگتا ہے۔ طرزی کی اس کتاب کے مکالمے، اس کی تزئین و ترتیب اور اس کے کٹورے سے کٹورا بجاتے ہوئے اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کی کشید شاعر کے خونِ جگر سے ہوئی ہے۔''

ایک اور قسط میں مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی کا ذکر کرتے ہوئے رسم طراز ہیں:

''سہیل عظیم آبادی بھی کیا خوب آدمی تھے۔ ان کی گفتگو اور گفتگو کی جاذبیت، کبھی نصیحت، کبھی ڈانٹ اور کبھی احترام آمیز انداز۔ وہ ہمیشہ وقت کی حدود سے آزاد رہے۔ مختصر افسانے کے ابتدائی دور میں بھی وہ ادیبوں کی پہلی صف میں موجود رہے اور جدیدیت کے زمانے میں بھی اس افسانوی گروہ کے سرخیل رہے۔ وقت نے اپنا سایہ ان پر کبھی نہیں ڈالا شاید اسی لئے وہ ہمیشہ سہیل بھائی بنے رہے، سہیل چچا بہت کم۔''

سید منظر امام نے کم ہی لکھا لیکن جو بھی لکھا، جتنا بھی لکھا خواہ وہ افسانے کی شکل میں ہو مضامین کی شکل میں ہو یا اداریوں کی صورت میں وہ سب ہماری ادبی تاریخ کا صرف حصہ ہی نہیں ہیں بلکہ تاریخ کو نئی سمت عطا کرنے میں معاون ہوئے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کی نگارشات کتابی صورت میں جلوہ گر ہوں۔ ان کے اداریوں کو مرتب کیا جائے اور انہیں محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے کہ کم لکھنے اور رک رک کر قدم بڑھانے کے باوجود سید منظر امام کے اندر کا ادیب، کہانی کار اور صحافی ابھی زندہ ہے۔

ڈاکٹر محسن جلگانوی، حیدرآباد

تمثیل نو: ایک مطالعہ
(اکتوبر ۲۰۰۷ تا جون ۲۰۰۸ء)

ادھر پچھلی ایک دہائی سے اردو کے منصۂ شہود پر آئے دن نت نئے ادبی و نیم ادبی جرائد و رسائل شائع ہو کر صحافتی دنیا میں اپنا نام درج کروا رہے ہیں ان سے چند ایک مختصری مدت کے بعد قارئین اور خریداروں کی عدم دستیابی اور مالیہ کی تنگ دامنی کی وجہ سے دم توڑ دیتے ہیں۔ جرائد کی اشاعت کی مسدودی کی اک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس کاروبار حرف وصوت میں وہ لوگ کود پڑتے ہیں جنہیں صحافت ادب اور علم کی شدبد ہوتی ہے نا ان میں معاملات سود و زیاں کا شعور ہوتا ہے۔ لیکن اسی بھیڑ میں چند باشعور لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو وقت کی نبض پر اپنا ہاتھ رکھتے ہیں ان میں ایک تازہ کار نام امام اعظم کا ہے جو ایک اچھے صحافی بھی ہیں فعال ادیب بھی اور شاعر بھی۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے دربھنگہ سے ایک اہم رسالہ ''تمثیل نو'' کے نام سے نکال رہے ہیں۔ اس جریدہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ امام اعظم ہر شمارہ کو کسی نہ کسی حیثیت سے ایک دستاویزی حیثیت دے کر پیش کرنے کا قدم اٹھاتے ہیں اور اکثر اس کوشش میں کامیاب بھی رہتے ہیں۔ ابھی ابھی تمثیل نو نے ''پہلی جنگ آزادی 1857 اور اردو زبان کا کردار'' کے عنوان سے ایک بھرپور شمارہ اردو کے قارئین کے لئے پیش کیا تھا جس کی جامعیت اور افادیت کا خواص کے ساتھ عوام میں بھی خیر مقدم کیا گیا۔ ''تمثیل نو'' کی یہ انفرادیت رہی ہے کہ وہ اپنے ہر شمارے کو ''کچھ نیا' کچھ الگ'' کے خطوط پر پیش کرتا رہا ہے۔ اب جو اس جریدے کا تازہ شمارہ آیا ہے اس میں ''سہرے'' جیسی نیم ادبی صنف سخن کو ادبی حیثیت اور معنویت دینے کی ایک انوکھی کوشش کی گئی ہے اور ''سہرا'' کے موضوع پر علاحدہ سے ایک خصوصی مطالعہ کے تحت ایسے نو عدد گرانقدر مضامین کو جمع کیا گیا ہے جس میں سہرے کی معنویت، سہرے کی عصری معنویت، سہرے کی ادبی معنویت، غالب اور ذوق کے سہرے، سہرے کی فنکاری، سہرے میں شعری اسلوب جیسے موضوعات پر مشاہیرین ادب کی تحریریں ہیں۔ لکھنے والے اہم اہل قلم میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق، پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، احسان ثاقب، سیف رحمانی، اور مامون امین شامل ہیں۔ اپنے اداریہ میں امام اعظم نے سہرے کی نگارش کا تقابل فلمی گیت نگاری سے کرنے کی کوشش کی ہے جس میں کفن پہلے تیار ہوتا ہے اور اس میں مردہ کو بعد میں ڈالا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ ضرورت کے تحت کی جانے والی شاعری ہے جس میں تک بندی، خیالات کی یکسانیت، ضروری اور غیر ضروری ناموں کی شمولیت، بے غنائی، شعریت، بھرتی کے مضامین و خیالات اور فرمائشی امور جگہ پاتے ہیں۔ سہرے کی ایک عمومیت یہ رہی ہے کہ اس کی ردیف کی تان سہرے کے لفظ پر ٹوٹتی ہے۔ سہرا نگاری کی روایت کا پتہ سب سے پہلے بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ملتا ہے جب غالب کی انانیت اور ذوق سے ان کی معرکہ آرائی نے ان سے یہ شعر کہلوایا:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ۔۔۔ دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

اور جواباً استادِ سخن ذوق کے قلم سے یہ شعر نکل آیا:

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اسی سہرے کی وجہ سے غالب کو بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں "معذرت نامہ" پیش کرنا پڑا تھا۔

اردو میں سہرا نگاری کی روایت بہت قدیم ہے اور غالب و ذوق کے سہرے اپنے معیار و اعتبار سے اردو شاعری کی آبرو ہیں۔ ابتدائی سہرے پابند نظم کے انداز ہی میں لکھے گئے لیکن ادھر چند برسوں میں سہرے کی ہیئت میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں۔ بہت سے شاعروں نے آزاد شاعری کے فارم میں اور نثری نظم کی صورت میں بھی سہرے لکھے ہیں اور بحر، ردیف، قافیہ اور روایتی مضامین سے بھی روگردانی کی ہے۔ اب سہروں کی بجائے تہنیتی اور توشیحی نظمیں بھی لکھی جانے لگی ہیں۔

عہد جدید کے بعض نقادانِ ادب نے سہرے کو جہاں روایتی، سطحی اور از کار رفتہ صنف قرار دیا ہے اور اس کی سماجی و ادبی معنویت سے انکار کیا ہے وہیں بعض اہل قلم نے سہرے کی افادیت اور معنویت کو اجاگر کیا۔ اس ضمن میں سابق ڈائرکٹر دوردرشن جناب جمال الدین ساحل کا خیال ہے کہ:

> "فرمائش پر سہرا نویسی سے اس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ جو جتنا بڑا فنکار ہوتا ہے اتنی ہی خوبی سے اپنی بات کہتا ہے۔ اپنے احساسات کو شعری پیکر عطا کرتا ہے، نئی لفظیات کو سامنے لاتا ہے اور ایک تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ بھرتی کے اشعار بھی سہروں میں ہوتے ہیں لیکن انہیں محض تک بندی نہیں کہا جا سکتا کہ اسے سلیقۂ اظہار سنبھالے رکھتا ہے۔"

اس شمارے میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے بڑی تفصیل سے "اردو میں سہرے کی معنویت" پر گفتگو کی ہے اور عہد بہ عہد سہرا نگاری سے ہونے والی تبدیلیوں کو اساتذۂ سخن کے کلام کے نمونوں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ مناظر نے خاص طور پر فیض احمد فیض کا وہ سہرا نقل کیا ہے جس میں سہرے کا لفظ لائے بغیر شخصی علامات کو سامنے رکھ کر جمالیاتی ملاپ سے کام لیا گیا ہے۔ انہوں نے غالب سے لیکر عہد حاضر کے امام اعظم تک کے سہروں کے اشعار پیش کر کے سہرے کے منظر نامہ کو اجاگر کیا ہے۔ پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق نے اپنے مضمون میں سہرے کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف سخن رخصتی، رخصتی نامہ، وداعیہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک صنف "ازار بند" کا بھی ذکر کیا ہے اور "بند کمرے" میں پیش کی جانے والی ازار بند کی ردیف کی شاعری کے قوافی کی مختصر فہرست بھی پیش کی ہے۔ (اچھا ہوا کہ وہ جلد ہی اصل موضوع سہرا کی جانب لوٹ آئے ورنہ کیا کیا کچھ گل کھلے ہوتے؟)

اپنے مضمون میں پروفیسر مجید بیدار نے سہرا نگاری کو اردو میں جاگیرداری نظام کے فروغ کا نتیجہ قرار دیا اور شہزادوں، امیروں اور امیرزادوں کی شادیوں کے موقع پر درباروں اور محفلوں میں سہرا پیش کرنے کی روایت کو اردو شاعری میں قدیم دور سے موجود رہنے کی توثیق کی ہے۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی اور شاکر خلیق کے مضامین سے بھی سہرے کے وجود کی بات غالب وذوق کی معرکہ آرائی سے شروع ہو کر مخمس، مسدس اور تہنیتی نظموں تک آ پہنچی ہے۔ آخر میں احسان ثاقب کے مضمون سے قابل مطالعہ چند سطور پر بات کو ختم کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کبھی کبھی اس موقع پر (سہرا خوانی کے موقع پر) بعض شاعر داد و دہش کے ساتھ سینکڑوں روپے بٹور لیتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد ضمیر معروف افسانہ نگار کے بڑے بیٹے کی برات مدھوپور گئی تو وہاں جناب علقمہ شبلی نے سہرا باندھنا شروع کیا۔ ایک صاحب نے دس روپے کا ایک نوٹ ان کی جانب بڑھا دیا۔ شبلی صاحب کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، کہنے لگے: ''اچھا شاعر کبھی بھانڈ نہیں ہوتا''۔ دوسری جانب جناب رونق نعیم کو سہرا پڑھتے اور روپیہ وصول کرتے دیکھا گیا۔ ایک موقع پر عابد ضمیر 56 منٹ تک سہرا پڑھتے رہے اور سہرے کی ستائش سے ملی کل رقم 11,670 روپے ایک مقامی مسجد کے انتظامی امور میں بطور عطیہ دے دی۔ ان تمام سخن گسترانہ باتوں سے قطع نظر ماضی میں جنوبی ہندوستان میں سہرے کی روایت رہی ہے لیکن اب یہاں سہرا گوئی اور سہرا خوانی کم کم ہی نظر آتی ہے شاید شمالی ہند کے علاقوں میں سہرا خوانی کی روایت اب بھی زندہ ہے اسی لئے امام اعظم نے اس صنف کے فن، تکنیک اور معنویت پر بحث کے لئے یہ منفرد شمارہ پیش کر کے اس صنف کی بازیافت کی متحسن کوشش کی ہے۔ اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے۔ سہرے کی سرگذشت کے بعد پروفیسر سید امام منظر کی ''یہ سرگذشت ہی ہے'' کی چھٹی قسط شامل شمارہ ہے۔ اس مرحلہ سے اظہار خیال دخل در معقولات قرار پائے گا کہ ابھی اس سرگذشت کی باقی اقساط بھی آنی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ منظر صاحب کی یہ سرگذشت کتابی شکل میں آجائے اور قاری اس سے یکمشت استفادہ کر سکے۔ مولانا ولی رحمانی نے جنگ آزادی پر لکھے مضمون ''کیا ۱۸۵۷ء کی جدوجہد پہلی جنگ آزادی تھی......؟'' میں مرکزی حکومت کی جنگ آزادی تقاریب منانے کے فیصلہ کو اچھا اقدام قرار دیا۔ اس ضمن میں حکومت نے ہر چند کہ قابل لحاظ رقم مختص کئے لیکن ان تقاریب کو ملک بھر میں جس انداز سے منایا گیا اس میں کہیں خلوص نیتی اور جوش و خروش نہیں دیکھا گیا۔ این ڈی اے ریاستوں میں تو جنگ آزادی کی ان تقاریب کو نظر انداز ہی کر دیا گیا کیوں کہ اس کا راست تعلق بہادر شاہ ظفر، علمائے کرام اور مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے تھا۔ رحمانی صاحب نے ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کی جدوجہد کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا لیکن یہ بات ثابت ہے کہ یہ جنگ آزادی آخری مسلح جدوجہد تھی اور جس خونیں اختتام پر بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر دیا گیا تھا افسوس ہے کہ اردو صحافت میں ''تمثیل نو'' کے خصوصی نمبر کی طرح دیگر رسالوں نے خصوصی توجہ نہیں دی اور نہ اردو اداروں، تنظیموں اور اخبارات نے ان تقاریب کو اتنی اہمیت دی جتنی دی جانی چاہئے تھی۔ بعد کے پانچ مضامین مختلف کتابوں پر کئے گئے تجزیوں اور خصوصی مطالعوں کے باب میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم کا محمد علی اشرف فاطمی پر لکھا مضمون فاطمی صاحب کی مختلف فلاحی خدمات اور ملت کی دردمندی کی نشاندہی کرتا ہے۔ جناب یٰسین احمد نے اپنے تبصرہ میں تمثیل نو کے جنوری تا ستمبر کے شمارہ کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ حسب معمول اہم افسانہ نگاروں میں فاروق راہب، نعیمہ ضیاء الدین، آصف الدین طارق، سید مظفر شعیب ہاشمی وغیرہ کے افسانے شامل ہیں۔ اسی شمارہ میں ''مخصوص شاعر'' کے تحت افتخار اجمل شاہین کا مختصر تعارف اور دو غزلیں دی گئی ہیں جو ناکافی لگتی ہیں۔ حصہ نظم میں نثری نظمیں، نظمیں، غزلیں پیش کی گئی ہیں لیکن بہت سے لکھنے والوں کی نمائندگی دینے کی کوشش میں چند اہم شاعر بے توجہی کا شکار ہو گئے ہیں۔ تبصروں کے باب میں کوئی چالیس مختلف کتابوں مختلف مبصرین کے تبصرے شامل ہیں جن میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، حسن امام درد، ڈاکٹر ایم اصلاح الدین، شکیل احمد سلفی، فیاض احمد وجیہہ، صفی اختر، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر امام اعظم وغیرہ شامل ہیں۔ ایک ہی شمارہ میں اتنی بڑی مقدار میں تبصروں کی اشاعت تمثیل نو کا ایک ریکارڈ ہے۔ مواد اور معیار کی اس عمودی پرواز کیلئے ادارہ قابل مبارک باد ہے۔

جاوید اختر چودھری، برمنگھم، برطانیہ

یا نصیب!

حامد کے والد روز نامہ دا ٹائمز (Daily The Times) خریدتے اور سب سے پہلے اداریہ پڑھتے۔ بڑے بھائی شاہد روز نامہ دا مرر (Daily The Mirror) باقاعدگی سے پڑھتے اور اخبار ہاتھ میں لیتے ہی اسپورٹس کا صفحہ اپنے چہرے کے سامنے پھیلا لیتے۔ اس لئے شاہد کو فٹ بال کے کھلاڑیوں اور کلبوں کے متعلق بہت ساری معلومات حاصل تھیں، چھوٹے بھائی زاہد روز نامہ دا سن (Daily The Sun) کا صفحہ نمبر تین دیکھتے اور مسکراتے اور گھڑ دوڑ کے صفحے سے چپک جاتے۔ لیکن حامد کو نہ تو اداریے سے کوئی دل چسپی تھی اور نہ ہی اسپورٹس اور صفحہ نمبر تین سے کوئی لگاؤ۔ اس کے ہاتھ جونسا بھی اخبار یا رسالہ لگتا تو وہ بس پیش گوئیوں والا صفحہ پڑھتا۔

گھر کے سب ہی افراد حامد سے مذاق کرتے......"بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اخبارات میں شائع شدہ پیش گوئیاں درست ہوں۔ دنیا کے لاکھوں کروڑوں افراد کی تاریخ پیدائش کے لئے ایک ہی برج ہوتا ہے جب کہ ہر فرد کے حالات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں تو پھر ایک ہی برج میں پیدا ہونے والے اشخاص کیوں کہ اسے درست تسلیم کرلیں۔ یہ کوئی علم نہیں محض فراڈ ہے۔" وہ اس لہجے میں اپنی بات کہتے جیسے وہ حرف آخر ہو۔ حامد ان کی باتیں سنتا اور مسکرادیتا۔ حامد کو پاکستان کے اردو اخبارات بہت پسند تھے۔ پہلے وہ اخبارات میں درجہ بند عنوانات کے مختصر اشتہارات (Classified Short Advertisements) پڑھتا۔ بعض عاملوں کے اشتہارات تو سارا سال اخبارات میں مستقل اسے ملتے۔ جیسے:

عامل میاں باقری کا اعلان

آپ کی ہر تمنا تین یوم میں پوری ہوگی۔ وہ خواتین وحضرات جو عاملوں اور جادوگروں کے پاس جا کر ناکام اور مایوس ہو چکے ہیں، صرف اور صرف ایک مرتبہ ساٹھ سالہ تجربہ کار عامل میاں باقری کو فون کر کے اپنی تمام الجھنوں اور مشکلوں کا تسلی بخش حل معلوم کریں۔ ہر کام سو فیصد گارنٹی سے کیا جاتا ہے۔ آزمائش شرط۔ مثلاً دل پسند شادی، سنگ دل سے سنگ دل محبوب کو قدموں میں لانا، کاروبار میں فائدہ، جادو ٹونے کا اثر، جن بھوت پریت کا سایہ، نافرمان اولاد کو تابع کرنا، دشمن سے نجات، امتحان میں کامیابی، لکی چانس، غرض کہ ان تمام پریشانیوں کا حل بذریعہ عملیات کیا جاتا ہے۔

(یا)

کالے وسفلی علم کی کاٹ و پلٹ کے ماہر

ہر انسان مقدر کا سکندر ہوتا ہے۔ انعامی چانس ہر انسان کو اللہ میاں نے دیا ہے۔ وہ خوش نصیب آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ صرف واسطہ اور وسیلہ تلاش

کریں۔ علم اور عملیات سے رہبری ہم کریں گے۔ آگے نصیب آپ کا۔ یہ دعویٰ نہیں حقیقت ہے۔ کلام الٰہی میں بڑی طاقت ہے۔ یقین کامل، پیر کامل۔ بہت سے بہن بھائی ہمارے تعویذوں سے کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ آج ہی رابطہ کریں۔ یقیناً کامیابی ہوگی عملیات کے ساتھ.......

عامل اے ایم شیرازی

(یا)

ہر الجھن کا خاتمہ تیس منٹ میں۔ ناکامی کسی کا مقدر نہیں۔ آزمائش شرط۔

عامل ایس ایس قیصرانی

(یا)

آپ کی ہر خواہش آپ کے قدموں میں۔ ستاروں کے میل وملاپ کے ماہر کا اعلان.........

م ش ساگر

(یا)

جس کو چاہو تابع کرلو.......... عامل این اے زبیری

(یا)

کالے عمل کا دشمن اور عملیات کا ماہر.......... این اے خاور

(یا)

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے.......... عامل روحانی بنگالی بابا

(یا)

تقدیر کو ناخنِ تدبیر سے بدل ڈالو، مایوسی اور ناامیدی کفر ہے۔ دلی تمناؤں کو خوشیوں میں تبدیل کرنے کا پیغام۔ انشاء اللہ آپ کی ہر خواہش پوری ہوگی۔ دشمن آپ کے قدموں میں.......... پروفیسر محمد شفیع کا اعلان

(یا پھر)

مؤکلات کے چلتے پھرتے کرشمے۔ جھوٹوں پر لعنت۔ علم وہ جو ہر جا پہنچے۔ خدا نے فرمایا ہے۔ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جو ناممکن ہو۔ بس کامیابی کے لئے انسان کا کامل ہونا شرط ہے۔ میں بذریعہ عملیات آپ کے دکھوں اور مصائب کا حل پیش کر سکتا ہوں۔

گولڈ میڈلسٹ ایم اے رحمانی

حامد عقل کے گھوڑے دوڑاتا...... ''اگر حکومتوں کے سربراہ یہ عامل ہو جائیں تو دنیا کے دلدر دور ہو جائیں''۔ اس کی

ماں اُس کی ان اشتہارات میں غیر معمولی مشغولیت اور دل چسپی دیکھا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے بیٹے کو بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر پیار سے کہا:

''بیٹے! گھر کے سب لوگ تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان واہیات اشتہارات کو مت پڑھا کرو۔ یہ سب فراڈ ہے۔'' حامد نے ماں کی بات سن کر اس طرح دیکھا جیسے کوئی کسی معصوم چار سالہ بچے کی بے معنی بات سن کر اس کی جانب دیکھتا ہے۔ اور بولا: ''ماں! اشتہارات تو وہ لوگ دیتے ہیں جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مصنوعات کی مانگ ہے۔ یہ جو اتنے سارے لوگ تواتر سے اشتہارات دیتے ہیں، آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ یقیناً دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو ان اشتہارات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اشتہار دینے والوں کے ٹیلی فون نمبر، موبائل ٹیلی فون نمبر اور پتے لکھے ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی یہ نہیں سنا یا پڑھا کہ کسی نے ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کیا ہو یا کہیں ان کی شکایت کی ہو۔''

اب بے چاری ماں کیا بحث کرتی۔ وہ چپ ہوگئی۔

ادھر حامد کبھی کبھی یہ سوچ کر الجھ جاتا کہ دنیا میں چند قوموں کے کروڑوں افراد اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کی نہ صرف پرستش کرتے ہیں بلکہ بیماری سے بچاؤ، مال وزر کے حصول اور دیگر دنیاوی و روحانی خواہشات کے برآنے کے لئے اُن سے مدد مانگتے ہیں۔ اگر بتوں کی پوجا سے من کی مراد پوری ہوسکتی ہیں تو چاند ستاروں کے علم سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

لیکن کبھی کبھار شک کی دراڑیں بھی پڑنے لگتیں۔ حامد کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ اس کی سوچ پر کوئی دوسرا مذاق اڑائے گا۔ وہ ہفتے بھر کے لئے اخبارات کی پیش گوئیوں کو اپنے سامنے رکھتا۔ اور خوش دلی سے ہفتے کا آغاز کرتا۔ اس نے چپکے سے انگریزی اخبارات خریدنا شروع کر دیئے تھے۔ جب تک وہ تمام اخبارات میں پیش گوئیوں کو پڑھ نہ لیتا کوئی کام شروع نہ کرتا۔ ستاروں سے متعلق پیش گوئیاں اُسے زندگی کے بارے میں بہت مثبت پہلوؤں سے آگاہ کرتیں۔ مثلاً، اُس وقت تک مالی آزادی کا حصول مشکل نہ ہوگا جب تک آپ یہ یاد رکھیں گے کہ آپ کہاں سے اور کن حالات سے گذر کر آئے تھے۔

اس بات کا یقین کریں کہ کچھ لوگوں کو اپنی تقدیر بنانے کا ہنر آتا ہے۔ اور ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی کامیابی کی سیڑھی اوپر چڑھنے کے لئے مدد دیتا ہے۔ آپ اپنے ساتھیوں سے اچھے سلوک کریں۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی تمہیں کامیابی کا موقع فراہم کردے گا۔ لہٰذا تعلقات کو مضبوطی سے استوار کریں۔

حامد جب یہ پڑھتا تو خود احتسابی کے عمل سے گذرتا اپنے ساتھیوں سے ملنے جلنے میں انکساری اور خلوص سے کام لیتا۔ لوگ بھی جواباً اس سے مروت سے ملتے۔ اُسے زندگی کا یہ پہلو بہت اچھا لگا۔

اور حامد جب کبھی پڑھتا کہ...... ''اس ہفتے میں جس کام میں ہاتھ ڈالو گے تو وہ کام قریب قریب سر انجام دے لوگے اور تمہارے اور دوسروں کے درمیان معاملات آسانی سے طے ہوسکیں گے۔ ذہنی طور پر محتاط رہنا ضروری ہے''۔ حامد ہفتہ گزارنے کے بعد اپنے کاموں پر نظر ڈالتا تو اسے خوشی ہوتی کہ اس کے بیشتر کام پورے ہوگئے۔ حامد کے اعتماد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک ہفتے اتفاق سے تمام اخبارات نے پیش گوئی کی کہ اسٹاک مارکیٹ (Stock Market سٹہ بازار) میں سرمایہ کاری سے فائدہ ہوگا۔ حامد نے دس ہزار پونڈ بنک میں جمع کرر کھے تھے۔ اُس نے کسی سے مشورہ کئے بغیر بلو چپ اسٹاک (Blue Chip Stock) میں سے ایبے نیشنل بنک (Abbey National Bank) کے حصص بحساب تین پونڈ فی حصہ اور ایک انشورنس کمپنی کے کچھ حصص بحساب دو پونڈ فی حصہ اور سافٹ ویر کمپیوٹر سروسز کی کمپنی آٹو نومی کارپوریشن (Autonomy Corporation) کے چند ہزار حصص بحساب ساٹھ پینس فی حصہ خرید لئے تھے۔ حامد نے اب پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اسٹاک مارکیٹ میں حصص کے اُتار چڑھاؤ میں بھی دلچسپی لینا شروع کردیے تھے۔ چند ماہ گزرے تو اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ کوئی بڑا بنک کسی چھوٹے بنک کو خریدنے کے اقدامات کررہا ہے۔

خبر شائع ہوتے ہی ایبے نیشنل بنک کے حصص کی قیمت بڑھنے لگی اور بارہ پونڈ فی حصہ تک پہنچ گئی تھی۔ اسی دوران ایک اور خبر آئی کہ دو انشورنس کمپنیاں کا آپس میں الحاق ہونے والا ہے تو جس کمپنی کے حصص حامد نے خرید رکھے تھے ان کی قیمت بھی دوگنی ہوگئی تھی۔ اُدھر آٹو نومی کارپوریشن کے حصص کسی پراسرار شخص نے خریدنے شروع کئے تو ساٹھ پنس کا شیئر پندرہ پونڈ تک جا پہنچا۔ حامد پر نشے کی سی کیفیت طاری رہنے لگی تھی۔

والدین کے کان میں کسی صورت بھنک پڑی کہ حامد نے اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کی ہے تو وہ بہت گھبرائے۔ حامد کے والد کو بہت سارے ایسے لوگوں کے متعلق معلومات تھیں جو اسٹاک مارکیٹ کے ہاتھوں تباہ ہو چکے تھے۔ باپ نے بیٹے سے دریافت کیا تو حامد نے جواب دیا:

''ابا جان! آپ فکر نہ کریں میں اسٹاک مارکیٹ کو خوب سمجھتا ہوں۔
یقین جانیں میرا روپیہ محفوظ ہے۔''

جس پر باپ سے صرف یہ کہا:

''اِف یوڈونٹ نو ہو یو آر، دین اسٹاک مارکیٹ از دا ورسٹ پلیس ٹو فائنڈ آؤٹ (If you don't know who you are, then stock market is the worst place to find out (اگر تمہیں اپنے بارے میں شبہ ہے کہ تم کچھ ہو تو سٹہ بازار پہچان کے لئے سب سے نامعقول جگہ ہے)۔ بیٹے اسٹاک مارکیٹ میں بڑے بڑے ذہین لوگ تباہ ہو چکے ہیں۔ اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری انتہائی خطرناک ہے۔ اس کھیل سے باز آجاؤ۔ یہ ستاروں کی پیش گوئیاں اور اسٹاک مارکیٹ تمہیں کہیں کا نہ رہنے دیں گے۔''

حامد نے باپ سے بحث نہ کی اور ان سے صرف یہ کہا کہ وہ شغل کے طور پر پیش گوئیاں پڑھتا ہے اور جو کچھ اس نے کیا ہے محض جبلی حس کے تحت کیا ہے۔

حامد کو سرمایہ کاری کئے ہوئے ایک سال ہو چلا تھا۔ اور جس ہفتے ستاروں کی گردش پر پیش گوئی کرنے والوں نے کہا کہ دنیا میں کوئی بڑا حادثہ رونما ہونے کو ہے جس سے اسٹاک مارکیٹ میں بھونچال آنے والا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کسی انجانے خوف کے تحت اس نے ایک دم اسٹاک مارکیٹ میں اپنے شیئر فروخت کردیئے۔ اُسے مجموعی طور پر پچاس ہزار پونڈ کا فائدہ ہوا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کا حادثہ رونما ہوا۔ دنیا بھر کے

اسٹاک مارکیٹوں میں زبردست زلزلہ آیا۔

پورے ہفتے ٹیلی ویژن کے اسٹاک مارکیٹ کے اسکرینوں پر صرف اور صرف سرخ ہندسے ہی نظر آتے رہے تھے۔ حصص کے کاروباری حواس باختہ ہو گئے تھے۔ کھربوں ڈالر اسٹاک مارکیٹ سے وچپ آؤٹ (Wipe-out نیست و نابود) ہو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سرمایہ دارانہ نظام معیشت دم توڑ رہا ہو۔ ہزاروں چھوٹی کمپنیاں ایک ہی جھٹکے میں اسٹاک مارکیٹ سے غائب ہو گئی تھیں۔ حامد کے گھر والے حامد کی سرمایہ کاری سے پہلے ہی پریشان تھے، گیارہ ستمبر کے حادثے کی خبر سن کر باپ نے اُس سے تادیباً دوبارہ کہا:

''لگتا ہے ستاروں کی پیش گوئیاں اور اسٹاک مارکیٹ نے تمہیں تباہ کر دیا ہے۔''

لیکن حامد نے انہیں بڑے اطمینان سے اپنے بروقت اقدامات کے متعلق بتایا کہ کس طرح حادثے سے چند دن پیشتر تمام اسٹاک فروخت کر کے اسے ایک سال میں کم از کم پچاس ہزار پونڈ کا فائدہ ہوا تھا۔ گھر کے افراد نے سنا تو ان کے تاثرات گو ملے جلے تھے تاہم انہیں حامد کی قسمت پر رشک تھا۔

۲۴/ستمبر کو حکومتِ امریکہ نے واقعات کی سنگینی کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ قوم کی مورال (morle حوصلہ) کو بحال کرنے کے لئے چند انقلابی اقدامات، خصوصاً اسٹاک مارکیٹ میں عوام کے اعتماد کو واپس لانے کے لئے، کئے کیوں کہ امریکہ میں ہر تیسرا آدمی اسٹاک مارکیٹ کے ساتھ کسی نہ کسی طور ملوث ہے۔ سرمایہ داری نظامِ معیشت ناکام نہیں ہوا تھا صرف اس میں وقتی طور پر رخنہ پڑا تھا۔ ستاروں کی گردش بتانے والوں اور اسٹاک مارکیٹ کے تجزیہ نگاروں نے حالات کی بہتری کی طرف نشاندہی شروع کر دی تھی۔ ۲۰۰۲ء کے اوائل میں منجموں اور اقتصادیات کے تجزیہ نگاروں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ مضبوط قوت ارادی کے مالک لوگوں کے لئے سنہری موقع آ گیا ہے کہ وہ دوبارہ اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کریں۔ بینکنگ، ادویہ سازی اور پٹرو کیمیکل انڈسٹری میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ حامد نے ایک سال میں گو اتنا کما لیا تھا جو عام حالات میں وہ دس سال میں بھی پس انداز نہیں کر سکتا تھا تاہم گیارہ ستمبر کے حادثے سے اسے بھی اسٹاک مارکیٹ سے خوف زدہ کر دیا تھا۔ منجموں اور اقتصادیات کے تجزیہ نگاروں کی پیش گوئیوں کے باوجود وہ دو تین ماہ تک حصص کی خرید و فروخت سے باز رہا۔ لیکن چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جاتا۔

جوں ہی مختلف اخبارات کے نجومیوں اور اقتصادیات کے تجزیہ نگاروں کے حوصلہ افزا بیان شائع ہونے شروع ہوئے اور ہفتہ وار ان ویسٹر کرانیکل (Weekly Investor Chronical) کی ٹپس (tips نجی اور خفیہ معلومات کی اساس پر اندازے) کا جائزہ لیا تو انجانے جذبے سے مغلوب ہو کر فون اٹھایا اور ٹپس کے مطابق کمپنیوں کے حصص خریدنے کی ہدایات اسٹاک بروکر (Stock Broker) کو دے ڈالیں۔

حامد کے خریدے ہوئے حصص نے نمایاں ترقی کی۔ اسٹاک مارکیٹ نے کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیا تھا۔ پینی شیرز (Panny shares) نے خاص کر بہت اچھا پرفارم (perform مظاہرہ) کیا تھا۔ حامد نے اب اپنا زیادہ وقت اخبارات کے مطالعے کے علاوہ انٹرنیٹ (inter-net) سے مختلف نجومیوں کی پیش گوئیاں اور مالی امور سے متعلق شائع ہونے والے مخصوص اخبارات و رسائل بھی پڑھنا شروع کر دیئے تھے۔

جب عراق پر جنگ کے خطرات منڈلانے لگے تو اس نے تمام پیش گوئیوں کو بالائے طاق رکھ کر تمام حصص فروخت کردیئے۔ اور اسٹاک مارکیٹ سے باہر نکل آیا۔ اس عمل میں اس نے اچھا خاصا منافع کما لیا تھا۔

جنگ کے شروع ہوتے ہی اسٹاک مارکیٹ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ حصص کے نرخ تیزی سے گرنے لگے۔ لیکن حامد جو اس وقت لاکھوں کما چکا تھا خود اسٹاک مارکیٹ کا نامور اور بہتر قیافہ شناس بن گیا۔ اُسے ان پیش گوئیوں کا بنیادی راز معلوم ہو چکا تھا۔ اب اخبار والے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور معاوضہ دے کر اسٹاک مارکیٹ کے لیے قیافہ آرائی کرواتے تھے۔ لیکن سٹہ بازار میں دن پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ وہاں کا تیس منٹ کا نصف گھنٹہ بھی برسوں کی طوالت پر محیط ہوتا ہے۔ اس نصف گھنٹے میں کروڑپتی سڑک پر کاسہ لئے کھڑا نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب ایک بنک نے اپنی سالانہ رپورٹ میں پانچ سو ملین پونڈ کا ناممکن الوصول قرضہ (بیڈ ڈیبٹ Bad Debt) منسوخ (رائٹ آف write off) کردیا تو اس بنک کا بارہ پونڈ کا شیئر گھٹتے گھٹتے چار پونڈ کا رہ گیا۔ اسی طرح ایک سافٹ ویر اینڈ کمپیوٹر سروسز پروائڈر (Software and Computer Services Provider) کمپنی نے منافع میں کٹوتی (پرافٹ وارننگ Profit Warning) کا اندیشہ ظاہر کیا تو اس کا شیئر بیس پونڈ سے گھٹ کر ایک پونڈ تیس پینس کا رہ گیا۔ اور تب حامد کو اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کے خطرات کا شدت سے احساس ہوا۔

اقبال انصاری، ایف ۶ ۱۷/۷۔ پانڈو نگر، گلی نمبر ۳، دہلی ۱۱۰۰۹۱

رحیم یار خان

''جان پدر'' بوڑھے رحیم یار خان نے بڑی گہری سنجیدگی سے اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے زعیم یار خان سے کہا ''اگر تم نپولین بونا پارٹ بنو گے تو تمہارے لئے کہیں نہ کہیں ایک واٹرلو بھی تیار ہو جائے گا۔ اگر تم بے نی تو مسولینی بنو گے تو تمہارے ہی اٹلی میں ایک دن تمہیں فائرنگ اسکواڈ کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑے گا اور سر بازار تمہاری لاش اُلٹی لٹکا دی جائے گی، تاکہ لوگ اپنے تاناشاہ کا عبرتناک انجام کئی دن تک دیکھ سکیں۔ اگر تم اڈولف ہٹلر بنو گے تو تمہیں اپنے ہی جرمنی میں اپنے محفوظ ترین تہ خانے میں ایک دن خودکشی کرنی پڑے گی۔ اگر تم طاقت کے زعم میں جاپان بن کر کسی دن کسی پرل ہاربر کو بمبارڈ کر دو گے تو تمہارے بھی کسی ہیروشیما اور ناگاساکی کو ایک دن ایٹم بم جھیلنے پڑیں گے۔''

''صرف نپولین، مسولینی، ہٹلر اور جاپان ہی کیوں، اس دنیا میں تو موہن داس کرم چند گاندھی، مارٹن لوتھر کنگ، جان ایف کینیڈی اور راجیو گاندھی بھی مار دیئے جاتے ہیں'' تگڑے تندرست جسم اور مضبوط ہاتھ پیروں والا زعیم یار خان بڑی تلخی سے بولا: ''ڈیڈ، یہ اکیسویں صدی ہے، نپولین، مسولینی، ہٹلر، ہت سُوا دفوجی ڈا، مہاتما گاندھی، مارٹن لوتھر کنگ، جان ایف کینیڈی اور راجیو گاندھی سب آؤٹ ڈیٹیڈ ہو چکے ہیں۔ میں ان میں سے کچھ بھی بننا نہیں چاہوں گا۔'' ''پھر تم کیا بننا چاہو گے؟''

رحیم یار خان نے بڑی تجسس کے ساتھ اپنے اکلوتے بیٹے سے پوچھا۔

''مسلم نریندر مودی یا مسلم جارج بش''۔ بیٹے نے جواب دیا۔

بوڑھے رحیم یار خان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی۔ تقریباً ڈیڑھ منٹ کے بعد وہ سکتے کی سی حالت سے باہر آیا اور بڑے تاسف کے ساتھ بولا:

''اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم خودکشی کر کے حرام موت مر جاؤ۔''

❀❀❀

فاروق راہب ،شانتی پوری ،موتیہاری ۸۴۵۴۰۱(بہار)

انتہا سے پہلے کا المیہ

تمام ظاہری اور باطنی علامات جب مکمل ہوئے تو وہ ان کی طرف مڑا۔

''نہیں ،اب نہیں ۔''

''لیکن ۔''

''بس ،بہت ہوا۔''

''تمہارے ہر مرحلہ میں شامل ہم چل رہے تھے۔''

بے شعور سے شعور اور شعور سے لاشعور تک کی مسافرت میں حیات کے درخشاں دنوں کی چاہ میں کشمکش بھری لذتوں کے ہمراہ وہ رواں تھے ،ہر زینہ شان بے نیازی سے بے خوف وخطر طے ہو رہا تھا۔کہنہ وفرسودہ نظام سے نکل کر جہان نو کی تلاش تھی ۔کافی احتیاط اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھ رہے تھے۔اپنی ذات سے اپنی ذات تک کا اہم حصہ بننے کی تگ ودو میں سب مصروف تھے۔

اس کی معیت میں پر روشن آنکھوں کا حصار سخت تھا۔وہ اپنی گرفت میں بنے رہنے کی جہد کر رہے تھے۔کسی خاص ضابطے کی قید سے زیادہ انہیں کشادگی پر دھیان مرکوز کرنا تھا تا کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود سفر جاری رہے اور اپنے ہونے اور نہ ہونے کے بیچ کوئی غلط فہمی باعث رنجش نہ ہو۔

''ہشیار رہنا'' اکثر وبیشتر اس کی بابصیرت آواز ان کے درمیان چکر لگاتی ۔''وحشتوں کے پجاری کمال فن کی حصولیابی میں رخنہ ڈالیں گے۔ہوسکتا ہے ،تم ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاؤ،لیکن تمہارا اتحاد اور اعتماد تمہیں قائم ودائم رکھنے میں معاون ہوگا۔ہر حال میں خود کو قابو میں رکھو،ورنہ پھر وہی غلامانہ ذہنیت والی جہالت تمہارے پاؤں کی بیڑی ہوگی اور شیشۂ باطن دھندلا۔''

''ان سے نپٹنے کا کوئی طریقہ!''

''کیا ضرورت ہے ،کوئی بھی مضحکہ خیز حرکت انہیں جواز فراہم کر یگی اور تمہاری تباہی کا راستہ۔''

''پھر بھی۔''

''نہیں ۔انہیں لائق توجہ سمجھنے کی بھول نہ کرو۔تمہاری غیر معمولی صلاحیت کے صیقل کے لئے عظیم دانشوروں کے اقوال زریں تمہارے پاس ہیں۔ان کی صدق دل سے ورق گردانی کرتے رہو۔''

اپنی وراثت کی محافظت کے ساتھ اپنی بازیافت ان کے سفر کا لازمی حصہ تھی ۔سب ایک دوسرے پر سبقت کے لئے کوشاں تھے۔لیکن سب کی حیثیت اپنی جگہ مستند تھی کیوں کہ انکساری ان کے اندر ڈیرا جمائے ہوئے تھی اور اس میں معتبر شخص کا فہم انہیں اپنے نشانے پر لئے ہوئے تھا۔پھر وقتاً فوقتاً اس کی عالمانہ گفتگو ان کی دلچسپی اور انہماک کی نوک و پلک درست کرتی تھی۔

''سوال یہ نہیں کہ تم کیا حاصل کرنا چاہتے ہو۔ سوال یہ ہے کہ تم کیا حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ ایک دوسرے پر فوقیت سے بہتر ایک دوسرے کو سمجھنے میں وقت صرف کرو اور اپنا مقصد ہمیشہ پیش نظر رکھو۔ اس سے تمہارا تحیر اور تجسس سدا برقرار رہے گا۔''

''ہمیں اس کی خاطر۔''

''ارتقائی مراحل طے کرنے میں اپنی تسخیر بھی لازمی ہے۔''

نئی فکری رجحانات کے خیر مقدم کے لئے وہ چلے تھے کہ باسلیقہ لوگوں کی بھیڑ ان کے استقبال میں کہیں منتظر تھی، ایسا اس نے یقین دلایا تھا۔

''تم بہت جلد خوشگوار حیرت سے دوچار ہوگے۔ جب تمہاری شناسائی کے دعویدار تمہیں خوش آمدید کہیں گے اور تمہارے وجود کی خوشبوئیں تمہاری موجودگی کا اعلان کریں گی اور اغیار تمہارا اعتراف!''

''گویا، ہمیں اپنا عکس ڈھونڈنے کے لئے کسی چاندنی رات کا انتظار نہ ہوگا۔''

''تمہارا اپنا ہی لہو اتنا جوشیلا اور چمکیلا ہوگا کہ اپنی شناخت کے لئے کسی دوسری روشن شے کی ضرورت در پیش نہ ہوگی۔''

اپنے بیکراں پھیلاؤ اور وسعت، اپنی انا اور وضعداری کی سرمستی سے سرشار وہ متحرک تھے، ان کا خیال تھا کہ وہ لافانی قوت ہی ان کی طاقت ہے۔ جو انہیں مرنے نہیں دے گی۔''

''اپنے جنون کو یاد رکھو کہ یاد رکھنے کی چیز ہے۔ وقت کے بدلتے تیور سے شرمسار ہونے کے بجائے انہیں اپنی درس گاہوں میں قید کرو۔ اپنی ترویج کے ساتھ جب تم بلند معیار کو پہنچو گے تو عہد سازوں میں تمہارا شمار ہوگا، کیوں کہ تم عہد نو کے معمار ہو۔''

''کہیں ہم سمٹ تو نہیں رہے ہیں؟''

''نہیں! اندھی تقلید کے پیروکار تم سے الگ ہو کر غائب ہو چکے ہیں۔ وہ نقلچی تھے۔ تم افکار نو کے اصل بانی ہو اور اپنی تحریک کے ساتھ حرکت میں ہو۔''

وہ گرم سفر تھے۔ زہر آلود فضا میں سانس لیتے موافق و ناموافق حالات سے باخبر بھی۔ اندھیرا خوشحال روشنی سے منور تھا۔ دل و دماغ پر ابھی تھکن کا تصرف نہیں ہوا تھا۔ وقت کی یلغار اور ہیجانی ماحول کے تواتر حملے کے باوجود انہیں صحیح منزل اور دشا کا گیان حاصل ہوا۔ اس کی اساطیری شخصیت کی سرپرستی نے نامساعد حالات میں بھی انہیں ناآشنائی کا دکھ جھیلنے نہیں دیا۔ ان کی مدافعت میں وہ ہمیشہ چٹان کی مانند کھڑا تھا۔ کسی طرح کے بھی شک وشبہ کو داخل ہونے کی راہ نظر نہ آئی۔ اس کی توانا رہنمائی میں بامعنی تبدیلی رونما ہوئی۔ تمام سرسری دریافت کو پھر سے کھنگالا گیا اور ان میں پوشیدہ جواہر پاروں پر نئے سرے سے ترتیب و تزئین کا کام ہوا اور اس طرح نئی قندیلوں سے لیس ایک نیا معاشرہ تیار تھا۔ جس میں یقین و اعتماد کی اتنی چنگاریاں بھری تھیں کہ ان کی تپش سے زہر بھی امرت بن جاتا۔

لیکن!

خوابوں کے دھند سے نکل کر حقیقت کے پر شکوہ سینے پر جب وہ فخر سے تنے ایستادہ تھے تو اس کی رنگت میں اچانک ہوئی تبدیلی نے انہیں متحیر کر دیا اور وہ خوف زدہ ہوئے۔ ڈرے اور سہمے بھی۔

دل ہلانے والے انجام سے وہ بے خبر تھے۔ پر دہشت سناٹے کے تصور سے ہی وہ کپکپارہے تھے۔ پورا ماحول انہیں لرزتا ہوا سا لگا۔ جیسے قیامت کا اعلان ہونے والا ہو!

تشویشناک صورت حال سے وہ گذر رہے تھے۔ وہ بھی بہت مضمحل دکھا۔ کچھ بولنے سے پہلے اپنے اندر کے انتشار کو شاید یکجا کرنے کی سعی کر رہا تھا۔

''میرے ہمسفرو!'' تکلیف دہ اور کریہہ خاموشی کا آخر انت ہوا''چالیس سال، چالیس منازل یا چالیس یگ پلک جھپکتے میں ہم تک پہنچ گئے۔'' اس کا لہجہ انتہائی گمبھیر اور رقت آمیز تھا۔''اب وقت جدائی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔'' سب ایک ساتھ چلائے۔

''حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

''چالیس سال کی رفاقت کو تم یوں ایک لخت کیسے ختم کر سکتے ہو۔''

''نہیں، نہیں۔ بہت ہوا۔''

''ابھی تو اپنے موقف تک ہماری رسائی نہیں ہوئی ہے۔''

''نہیں! تمہاری پری کرما پوری ہو چکی ہے۔ اس لئے میں اپنی ذمہ داریوں سے مکتی چاہتا ہوں۔''

''بے بصیرت دنوں کا قصہ شاید پھر شروع ہوگا۔''

''تم ایسا احمقانہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو۔''

''تمہاری جدائی سے یہ آشکارا ہو رہا ہے۔ تمہیں اس کا گمان بھی نہیں کہ تمہاری عدم موجودگی ہمیں سوگوار کرے گی۔ ہمارے مابین ایک عجیب سے رشتے، پر مسرت سمبندھ، بے غرض تعلق کا جنم ہوا تھا۔''

''اگر احساس کے تار مضبوطی سے جڑے ہوں تو فاصلوں سے نہ کوئی چھوٹتا ہے اور نہ کچھ ٹوٹتا ہے۔''

سب کے سب اس کے ساتھ چلتے رہنے کے خواہشمند تھے۔ ان کے حساب سے ابھی بہت کچھ جاننا اور سیکھنا باقی تھا۔ کتنے رازہائے زمانہ ابھی پردہ میں تھے۔ جن کے افشا ہونے سے روح کو آسودگی اور ذہن کو تسکین میسر ہوتی۔ اس سے دور ہونے کے غم سے نڈھال اور دلوں میں اٹھتی ہوک سے مضطرب لب سے لہولہان الفاظ کسی طرح پھسلے''کیا واقعی؟'' اسے بھی خود کو سنبھالنا مشکل ہوا۔

''خود پر غور کرو، تم ایک دبستان ہو۔'' پر تاسف انداز میں انہیں دیکھتا ہوا وہ بولا''اپنے خانوں، تہہ خانوں کی گمشدہ وسعتوں کو تلاشو، دیکھو اور پرکھو، تمہیں راحت کے ساتھ اطمینان بھی ہوگا۔''

''مگر ہماری حمایت۔؟''

''اپنی مدد آپ کرو، کچھ ہو جائے اپنے راست گوردیوں پر اٹل رہنا اور خود کو نوحہ گروں کے قافلے میں ہرگز شامل نہ کرنا۔''

''تمہاری یہ پند و نصیحت اب کس کام کی۔''

"تمہارے پاس جتنے معرکے اور شہپارے ہیں وہ تمہیں ہمیشہ جاری رکھیں گے اور تمہارا کبھی اختتام نہ ہوگا۔"

لیکن اس بری خبر کو وہ جھیلنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ اس نقصان کو سمجھ رہے تھے جس کی تلافی قریب یا بعید ممکن نہیں تھی۔ وہ ایسا تاریخ ساز کردار کہاں سے مہیا کریں گے جوان کے داخلی اور خارجی کرب سے آشنا ہو۔ موج در موج بڑھنے کا سلسلہ انہیں ٹھہرا ٹھہرا سا لگ رہا تھا۔

"وہ صحیفہ جس کے مطالعہ نے ہمیں جلا بخشی اور لائحہ عمل طے کرنے میں سدا معاون و مددگار تھا اور پر پیچ و گنجلک راستوں کے بجائے صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین اور رہنمائی کی...... وہ بھی تو نہ ہوگا۔"

"خود کو محدود نہ کرو۔ تم باصلاحیت ہو۔ تمام عیوب و نقائص سے طاہر۔"

دردناک پل ان کے تعاقب میں بہت قریب آ گیا تھا جوان کی ہلاکت کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ ایسی جان لیوا شوریدہ گھڑی کی توقع نہیں تھی۔ معیار و مزاج کا ایسا پارکھی جانے کبھی نصیب بھی ہوگا!

"کیا تم اس دن کا انتظار نہیں کر سکتے جب ہم میں تمہارے جیسا ہی کوئی۔"

"ہرگز نہیں! ابتدا میری تھی اس لئے انتہا بھی میری ہوگی۔"

"ذرا ٹھہرو۔"

"نہیں! میرے اپنے منصوبے، اپنی خواہش، پیاسی تمناؤں کے ریگزاروں کی سیرابی اور۔"

اور اطراف میں پھیلی نمناک مایوسیوں کی پرواہ کئے بغیر اس نے الوداعیہ ہاتھ اٹھایا۔ اور انہیں صدمہ بھری اداسیوں کے بیچ حیران و ششدر چھوڑ گیا۔

اور وہ...... ٹوٹے، جھکے، تھمے......!

آگے بڑھنے کے عمل سے پہلے اس کے وداع ہونے سے پیدا خلا میں جھول رہے تھے۔
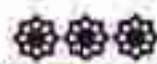
❀❀❀

سلطانہ مہر، انگلینڈ

کوڑے دان

خوش بخت عرف خوشبو کو دانشوروں سے ملنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنے کی خواہش اسے بے چین کئے رکھتی اور کوئی محفل ہو وہ پوری جان سے حاضر رہتی۔ کرار زاہدانی سے مل کر اسے محسوس ہوا جیسے اس کا نیا جنم ہوا ہو۔ کیسا جید عالم تھا وہ۔ اس کے اندر موجزن علم کا ساگر جب رواں ہوتا تو خوشبو اس روانی میں بہے چلی جاتی۔ رومیؔ اور حافظؔ کے لاتعداد اشعار اسے یاد تھے۔ بیشمار ادبی حوالوں سے وہ گفتگو کا آغاز کرتا اور خوشبو کو محسوس ہوتا جیسے اس کے اپنے اندر لاعلمی کا صحرا ویرانے سے نخلستان میں تبدیل ہو رہا ہے۔ وہ مارے خوشی کے نہال ہو جاتی۔ ایسے میں اس کی ملاقات حامد دانش سے ہوئی۔ وہ ڈنمارک سے دہلی اور پھر اسلام آباد ہوتا ہوا لندن پہنچا تھا۔ اتفاقاً خوش بخت نے فون پر کرار زہدانی کو بتایا تھا۔ وہ ''اردو کہانی'' کے سیمینار میں جا رہی ہے۔ لہٰذا کرار بھی وہاں پہنچ جائے تاکہ اس سے ملاقات ہو جائے۔ کرار نے ہی حامد دانش کا تعارف کراتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ وہ اندر سے کوڑا ہے۔ اسے آتا جاتا کچھ نہیں نہ ہی اس کا کوئی خاص مطالعہ ہے۔ بس اپنی دانش کی دکان چمکانے وہ ہر سال لندن چلا آتا ہے۔ خواہ مخواہ ''گلفام'' بنا پھرتا ہے۔ اس لفظ ''گلفام'' کی اصطلاح خوشبو کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاں اسے کرار کے اس جملے میں ایک مخصوص ''جلن'' کی بو ضرور محسوس ہوئی۔ جو اس کے سراپے میں اتر گئی۔

دوسرے دن پرل ریسٹورنٹ میں حامد دانش سے وہ ملی تو اس کو ایک انجانی مسرت محسوس ہوئی۔ لگا وہ شاید اس کی ہی منتظر تھی۔ بڑا ہی لئے دیئے رہنے والا اور بڑی نپی تلی گفتگو کرنے والا۔ پھر اس نے اردو کہانی پر اپنا مقالہ بھی بڑی خوش سلیقگی سے سنایا۔ بیچ بیچ میں اس کے عالمانہ اور دلبرانہ جملوں نے ایک خشک مقالے کو خاصا رنگ آمیز بنا دیا تھا۔ تقریب کے بعد قلم کار خواتین نے اسے گھیر لیا اور وہ مسکرا مسکرا کر کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ تب اسے کرار زاہدانی کا جملہ ''گلفام'' بنا پھرتا ہے یاد آ گیا۔ تب حامد دانش اسے کہیں سے بھی ''کوڑا'' نہیں لگا۔ اسی محفل میں اس کی ملاقات افسانہ نگار عظیم بلند شہری سے بھی ہو گئی۔ وہ ان سے کم کم ملتی تھی۔ حالاں کہ وہ اچھے خاصے پڑھے لکھے تھے۔ اسمارٹ بھی تھے مگر وہ جن سے بھی ملتے اپنی ''علمی بلندی'' پر پہنچ کر ملتے۔ ''ہم'' کی پہاڑی سے نیچے اتر کر بات ہی نہ کرتے۔ آج انہوں نے بھی مقالہ پڑھا تھا۔ خوشبو چوں کہ حامد دانش سے انٹرویو کرنا چاہ رہی تھی۔ لہٰذا وہ سیمینار ختم ہوتے ہی ان کی طرف دوڑی گئی اور قلم کار خواتین کے درمیان جگہ بنا کر ان سے ان کے قیام کا فون نمبر لے کر پلٹی تو ''عظیم بلند شہری'' سے ٹکرائی۔

'کیسا تھا ہمارا مقالہ......' وہ پوچھ بیٹھے۔ لہجے میں نیاز مندی اور امید کی ایسی کیفیت تھی کہ خوشبو کو کہنا پڑا۔

''ہاں اچھا تھا۔ اور کچھ تشبیہات بھی......'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ تڑسے بولے......'' مگر آپ عظیم دانشور سے انٹرویو کی بات کر رہی تھیں۔ بھئی کبھی ہمارا بھی انٹرویو کر لیں۔ اب ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں۔'' اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ مسکرائے۔ ''جی ضرور۔ ضرور......'' اس فوری تقاضے پر وہ

گڑبڑا گئی۔ انکار نہ کرسکی۔

''تو پھر کب حاضر ہوں آپ کے آفس میں...... ویسے ہم ایروں غیروں سے تو کہتے بھی نہیں۔'' وہ تھوڑے سے اترائے۔ اور اکڑے۔ ان کا چہرہ بگڑنے لگا۔ خوشبو جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔ فوراً بولی۔

''جی جی۔ میں جانتی ہوں۔ آپ کی علمی دھاک سے کون واقف نہیں۔ آپ ضرور تشریف لائیں۔ بس پہلے فون کرلیں تو آسانی رہے گی۔'' یقیناً یقیناً...... لیکن ہم چاہیں گے کہ حامد دانش کے...... انٹرویو سے پہلے...... ہمارا انٹرویو آجائے...... بھئی آپ تو ہماری اپنی ہیں نا......'' اور اپنائیت کے اظہار کے لئے انہوں نے خوشبو کا بازو تھپتھپادیا اور جھٹ سے آگے بڑھ گئے۔ خوشبو اس جسارت پر تلملا کررہ گئی۔ جیسے ناگ پھنی لگے کانٹے اس کے بازو چھو گئے ہوں۔ مگر تقریب میں اس کے لئے خاموشی ہی بہتر تھی۔ لہٰذا جلی بھنی آگے بڑھ گئی...... دوسرے دن عظیم بلند شہری بغیر فون کئے ہی آدھمکے۔ ان کے ہاتھ میں ان کے مقالات کی فائل بھی تھی...... بڑے نچھاور ہونے والے انداز میں سرکو خم کر کے بولے:'' وہ ہم یہاں سے گزر رہے تھے تو ہم نے سوچا آپ سے مل ہی لیں۔ آپ نے انٹرویو کے لئے کہا تھا......؟'' وہ صدقے واری جانے والے تاثرات چہرے پر سجائے ہوئے تھے۔

''جی تشریف رکھئے......'' اس نے اندر اندر ہی دانت بھینچ کر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کرسی سمیت انہیں اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ مگر ادب اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ اسی ''ادبی اخلاق'' کے دباؤ تلے دبی بیٹھی رہی اور ہونٹوں کو سکوڑ کر مسکرائی۔ یہ بھی اس کے مزاج کا تقاضا تھا۔

پھر ذکر چھڑ گیا گزشتہ کل کی ''اردو کہانی'' کی محفل کا...... اور حامد دانش کا اور ڈاکٹر فراز کا جو ماہر لسانیات تھے...... عظیم کہہ رہے تھے:'' یہ کیا بیچتے ہیں سب۔ بھلا ڈاکٹر فراز کی یہ عمر ہے ڈاکٹریٹ کی۔ ابھی جمعہ جمعہ چالیس برس کی عمر نہیں ان کی۔ اور وہ جناب پی ایچ ڈی کر بیٹھے لسانیات پر......''

انہوں نے نتھنے پھلاتے ہوئے مزید کہا:'' ہمیں پتہ ہے یہ ڈگریاں کہاں سے ملتی ہیں۔ آپ چلئے ہمارے ساتھ ہم آپ کو پی ایچ ڈی کرادیتے ہیں۔ بس ستر اسی پونڈ دے دیجئے۔ آپ کا مقالہ تیار ہو جائے گا۔ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی مل جائے گی۔ اور یہ حامد دانش۔ انہیں بھی میں خوب جانتا ہوں۔ ہمیں معلوم ہے انہیں مقالہ لکھ کر کون دیتا ہے۔ اور کون انہیں بلاتا ہے۔ ارے بھئی یہ خود اپنا ٹکٹ لے کر آجاتے ہیں...... اور...... اور'' وہ غالباً موزوں جملہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اور زبان سے ڈاڑھ میں پھنسی چھالیہ کا ٹکڑا نکالنے کی کوشش کررہے تھے۔

خوشبو کے سارے وجود میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔ کافی کا گھونٹ بدقت اس نے حلق سے اتارا۔ اپنے پرس سے اس نے چھوٹی سی پرفیوم کی شیشی نکالی۔ اسپرے کرنے کے لئے ڈھکن اتارا اور اس پر انگلی رکھ کر جھلاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔'' عظیم صاحب۔ گلاب کا پھول تو خوشبو پھیلاتا ہے۔ ذہنوں کو معطر کرتا ہے۔ مگر لگتا ہے علم وادب کے گلاب اپنی خوشبو کھو چکے ہیں۔ کیاریاں سوکھ چلی ہیں۔ اور یہیں کہیں اریب قریب۔ کسی کوڑے دان کا منہ کھل گیا ہے۔ میں معذرت چاہتی ہوں۔ مجھے ایک اسائنمنٹ یاد آگیا ہے۔ میں چلوں گی......'' آپ کا انٹرویو پھر کبھی...... سہی......'' اس نے بیگ اٹھایا اور ان کا جواب سنے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

آصفہ نشاط، لاس انجلس (امریکہ)

وزیٹنگ کارڈ

اس کی نئی کتاب کی تقریب اجرا تھی۔ اس سے پہلے اس کی تین کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ لیکن کسی بھی کتاب کی رسم اجرا نہیں ہوئی تھی۔ حالاں کہ اس کے احباب نے بہت اصرار بھی کیا تھا۔

وہ اپنی کتاب کی اشاعت پر بہت خوش تھا۔ ایک ادبی سوسائٹی نے تقریب اجراء کا اہتمام کیا تھا۔ شہر کے منتخب اور پڑھے لکھے لوگوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

وہ بروقت ہال میں پہنچ گیا تھا۔ لوگوں کی آمد بھی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے ہال پر نظر دوڑائی۔ تقریب کا ہال کشادہ اور خوب صورت تھا۔ تھوڑی دیر میں ہال بھر گیا۔ شرکاء محفل خوش وخرم دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مختلف ٹکریوں میں بے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور مشروبات پی رہے تھے۔ جوں جوں تقریب کا وقت قریب آ رہا تھا، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے اسٹیج پر خطاب کرنے کے فن سے آگاہی نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اسے مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلایا گیا۔ اسٹیج خوب صورت بینر اور گلدستوں سے سجا ہوا تھا۔ ساؤنڈ سسٹم بھی بہت اچھا تھا۔ تقریب کے ریکرڈ کے لئے ویڈیو کیمرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اسٹیج سکریٹری نے پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے لوگوں سے درخواست کی کہ خاموش ہو جائیں تاکہ مقررین دلجمعی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔

اس وقت تک وہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پا چکا تھا۔ اس کا ماضی اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ اس نے اپنی ''مٹی'' کو یاد رکھا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ جو لوگ اپنی ''مٹی'' سے پیار کرتے ہیں تو ''مٹی'' بھی اسے عزت دیتی ہے۔ ان لمحوں اسے اپنی اماں کا خیال آیا جو اسے اپنی ساری اولاد سے زیادہ چاہتی اور ہر وقت دعا گو رہتی۔ اسے اپنے مرحوم والد بھی یاد آئے۔ اس کے جی میں ایک دم ان کے زندہ رہنے کی تمنا نے انگڑائی لی۔ کاش وہ زندہ ہوتے اور اس خوب صورت اور باوقار تقریب کو دیکھتے تو خوشی سے نہال ہو جاتے اور اپنے ملنے والوں کے سامنے فخر سے سر بلند کر کے اپنے بیٹے کی کامیابی کا ذکر کرتے۔ اس کی نظروں کے سامنے اپنے گاؤں کی کچی گلیاں اور گلیوں میں چلنے پھرنے والوں کی صورتیں بھی اجاگر ہو گئیں۔

پھر اس نے اپنے دائیں طرف بیٹھی اپنی ''نصف بہتر'' کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ ''نصف بہتر'' نہیں بلکہ ''مکمل بہتر'' ہے۔

جذبات کی شدت سے اس کی آنکھوں کے کونے نم ہو گئے۔

اس نے بڑے انکسار سے اپنے رب کا شکریہ ادا کیا۔

اس نے سامنے بیٹھے ہوئے حاضرین مجلس پر نظر دوڑائی۔ ان میں جوان اور درمیانی عمر کے جوڑے اور کچھ ''چھڑے'' بھی نظر آئے۔ آسودگی اور بشاشت ان کے چہروں سے نمایاں تھی۔ مقررین نے اس کی کتاب پر

خوبصورت اور جاندار تبصرے کئے تھے۔ وہ اہم نکات لکھ رہا تھا اور گاہے گاہے سامعین کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

ایک بار پھر اس کا بچپن اسے یاد آیا تو بیساختہ عرفان مرتضیٰ ایک شعر اسے یاد آ گیا۔ اس نے زیرلب شعر گنگنایا:

پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت سی ہوتی ہے
کہ میں تو اپنے یاروں سے بہت آگے نکل آیا

اس نے مسرت بھری مستی سے دوبارہ شعر گنگنایا اور ایک بار پھر اپنی شریک حیات کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا جنہوں نے اس محفل کے انعقاد میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

تقریب کا پہلا دور ختم ہوا۔ وقفہ میں کھانا اور کتابوں کی فروخت کا پروگرام تھا۔

وہ کتابوں پر دستخط کرتا جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں بھی بنوائی تھیں۔ اور یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

اس وقفے میں ایک حسین و جمیل خاتون نے اس کی کتاب خرید کر اس کے سامنے یہ کہتے ہوئے رکھ دی کہ دستخط کے ساتھ اپنی پسند کے ایک دو شعر بھی لکھ دیں۔ اس نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ بہت دلربا اور نفیس خاتون تھیں۔ اس نے کتاب پر دستخط کئے اور کہا کہ وہ تقریب ختم ہونے کے بعد کوئی شعر بھی لکھ دے گا' کیوں کہ اس کے بہت سوچنے پر بھی ایسا کوئی شعر یاد نہ آیا جو اس خاتون کے شایانِ شایاں ہو۔

تقریب کے دوسرے مرحلے میں مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ اس دن اسے اچھے شعر سننے کو ملے۔ وہ حاضرین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاتون ایک ایسے مرد کے ساتھ بیٹھی تھی جو عام شکل و صورت کا مالک تھا اور جس کے متعلق اسے بعد میں پتہ چلا کہ وہ اس کا شریکِ حیات تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنی خوش شکل اور مکمل عورت اس معمولی صورت کے مرد کے ساتھ کیسے خوش و خرم ہوگی!

تقریب ختم ہوئی۔ لوگ رخصت ہونے سے پیشتر آپس رسمی جملوں کے تبادلے کر رہے تھے۔ اس نے نوٹ کیا کہ بہت سارے لوگ اس خاتون سے بات کرنے کو موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ جوں ہی وہ کسی سے ہمکلام ہوتی اس کا مرد بے چارگی سے ایک طرف کھڑا ہو جاتا۔ وہ عورت پیار بھری نظروں سے اپنے شریک حیات کو دیکھتی اور اپنی طرف کھینچ لیتی جیسے وہ اس کا حفاظتی حصار ہو۔

وہ ایک بار پھر صاحب کتاب کے پاس آئی اور شعر لکھنے کی فرمائش کی۔

اس نے دھیرے سے کہا۔

میرے پاس اپنا قابلِ ذکر شعر نہیں البتہ اگلے وقتوں کے دو شاعروں نے آپ کے لئے شعر لکھے ہیں سو ہی نذر کر رہا ہوں۔ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا کہ دعوت سخن کے لئے اس سے بہتر ہتھیار اور کوئی نہ تھا اور اس کی پشت پر دو شعر لکھ دیئے۔

رنگ' خوشبو' صبا' چاند' تارے' کرن' پھول' شبنم' شفق' آبجو' چاندنی
اس کی رنگین جوانی کی تکمیل میں حسنِ فطرت کی ہر چیز کام آ گئی

(شمیم کرہانی)

جو بھی آوے ہے ترے پاس ہی بیٹھا جاوے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

(میر حسن)

کارڈ پر لکھے اشعار پڑھتے ہوئے اس خاتون کے چہرے پر تمتماہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ تاہم اس نے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کچھ رکھائی سے صرف اتنا کہا۔

''وزیٹنگ کارڈ کا استعمال آپ نے خوب کیا ہے۔ آپ بھی موقع سے فائدہ اٹھانے والوں سے مختلف نہیں نکلے۔''

مزید کچھ کہے بغیر وہ اپنے شریک حیات کے پاس پہنچی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پلٹ کر ایک نظر صاحب کتاب پر ڈالی۔

اس لمحے اس کی آنکھوں میں تحفظ اور طمانیت کا گہرا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

سید مظفر شعیب ہاشمی، سابق آئی جی پولس (ویکر سیکشن) پٹنہ

رات گئی، بات گئی

جس وقت میں صاحب گنج سے چلا تھا۔ آسمان صاف تھا لیکن جنگل میں داخل ہوتے ہی پہلے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی اور کچھ ہی لمحوں بعد آسمان کا باندھ ٹوٹ گیا۔ اتنی زبردست بارش ہونے لگی کہ میری جیپ کی روشنی مدھم پڑتی چلی گئی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سڑک دکھائی نہیں دینے لگی تو میں نے جیپ کھڑی کردی۔ دونوں طرف کی کھڑکی کا شیشہ چڑھا ہوا تھا جس کی وجہ سے میرے بھیگ جانے کا امکان کم ہو گیا تھا۔ بغل کی سیٹ سے ٹکی میری دونالی بندوق راستہ بھر میرے بائیں پیر سے ٹکراتی ہوئی آئی تھی اور ابھی میرے زانو سے لدی کھڑی تھی۔ میں نے اسے سرکا کر بائیں طرف کے گیٹ سے ٹکادیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے نو بجے تھے۔ میں نے اوپری پاکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور سوچنے لگا۔ میں اس ضلع کا ڈسٹرکٹ فارسٹ آفیسر ہوں۔ آج چیف کنزرویٹر کی مٹنگ اٹینڈ کرنے کے لئے صاحب گنج گیا ہوا تھا۔ میٹنگ رات کے آٹھ بجے تک چلی، جب میٹنگ سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو پتہ چلا کہ میرے ڈرائیور کو کافی تیز بخار ہے۔ میں نے اس کو اس کے بھائی کے گھر پہنچایا جو صاحب گنج میں ہی رہتا تھا اور تنہا گاڑی لیکر ہرن پور کی طرف نکل کھڑا ہوا تھا۔ دو چار گھنٹے کی ڈرائیونگ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور ان راہوں سے تو میں سینکڑوں بار گزر چکا تھا اور دن رات کی کوئی قید نہیں تھی اور اکثر تو رات میں ہی چیکنگ کے لئے جنگلوں میں گھسا کرتا تھا۔ اس علاقے کے جنگلات اور جنگلی جانوروں کے تحفظ کی ذمہ داری بھی میری ہی تھی۔ اچانک لگا کہ بارش کا زور کم ہو رہا ہے۔ کیوں کہ سامنے کی سڑک نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور پر بہترے خطرناک موڑ تھے اس لئے میں نے گاڑی کی اسپیڈ نہیں بڑھائی کیوں کہ بھیگے ہوئے کولتار کی سڑک پر اسکیڈ (Skid) کر جانے کا بھی خطرہ بنا رہتا ہے اور پھر برساتی ندیوں کا پانی سڑک پر بھی آجاتا ہے جس کی دھار اتنی تیز ہوتی ہے کہ اکثر بڑی گاڑیاں بھی بہہ جاتی ہیں۔ کچھ ہی دور گاڑی بڑھی ہوگی کہ چڑھائی شروع ہوگئی۔ گاڑی کی رفتار کچھ کم کردینی پڑی۔ پہاڑی راستوں میں چٹانیں ایسی بارش میں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہتی ہیں اور اکثر راستہ بند کردیتی ہیں۔ دو نمبر گیئر پر گاڑی کو پہاڑ کی بلندی کی طرف لے جا رہا تھا۔ جیپ کی روشنی سڑک کی دونوں جانب پیڑوں اور جھاڑیوں کے بھیگے پتوں پر پڑ رہی تھی۔ جن میں اکثر پتوں پر پڑی ہوئی پانی کی بوندیں ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک اٹھتیں۔ کچھ ہی دور آگے بڑھنے پر سڑک پر دو گہری سبز آنکھیں چمک اٹھیں۔ یہ دو ہرن تھے جو بیچ سڑک پر کھڑے گاڑی کی روشنی پر اپنی نظریں جمائے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میری گاڑی جیسے ہی ان کے نزدیک پہنچی وہ دونوں چھلانگ لگا کر داہنی طرف کی جھاڑیوں میں گھس گئے۔ میں گاڑی بڑھاتا گیا۔ راستے میں کئی طرح کے جنگلی جانور دکھائی دیتے رہے۔ ایک جگہ چڑھائی ختم ہوگئی اور ڈھلان شروع ہوگئی۔ سامنے سڑک ایک بہت بڑے سانپ کی طرح بل کھاتی چلی گئی تھی۔ یہ ڈھلان تقریباً تین کیلومیٹر تک چلی

جاتی تھی۔ میں سیکنڈ گیئر میں ہی گاڑی چلاتا رہا اچانک گاڑی روکنی پڑی۔ سامنے سڑک پر ایک چھلکا پل تھا۔ گرمیوں میں تو یہ پل سوکھا رہتا اور گاڑیاں اطمینان سے اس پر گزرا کرتیں مگر برسات کے موسم میں ان پرندی کا پانی چڑھ جاتا اور راستہ مخدوش ہو جاتا۔ ہلکا پھلکا پانی رہنے پر گاڑیاں گزر جاتیں مگر بارش اگر زوروں کی ہو تو پھر اس پر سے گزرنا ناممکن ہوتا۔ جب تک ندی اترتی نہیں اس وقت تک کوئی اسے کراس کرنے کی حماقت نہیں کرتا۔ اس وقت ندی بھر چکی تھی اور سڑک پر تقریباً چار فٹ پانی پوری رفتار سے بہہ رہا تھا۔ گاڑی آگے بڑھانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اسی وقت پھر بارش ہونے لگی اور اس بار بھی بارش کا زور کافی تھی۔ میں نے گاڑی پیچھے کر کے سڑک کے بیچ و بیچ روک دیا۔ وائپر (Wiper) اسٹارٹ کر کے اندر کا شیشہ تولیہ سے پوچھا مگر ونڈر اسکرین دھندلا تھا دھندلا ہی رہا۔ اب اس پل کا پانی صبح تک اترنے والا نہیں تھا۔ بارش کا زور کم ہو جائے تو میں واپس ہو کر جنگل کے ڈاک بنگلے میں چلا جاؤں گا اور رات گزار کر ہی واپس جاؤں گا، میں نے سوچا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد وہ گھڑی آگئی۔ بارش تقریباً رُک گئی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہیڈ لائٹ آن کرتے ہی میری نظر سڑک پر بیٹھے ایک سیاہ کوبرے پر پڑی جو ہیڈ لائٹ جلتے ہی اپنا پھن اٹھا کر جیپسی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ یہ سانپ کافی بڑا اور بیحد چمکیلا تھا۔ ایک نظر میں اس پر کنگ کوبرا کا گمان ہوا مگر ان اطراف میں کنگ کوبرا نہیں پائے جاتے۔ اپنی سروس کے چار سال میں طرح طرح کے سانپ جنگلوں میں دکھائی دیئے تھے مگر اتنا خوبصورت اور بڑا سانپ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نیشنل جغرافک چینل اور ڈسکوری پر بھی اتنا خوبصورت اور اتنا بڑا سانپ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بائیں طرف سیٹ سے ٹکی اپنی بندوق اٹھالی۔ کارتوس بھرنے کے بعد میں نے داہنی کھڑکی کا شیشہ گرایا اور نال باہر کر کے کوبرا کا نشانہ لینے لگا۔ کوبرا کو پتہ نہیں کیا سمجھ میں آیا کہ اس نے اپنا پھن زمین سے دو فٹ اور اونچا اٹھالیا۔ سانپ گاڑی کی روشنی میں پھن اٹھائے حرکت کرتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اتنا خوبصورت سانپ جنگل میں رہنا چاہئے اس کو مار کر بھلا مجھے کیا ملے گا۔ ہاں اگر یہ میرے ساتھ کسی قسم کی شرارت کرنا چاہے گا تبھی اس کو مارنا درست ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے بندوق کی نلی ترچھی کر لی اور جیپسی کا دروازہ کھول کر ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کر لیا۔ گیٹ کے بند ہونے سے سانپ چونکا اور پھر تیزی سے سڑک پار کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس کی لمبائی یقیناً دس فٹ سے زیادہ رہی ہوگی۔ میں نے سیفٹی کیچ (Safety Catch) ہٹاتے ہوئے گن کو پھر سائڈ سیٹ سے ٹکا دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر بیک کیا اور واپس چل پڑا۔ میرا رخ ڈاک بنگلے کی طرف تھا۔ میں اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ میں بچپن سے ہی پہاڑوں، ندیوں اور جنگلوں کا دیوانہ تھا۔ میرے والد صاحب ایک پولس آفیسر تھے جن کا تبادلہ اتفاق سے ایسے ہی علاقوں میں ہوتا تھا۔ وہ فیملی ساتھ ہی رکھتے تھے اس لئے مجھے کھل کھیلنے کا پورا موقع ملتا تھا۔ دن دن بھر گن یا رائفل لئے جنگلوں میں شکار کرتا پھرتا تھا۔ بچپن سے جوانی تک سیکڑوں سانپوں کو مارا تھا۔ مجھے سانپوں کو مار کر بے حد خوشی ہوتی تھی۔ شاید یہ کسی قسم کا کوئی کمپلکس تھا۔ آج اس سانپ کو نہیں مارنا میری فطرت کے خلاف تھا مگر پھر بھی اس سانپ کو زندگی بخش کر مجھے بیحد خوشی ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں؟

گاڑی جب ڈاک بنگلہ کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی تو وہاں برآمدے میں ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ بجلی

گم تھی۔ گاڑی کی روشنی دیکھ کر چوکیدار دوڑتا ہوا آ گیا۔

"یہ بجلی کو کیا ہو گیا؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"بجلی تھی صاحب مگر جب آندھی پانی آیا تو چلی گئی" وہ بولا۔

میں جیپ سے اتر کر برآمدے کے طرف بڑھا۔ چوکیدار لالٹین لیکر راستہ دکھانے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا کہ بجلی آ گئی۔ میں نے اسے گاڑی سے اپنا سوٹ کیس اور گن لانے کو کہا اور وہ چلا گیا۔

کچھ ہی لمحوں بعد وہ انہیں لئے ہوئے آیا اور کمرہ نمبر ایک کھول کر اندر چلا گیا۔ جب وہ کمرے سے واپس آیا تو اس وقت تک میں صوفے پر پھیل چکا تھا۔

"چائے پلاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"جی سرکار مگر دودھ نہیں ہے، نیچے گاؤں سے لے آتا ہوں" وہ لالٹین کی لو کم کرتے ہوئے بولا۔

"پھر چھوڑ دو" میں نے کہا۔

"بس دس منٹ میں آ جاؤں گا" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا اور ایک سگریٹ سلگانے لگا۔

چوکیدار نے گلاس اور پانی کا مگ ٹیبل پر رکھا اور پھر ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

میں نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا بارہ بج چکے تھے مگر چوکیدار کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں رہ گیا تھا۔ میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا اور جھنجلاتا رہا۔ کبھی کبھی صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگتا اور پھر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد برآمدے پر قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور چوکیدار کی پشت سے ایک چاند طلوع ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ایک سترہ اٹھارہ سال کی بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے سفید ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کے بال پیچھے کی طرف پونی ٹیل کی طرح بندھے ہوئے تھے۔ اس کی ساری کچھ کچھ بھیگی ہوئی تھی جو اس کے جسم سے چپک سی گئی تھی۔ اس نے بلاؤز نہیں پہنا تھا۔ ساری کے پلو ہی سے اس نے سینہ ڈھانک رکھا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے چوکیدار کی طرف دیکھا۔

"حضور! یہ لڑکی جنگل میں سڑک کے کنارے کھڑی رو رہی تھی۔ میں نے اس سے بہت پوچھا مگر یہ کچھ بولتی ہی نہیں۔ شاید گونگی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا کہ جنگل میں جوان لڑکی کا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے صبح میں چلا دوں گا۔" چوکیدار بولا اور پھر دودھ کا لوٹا لئے اندر کچن میں چلا گیا۔ لڑکی دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ میں نے سر کی جنبش سے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ پھر میں نے اسے ایک صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ کھڑی رہی۔

"بیٹھ جاؤ" میں نے اسے اونچی آواز میں حکم دیا اور وہ ہڑبڑا کر ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔

"تم کون ہو؟ جنگل میں اس وقت تنہا کیا کر رہی تھی۔" میں نے پوچھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید چوکیدار ٹھیک ہی کہہ رہا تھا یہ لڑکی ضرور گونگی ہے۔ میں نے سوچا۔

''کیا تم گونگی ہو؟'' میرے منہ سے نکل گیا۔ لڑکی نے نفی میں سر ہلایا مگر خاموش رہی۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔ چپ چاپ اسے تکتا رہا۔ لڑکی ننگے پیر تھی اور نظریں نیچے کئے اپنے پیر کے انگوٹھے کو تک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت، گھبراہٹ اور تفکر کا احساس تھا۔ وہ خاموشی سے ایک ٹک اپنے پیروں کو تکے جا رہی تھی۔ اس کے پاؤں بہت خوبصورت اور نازک تھے۔ شاید پیر ننگے ہونے کی وجہ سے اسے کچھ خفت سی ہو رہی تھی کیوں کہ اس کے پاؤں دیکھ کر ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کبھی چپلوں یا سینڈل کے بغیر رہے ہوں۔ چوکیدار ٹرے میں چائے لیکر آیا۔ ایک کپ مجھے پکڑاتے ہوئے اس نے دوسرا کپ لڑکی کی طرف بڑھایا اس نے جھجکتے ہوئے کپ لے لیا۔ جب میں نے اپنے کپ سے چائے کا ایک سپ لیا تو لڑکی نے بھی کپ ہونٹوں کے قریب لایا پھر رک کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''چائے ہے پی لو!'' میں نے دھیرے سے کہا۔

لڑکی نے اپنا کپ ہونٹوں سے لگایا۔ ایک سپ لینے کے بعد اس نے اتنا برا سا منھ بنایا جیسے یہ چائے نہ ہو کر کونین کی گولی ہو۔ جب کہ چائے اتنی بری بھی نہیں بنی تھی۔ اس نے کپ ٹیبل پر رکھ دیا اور ساری کے پلو سے اپنا منھ پوچھنے لگی۔ میں نے دوسرا سپ لیا اور لڑکی کو اشارہ کیا۔ اس نے پھر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔ اس بار اس نے برا سا منھ تو نہیں بنایا لیکن اس کی آنکھوں سے پسندیدگی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ شاید وہ چائے نہیں پیتی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں سے آئی ہو؟'' میں نے چائے ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔ ''میں'' اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ ایسا لگا جیسے کسی اندھیرے کنویں کی گہرائی سے کوئی بازگشت نکلی ہو۔ ''میں'' اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا مگر چپ ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا مسلنے لگی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی اور سراسیمگی کے اثرات ابھر آئے تھے۔

''کیا گلے میں کچھ تکلیف ہے؟'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''پھر'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے دوبارہ سوال کیا۔

''میں'' وہ تھوک گھونٹتے ہوئے رک رک کر بولی۔

''میں آج سے تقریباً دو ہزار سال بعد آدمی کی زبان میں بات کر رہی ہوں'' اس کا لہجہ عجیب تھا۔ جیسے کوئی طوطا آدمی کی زبان میں بات کر رہا ہو۔ ویسے اسکی آواز کا حجم طوطے سے کافی صاف تھا۔

''دو ہزار سال بعد'' میں نے دہرایا اور پھر اچانک مجھے لگا کہ یہ لڑکی مجھے ٹھگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اسے کچھ اونچی آواز میں مخاطب کیا۔

''لڑکی ڈرامہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم کچھ بتانا نہیں چاہتی تو مت بتاؤ مگر دوسروں کو بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔''

لڑکی نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ پہلے ہلکی ہلکی سسکی تھی مگر وہ پھر آواز سے رونے لگی۔ میں بوکھلا گیا۔ اگر اسی وقت چوکیدار آ گیا تو پتہ نہیں کیا سمجھ بیٹھے۔ (جاری)

اطالوی کہانی: امبرتی ایکو

وہ چیز

مترجم: ڈاکٹر خان حفیظ، کانپور

"ہوں تو پروفیسر" جنرل نے کچھ بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں! تو کیا؟" پروفیسر کاہ نے الٹا سوال کیا ظاہر تھا۔ وہ تھوڑی سی مہلت اور چاہتا تھا۔

"تمہیں یہی کام کرتے ہوئے پانچ سال ہونے کو آئے، ان پانچ سالوں میں کسی نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا، ہم لوگوں نے تم پر پورا یقین کیا، اب ہم لوگ باتوں کے سہارے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ اب ہمیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا۔ جنرل کی سنجیدہ آواز میں ایک گہری بات چھپی تھی۔ کچھ تکان بھرے لہجے میں کاہ مسکرایا پھر اس نے کہا: "میرا مطلب ہے بڑے نازک موقع پر گھیر لیا۔ جنرل میرا ارادہ کچھ اور رکنے کا تھا۔ لیکن اب میں ایک عجیب دنیا میں ہوں، دراصل میں نے ایک چیز بنائی ہے۔" کاہ کی آواز ایک معنی خیز پھسپھساہٹ میں بدل گئی "ایک بہت بڑی چیز اور سورج دیوتا............ بھگوان کی قسم لوگوں کو اس کے بارے میں بتانا بہت ضروری ہے۔"

ہاتھوں کے اشارے سے اس نے جنرل کو "گفا کے اندر............" اتنا کہہ کر اس نے اندرونی خوشی محسوس کیا۔ باہر کی روشنی نیچے چٹان پر گر رہی تھی اور تب کاہ نے اسے وہ چیز دکھائی۔

وہ بادام کی شکل کی ایک چپٹی چیز تھی۔ اس کی سطح پر کسی بڑے سے ہیرے کی طرح کئی کونے بنے ہوئے تھے لیکن تقریباً مادہ کی طرح چمکنے والی شفاف نہیں تھی۔

"اچھا" جنرل نے کچھ چکرا کر کہا "یہ تو پتھر لگتا ہے۔"

پروفیسر کی گھنی بھنویں ڈھکی نیلی آنکھوں میں ایک چالا کی بھری چمک اٹھی "ہاں یہ پتھر ہی ہے" اس نے کہا "لیکن دوسرے پتھروں کی طرح یہ پتھر زمین پر ڈھیر میں پڑے رہنے کے لئے نہیں ہے۔ یہ پتھر مٹھی میں مضبوطی سے پکڑے جانے کے لئے۔"

"مٹھی میں؟"

بھینچے جانے کے لئے، جنرل! اس پتھر میں وہ ساری طاقت ہے جس کا انسان نے صرف سنا ہی ہے اس میں ہزاروں آدمیوں کے برابر طاقت ہے دیکھئے۔"

اپنی ہاتھ کی انگلیوں کو موڑ کر اس نے پتھر کے چاروں طرف اس طرح کسا کہ وہ اس کے ہاتھ کی گرفت میں آگیا۔ اب اس کا تھوڑا حصہ اس کی ہتھیلی میں قید تھا اور اس کا نوکیلا حصہ اس کے ہاتھ کے گھمانے کے ساتھ اوپر نیچے کیا جاسکتا ہے پروفیسر نے اپنے ہاتھ کو تیزی سے گھمایا تو پتھر ہوا میں ایک لائن بنا کر رہ گیا۔ پروفیسر نے اپنے ہاتھ کو اوپر نیچے کیا تو پتھر کی نوک چٹان کی سطح سے جا ٹکرائی اور تب ایک کرشمہ ہوا۔ اس نوک نے چٹان کو چھید دیا اور اس میں کھروچ لگائی اور کچھ باریک ٹکڑے بھی نکال دیئے اس طرح اس نے اس ٹکڑے کو ایک

دائرے میں گھمایا اتنی چٹان کٹ کر باہر آ گئی۔ جنرل سانس روکے یہ سب بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ تو کچھ نہیں جنرل'' پروفیسر نے فتح کے انداز سے چھاتی پھلائی اور بولا ''جنرل بے شک اپنے خالی ہاتھوں سے چٹان پر چوٹ کر کے کھروچ پیدا نہیں کر سکتے۔ ایک کونے سے اس نے ایک بڑا ساسخت ناریل اٹھا کر جنرل کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''چلئے'' اس نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ دونوں ہاتھوں کا استعمال کر سکتے ہیں ذرا اسے توڑ کر دکھائیں۔''

''مذاق مت کرو کاہ'' جنرل گھبرا گیا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ ناممکن ہے۔ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں کر سکتا صرف کوئی ڈائنا سور ہی اسے پیر تلے کچل کر توڑ سکتا ہے۔ صرف ڈائنا سور ہی اس کا گودا کھا سکتا ہے اور اس کا پانی پی سکتا ہے۔''

''ہاں لیکن اب ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں'' پروفیسر نے جوش بھری خوشی میں کہا ''دیکھئے''

اس نے ناریل کو چٹان میں بنے چھید کے اندر لٹکا دیا پھر اس نے اسی پتھر کو الٹی طرف سے ہاتھ میں اس طرح تھاما کہ نوک والا سرا اس بار اس کی ہتھیلی میں تھا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر تیزی کے ساتھ ہاتھ گھومتا ہوا بلا کسی خاص طاقت کے پتھر پر جا گرا۔ وار کے پڑتے ہی ناریل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اس کا پانی چٹان پر بہہ نکلا اور چھید میں پھیلے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے اندر سے جھانکتا، بالکل سفید ٹھنڈا گودا سامنے آ گیا۔ جنرل نے للچائے ہاتھوں سے ایک ٹکڑے کو جھپٹ کر اپنے منہ میں ڈال لیا اور تعجب سے کبھی کاہ کو کبھی ناریل کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔

''سورج دیوتا کی قسم کاہ، یہ تو کمال کی چیز ہے۔ اس چیز سے انسان کی طاقت کئی سو گنا بڑھ جائے گی۔ اب وہ ڈائنا سور کے ساتھ برابری کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اب اس کے پاس سو ہاتھ ہو گئے ہیں لیکن یہ کمال کی چیز تمہیں ملی کہاں۔''

کاہ اس کی بات کو سن کر مسکرا دیا ''یہ مجھے ملی نہیں جنرل، اسے میں نے خود بنایا ہے''

''بنایا ہے مطلب''

''مطلب یہ چیز پہلے نہیں تھی''

''تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے'' جنرل نے کانپتے ہوئے کہا ''ضرور یہ آسمان سے نیچے گری ہوگی۔ سورج بھگوان کا کوئی دیوتا یا ہواؤں کا کوئی شیطان اسے یہاں لایا ہوگا۔ جو چیز پہلے نہیں تھی اسے کوئی انسان کیسے بنا سکتا ہے؟''

''بنا سکتا ہے جنرل'' کاہ نے بے چینی سے کہا ایک پتھر کو لے کر دوسرے پتھر کی اس پر چوٹ کی جائے تو آخر کار اس پتھر کو من چاہی شکل دی جا سکتی ہے کہ اسے آسانی سے ہاتھوں میں پکڑا جا سکے۔ اور اس طرح کے پتھر کے ذریعہ بڑا پتھر اسی طرح تراشا جا سکتا ہے۔''

جنرل کا پسینہ چھوٹنے لگا۔ ''سبھی کو اس بارے میں بتانا ہوگا۔ سارے قبیلے کو اس کی خبر ہونی چاہئے۔

ہم سب طاقت ور ہو جائیں گے۔ تمہاری سمجھ میں کچھ آیا۔ اب ہم بھالو کا مقابلہ کر سکتا ہوں، بھالو کے پاس پنجے ہیں اور ناخون ہیں تو ہمارے پاس یہ چیز ہے اس سے، پہلے کہ وہ ہم پر جھپٹے اس کے پہلے ہم اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس کے ذریعہ ہم سانپ کو مار سکتے ہیں کچھوے کی پیٹھ کو توڑ سکتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ ہم دوسرے انسان کو مار سکتے ہیں۔"

کچھ دیر کے بعد دوبارہ اس سے بولنا شروع کیا...... تو اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی "اس کے ذریعہ سے ہم "کوعام" قبیلے پر حملہ بولیں گے۔ وہ ہم سے زیادہ طاقت ور ہیں لیکن اب ہم انہیں اپنے قبضے میں کر لیں گے اور ان کے قبیلے کے آخری انسان تک کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے، تم سمجھ رہے ہو نہ کاہ" جنرل نے کاہ کو کندھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا...... "اب ہماری فتح کو کوئی روک نہیں سکتا"

کاہ کسی بہت گہری سوچ میں ڈوب گیا لگتا تھا۔ کافی دیر کے بعد اس نے دبی آواز میں کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ بولنا شروع کیا "مجھے اسی کا ڈر تھا جنرل، اس لئے میں اس چیز کو آپ کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے پتا ہے کہ میری یہ کھوج کتنی بھیانک ہے میں جانتا ہوں کہ اس سے ساری دنیا بدل جائے گی۔ طاقت کا اتنا خوف ناک منظر اس سے پہلے اس زمین پر نہیں دیکھا گیا ہوگا۔ اسی لئے اس کے بارے میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس ہتھیار کو ساتھ رکھ کر جنگ کرنے کا مطلب ہے خودکشی۔ "کوعام" قبیلہ اسے بہت جلد بنا لیگا اور تب اگلی لڑائی میں ہم اور "کوعام" دونوں مارے جائیں گے اور کوئی بھی کامیاب نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس کے ذریعہ امن اور ترقی پھیلے گی لیکن اب میں جان رہا ہوں کہ یہ چیز کتنی خطرناک ہے۔ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

کاہ کی بات سن کو جنرل آپے سے باہر ہو گیا بولا...... "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہیں ایسا کرنے کا کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ تم لوگ بھی عجیب خبطی ہوتے ہو۔ پانچ سالوں تک تم یہاں بند پڑے رہے تمہیں کیا پتہ کہ باہر کیا کیا ہو گیا۔ تمہیں اس کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔ تہذیب اب ایک نئی موڑ پر کھڑی ہو گئی ہے۔ اگر "کوعام" قبیلہ جیت گیا تو انسانیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ یہ چیز ہمارے پاس ہو، ہم اس کا استعمال نہیں کریں گے کاہ لیکن سب کو پتہ ہونا چاہئے کہ یہ ہمارے پاس ہے۔ ہم صرف اپنے دشمنوں کے سامنے اس کا مظاہرہ کریں گے اور پھر اس کا استعمال قابو میں رکھیں گے، تب کوئی ہم پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کر پائے گا اور اس درمیان ہم قبریں کھودیں گے۔ نئی گفائیں بنائیں گے۔ پھول توڑیں گے۔ زمین کو برابر کریں گے لیکن ہتھیار کے طور پر اسے صرف اپنے پاس رکھیں گے اس کا استعمال قطعاً نہیں کریں گے۔ یہ چیز صرف خبرداری کا کام کرے گی۔ اس سے ان "کوعام" واسیوں کو ہمیشہ کے لئے ہم سے دور رہنے کا سبق ملے گا۔"

"نہیں نہیں......" کاہ نے کہا "اسے ختم کرنا ہی ٹھیک ہوگا"

"تم ایک بزدل انسان ہو اور گدھے بھی ہو" جنرل غصے سے لال پیلا ہوتا چلا گیا "مجھے لگتا ہے کہ تم ان کے ہاتھوں کے پٹھو بنتے جا رہے ہو، انسان کی ایکتا کا سبق پڑھانے والے بے وقوف بڈھے اور باقی دانشوروں کی طرح تم بھی "کوعامی" کی تقلید کرتے ہو تم کو تو سورج بھگوان پر یقین ہی نہیں ہے، مجھے ایسا لگتا ہے۔"

کاہ کے جسم میں ایک عجیب قسم کی لہر دوڑ گئی پھر اپنی گھنی بھوؤں تلے اداس ہو آئیں، آنکھیں چراتے ہوئے اس کے گردن جھکالیں ''مجھے پتہ تھا کہ آخر کار یہی ہو کر رہے گا، آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں ''کو عامی'' کی تقلید کرنے والا نہیں ہوں۔ سورج بھگوان کے پانچویں قانون کو جانتے ہوئے آپ کے اس الزام کو ٹھکراتا ہوں۔ پھر چاہے اس کے بدلے مجھے ساری شیطانی آتماؤں کا عذاب کیوں نہ جھیلنا پڑے۔ آپ کے دل میں چاہے جو آئے کیجئے جنرل لیکن یہ چیز گفا سے باہر نہیں جائے گی۔''

''جائے گی، ضرور جائے گی اور ابھی جائے گی'' جنرل جنون میں دہاڑا ''ہمارے قبیلے کی عزت وشہرت کے لئے اور اس کی تہذیب وثقافت کی حفاظت کی خاطر اور سکون شانتی کی بحالی کے لئے، اسے باہر جانا ہی ہوگا۔''

اور.........

جنرل نے جھپٹ کر اپنے داہنے ہاتھ میں اس چیز کو اسی طرح پکڑ لیا جیسا اس نے کچھ وقت پہلے کاہ کو کرتے دیکھا تھا اور پھر پوری طاقت اور غصے، نفرت کے ساتھ اس نے اسے اسی طرح پروفیسر کی کھوپڑی پر دے مارا۔

حملہ سے کاہ کی کھوپڑی پھٹ گئی اور اس کے منہ سے خون کا ایک سیلاب بہہ نکلا اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف کی چٹان سرخ رنگ میں نہا گئی۔

جنرل اس پتھر کو تھام کر چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر فتح کی مسکراہٹ ابھر آئی اس میں سختی اور حیوانیت کے ساتھ نفرت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

''اور کوئی ہے؟'' وہ چیخا۔

پھر اس نے گرج کر کہا ''جس کی موت اسے بلا رہی ہو۔''
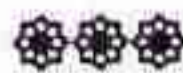
مترجم: ڈاکٹر خان حفیظ

گبرئیل گارشیا مارکیز

بجلی جیسے کہ پانی

کرسمس پر لڑکوں نے پھر سے ناؤ کے متعلق دریافت کیا۔

''ٹھیک ہے'' ان کے پاپا نے کہا ''ہم ''کارٹیگنہ'' پہونچنے پر اسے خریدیں گے'' نو سالہ توتو اور اس سے چھوٹا سات سالہ جول اپنے سرپرستوں کی فہم سے کچھ زیادہ ہی مصمم ارادے والے واقع ہوئے تھے۔ ''نہیں'' وہ ایک ساتھ بولے ''ہمیں یہیں اور ابھی چاہئے'' ابتداء کرنے کے لئے ان کی ماں نے کہا ''ناؤ کھینے کے لئے پانی وہی ہے جو غسل خانے کے فوارے سے آتا ہے۔''

وہ اور اس کے شوہر دونوں ہی اپنی جگہ صحیح تھے۔ ان کے کارٹیگنہ۔ او۔ انڈیا والے مکان، بیکراں سمندر کے ساحل سے لگا ڈاک والا یارڈ اور ایک جگہ تھی۔ جس میں دو بڑی کشتیاں سما سکتی تھیں۔ جب کہ دوسری جانب یہاں پانچ منزلہ عمارت بھی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے بچوں کو منع نہیں کر سکے۔ کیوں کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے پرائمری اسکول میں معیاری نمبروں سے کامیاب ہو گئے جیسا کہ وہ ہوئے، تو انہیں ایک مکمل ناؤ مع ضروری سامان کے ساتھ ملے گی۔ اس لئے ان کے پاپا نے سب کچھ خریدا اور اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا کیوں کہ وہ جوئے کا ادھار چکانے کے لئے اڑی ہوئی تھی۔

یہ ایک بہت جاذب نظر المونیم کی ناؤ تھی۔ جس پر سنہری دھاریاں بنی ہوئی تھیں ''ناؤ گیراج میں ہے'' اس بات کا اعلان ان کے پاپا نے دوپہر کے کھانے کے وقت کیا لیکن دشواری یہ ہے کہ اسے اوپر لانے کے لئے نہ تو لفٹ میں جگہ ہے نہ تو سیڑھیوں میں اس کے علاوہ گیرج میں تو تھوڑی بھی جگہ نہیں بچی ہے۔''

پھر بھی لڑکوں نے آنے والے سنیچر کی دوپہر میں اپنے کلاس کے ساتھیوں کو ناؤ کو سیڑھیوں کے راستے اوپر لانے بلایا اور وہ اسے نوکرانی کے کمرے تک لانے میں کامیاب رہے۔ ''مبارک ہو'' ان کے پاپا نے کہا ''لیکن اب کیا؟'' ''اب کچھ نہیں'' لڑکے بولے ''ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ ناؤ کمرے میں آجائے اور وہ آگئی۔''

ہر چہار شنبہ کی طرح اس بدھ کو بھی ان کے والدین فلم دیکھنے گئے۔ لڑکوں نے جو اس وقت گھر کے مالک بھی تھے اور راجہ بھی کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کیا اور سونے کے کمرے کے ایک جگمگاتے بلب کو پھوڑ دیا۔ پھوٹے ہوئے بلب سے پانی کی طرح لطیف سنہری روشنی کی دھار بہنے لگی اور انہوں نے اسے تب تک بہنے دیا جب تک کہ تین فٹ تک کی گہرائی نہیں ہو گئی۔ پھر انہوں نے بتی بجھائی، ناؤ نکالی اور گھر میں بن جانے والے جزیروں کے بیچ ناؤ کھینے لگے۔

یہ حیرت انگیز کرامت اس بے معنی مباحثے کے ماحصل تھا جو میں نے گھریلو چیزوں سے متعلق شاعرانہ انداز میں ایک سیمینار کے دوران اظہار خیال کیا تھا۔ توتو نے مجھ سے دریافت کیا کہ سوئچ دباتے ہی روشنی

ہوجاتی ہے۔ میرے پاس اس بات پر دوبارہ سوچنے کی استطاعت نہیں تھی۔

''بجلی جیسے کہ پانی'' میں نے جواب دیا۔

''تم نل کھولتے ہواور پانی بہنے لگتا ہے۔''

ہر چہار شنبہ کی شب جب تک کہ ان کے والدین فلم سے واپس لوٹنے پر انہیں خشک زمین پر فرشتوں کی مانند محوِ خواب نہیں پاتے۔ تب تک وہ ناؤ کھیتے رہتے۔ اس سے متعلق اشیاء کا استعمال سیکھتے رہتے۔ کئی ماہ کی مشقت کے بعد اس سمت میں اور ترقی کرتے ہوئے انہوں نے غوطہ خوری کا مکمل لباس یعنی ماسک، پر ٹینگ اور ہوا کے دباؤ چلنے والی رائفلوں کی فرمائش کی۔

یہ غلط بات ہے کہ تم لوگوں نے نوکرانی کے کمرے میں ناؤ رکھ دی ہے۔ جسے تم چلا بھی نہیں سکتے پاپا نے کہا اور اس پر طرہ یہ کہ اب غوطہ خوری کا سامان بھی چاہیۓ اگر پہلے سسٹر کا گارڈینا طلائی تمغہ جیت لوگے تو.........تو.........جول نے کہا۔

''نہیں'' اس کی ماں نے خطرے کے خیال سے کہا''بہت ہو چکا'' ان کے باپ نے بچوں کی ماں کو اتنا ضدی ہونے کے لئے برا بھلا کہا۔'' ان بچوں سے کچھ کرنے کے لئے کہو تو ٹس سے مس نہیں ہوتے لیکن اگر خود چاہیں تو بڑے سے بڑا کام کر سکتے ہیں'' ماں بولی۔

بالآخر ان کے والدین نے کچھ نہیں کہا لیکن جولائی میں توتو اور جول نے طلائی تمغہ جیت لیا اور صدر مدرس سے شاباشی بھی پائی۔ ٹھیک اسی دوپہر میں انہیں بغیر دوبارہ مانگے اپنے خواب گاہ میں غوطہ خوری کا وہ سب سامان جو وہ چاہتے تھے چمچماتے لفافوں میں مل گیا۔ اس طرح آنے والے بدھ کو جب کہ ان کے والدین ''لاسٹ ٹینگوان پیرس'' دیکھ رہے تھے۔ تب انہوں نے اپنے مکان کو آٹھ ہاتھ کی گہرائی تک بھر لیا وہ پھرتیلی شارک مچھلی کی طرح فرنیچر اور چارپائیوں کے نیچے تیرتے رہے اور تہہ کے اندھیروں میں سالوں سے پڑی چھوٹی موٹی چیزوں کو باہر نکالتے رہے۔

سالانہ جلسہ میں انعامات تقسیم ہونے کے دوران دونوں بھائیوں کو پورے اسکول کے لئے خاص طالب علموں کی طرح عزت بخشی گئی اور انہیں خصوصی دستاویز تفویض کئے گئے۔ اس بار انہوں نے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ کیوں کہ ان کے سرپرستوں نے بذاتِ خود ہی پوچھا کہ انہیں کیا چاہیۓ۔

وہ لوگ اس بار اس قدر سمجھدار تھے کہ گھر پر اپنے درجے کے دوستوں کو دعوت دینے میں بھی شاداں تھے ان کے پاپا جب اپنی شریکِ حیات کے ہمراہ تنہائی میں تھے تو اپنے اوپر فخر محسوس کر رہے تھے۔

''یہ ان کی دانشمندی کا ثبوت ہے'' انہوں نے کہا۔

''تمہارے لبوں سے نکلی ہوئی بات خدا کی سماعت تک پہنچے'' ان کی ماں نے کہا۔ گذشتہ چہار شنبہ کو جب ان کے والدین ''وائیٹل آف انجیز'' دیکھ رہے تھے لوگوں نے درخت کے بیچ چھپی ایک قدیمی عمارت سے روشنی کا آبشار گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ روشنی بالکنیوں میں بھر گئی۔ مکان کے چھجے سے موسلا دھار بارش ہونے لگی اور اس کی سنہری طغیانی راستے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ جس نے ''گواڈاراما'' جانے والی شاہراہ کو جگمگا دیا۔

خطرے کے خیال سے آگ بجھانے والوں نے پانچویں منزل کے دروازے دھکا دیا اور سارے مکان کو چھت تک روشنی سے شرابور پایا۔

بار کی بوتلوں اور بڑا پیانو، جس کے اوپر قیمتی شال ایسا پڑا تھا جیسے غیر مرئی طاقت پسری پڑی ہو۔ کمرے کے درمیان چیتے کی کھال میں ملفوف صوفے اور آرام کرسیاں بیٹھک کے مختلف حصوں میں تیر رہے تھے۔ باورچی خانے کے مختلف حصوں سے ماورا آسمان پر گھریلو اشیاء اپنی مکمل حیثیت والے ذاتی شہپروں کے سہارے اڑ رہی تھی۔

بچوں کے ذریعہ رقص کرتے وقت استعمال کیا جانے والا باجا ان کی ماں کے مچھلی گھر سے آزاد ہونے والی چمکدار مچھلیاں جو کہ اس بیکراں چمکدار دلدل میں زندہ اور خوش حال جانور تھیں کے ساتھ مل گیا تھا۔ پاپا کے کنڈوموں اور ممی کی کریموں کے علاوہ سب کے ٹوتھ برش غسل خانے میں تیر رہے تھے۔ ٹیلی ویژن سیٹ، جس پر ابھی بھی نصف شب کی دکھائی جانے والی صرف بالغوں والی فلم کا آخری سین چل رہا تھا۔ اصل بیڈروم سے نکل کر اس کے بغل والے کمرے میں تیر رہا تھا۔ ہال کے آخری چھور پر تیز انداز میں چپو کھیتے ہوئے توتو ناؤ کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا اپنے چہرے پر ماسک لگائے ساحل پر پہنچانے والی بادمراد کے ساتھ روشنی گھر تلاش کر رہا تھا اور جوئل اپنے حصے میں بیٹھا اپنے اوزاروں سے کہکشاں تلاش کر رہا تھا۔ سارے گھر میں اس کے پینتیس (۳۵) یار دوست تیر رہے تھے۔ جیرینیم کے گملے میں پیشاب کرتے ہوئے انہوں نے زندہ جاوید ہونے کا نسخہ پالیا تھا، یہ لوگ اسکول کے گیت میں ترمیم و تنسیخ کر کے صدر مدرس کا مضحکہ بھی اڑا رہے تھے۔ اور چوری سے پاپا کی بوتل سے اڑائی ہوئی برانڈی کا مزہ لوٹ رہے تھے۔ چوں کہ انہوں نے ایک ہی وقت میں ڈھیر ساری بتیاں جلادی تھیں اس لئے اپارٹمنٹ روشنی سے لبالب بھرا تھا اور جولین پرائمری اسکول کے دو درجات کے طلباء اس پانچ منزلہ عمارت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ سب اسپین کے ایک بڑے شہر میں ہو رہا تھا جہاں یخ بستہ ہواؤں کا بول بالا تھا یہاں نہ کوئی سمندر تھا نہ ہی کوئی ندی اور یہاں کے مقامی لوگوں نے کبھی روشنی پر تیرنے کے فن کی مشق نہیں کی تھی۔

❀❀❀

اس شمارہ کے مخصوص شاعر: ڈاکٹر ودّیا ساگر آنند

علمیت، تجربہ، سفر، سوشل انٹریکشن، مثبت فکر اور کشادہ دلی اور کشادہ ذہنی شاعر کو بلند مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ ودیا ساگر آنند ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں یہ ساری خوبیاں ایک ساتھ موجود ہیں۔ برطانیہ میں رہ کر سیاست کے پیچ وخم سے واقف ہیں۔ اقتدار تک حاصل کرنے میں کامیاب ہیں اور ان کا دائرہ انسانی رسم وراہ میں اتنا پھیلا ہوا ہے جہاں خانوں میں تقسیم کر کے انسانوں کو دیکھا نہیں جاسکتا۔ سرحدیں ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں اور سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے جب تخلیقی عمل سے گذرتے ہیں تو وہ تمام خصوصیات عوامل وعناصر جن کا ذکر میں نے اوپر کیا سمٹ جاتے ہیں اور سمٹ کر جب پھیلتے ہیں تو ہزاروں رنگ بکھیر دیتے ہیں اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ انسان فی زمانہ کس طرح ان سارے بکھرے ہوئے ارضی وسماوی قوس و قزح کو سمیٹنے میں کامیاب ہے۔

ودیا ساگر آنند ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری کہیں ختم نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہ ہر بات نئے سرے سے شروع کی جارہی ہے۔ یہ تاثر اگر آپ کے ذہن میں آجائے کہ ودیا ساگر آنند برطانیہ کے شاعر ہیں، سیاست داں ہیں، سوشل ایکٹی وسٹ ہیں اور اپنے وطن سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں تو ان کی شخصیت کو سمجھنے میں دشواری ہوگی لیکن جس دن اور جس وقت آپ ان کی شاعری کو ایک انسانی جذبہ کے ترجمان کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ سادگی میں بھی بلا کا جادو ہے، بیان میں پرکاری ہے۔ احساس میں دردکی ٹیس ہے، پیار میں والہانہ پن ہے اور معاملہ فہمی میں بھی بلا کا ادراک رکھتے ہیں۔ اسی کا کو عرفان ذات کہتے ہیں۔ جب شاعر کو عرفان ذات ہو جاتا ہے تو وہ آفاقی شاعر ہو جاتا ہے پھر اس کی عظمت کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے اشعار میں ایک تحریکی بہاؤ کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جھرنوں کی کھنک بھی محسوس ہوتی ہے۔ لہروں کا اُچھال بھی دکھائی دیتا ہے اور سمندر کی جھاگ کے اٹھتے اور ڈوبتے مناظر بھی اس کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ شعر کہنا آسان ہوسکتا ہے لیکن ڈوب کر شعر کہنا مشکل ہے۔ جس کے اندر گہرائی و گیرائی نہیں ہو وہ ڈوب کر شعر کیسے کہہ سکتا ہے جو سطحی باتوں کو صرف دیکھ سکتا ہے وہ گہری باتوں کا محاسبہ کیسے کرسکتا ہے۔ ودیا ساگر آنند نے شاعری کے وہ تمام پہلو اس انداز سے ابھارے ہیں کہ آپ جس قدر پڑھیں اس قدر معنوی تہیں کھلتی جاتی ہیں اور ودیا ساگر آنند کی آپ بیتی جگ بیتی لگنے لگتی ہے۔ ان کا درد اپنا درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسا احساس جگانا ایک باکمال شاعر کا ہی کام ہوسکتا ہے اور ودیا ساگر آنند ایسے ہی باکمال شاعر ہیں جس کی مثال ہم عصر اردو شعراء میں کم ہی ملتی ہے۔ ان کی دو غزلیں آپ کے سامنے ہیں آپ ان کے جذبوں کی گہرائی اور فکر کی اونچائی کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ سادگی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور قاری کو اپنی گرفت میں کر لیتا ہے۔ آپ بھی ان کے اشعار کو پڑھ کر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے......!

——امام اعظم

غزلیں

(۱)

ڈرائے کیوں کوئی مجھ کو خزاں سے
مجھے ہے پیار اپنے گلستاں سے

سمجھ لو آئے گی کوئی مصیبت
اگر ٹوٹے ستارا آسماں سے

چمن میں رونقیں آئیں تو کیونکر
رفاقت ہے بہاروں کی خزاں سے

اٹھاؤگے بڑا نقصان اک دن
نظر بدلو نہ اپنے رازداں سے

خزاں آتے ہی ہوجائے گا دشمن
کہاں اُمید تھی یہ باغباں سے

میں پیچ وخم سے بھی گزروں گا، لیکن
مجھے ہے خوف میرکارواں سے

نہیں پیچھے ہٹوں گا آگے بڑھ کر
رہا ہوں میں گزرتا امتحاں سے

دیارِ غیر میں رہتا ہوں، لیکن
محبت ہے مجھے ہندوستاں سے

زبانیں لاکھ ہیں آنند، لیکن
نہیں بہتر کوئی اردو زباں سے

(۲)

غموں سے ڈرتا ہوں میں بے بسی سے ڈرتا ہوں
میں جی رہا ہوں مگر زندگی سے ڈرتا ہوں

نہ دوستی سے نہ میں دشمنی سے ڈرتا ہوں
نہاں جو دل میں ہے اُس کمتری سے ڈرتا ہوں

گئے زمانے کے انسان یاد آتے ہیں
نئے زمانے کے اس آدمی سے ڈرتا ہوں

گو آگ ہی سے نکلتی ہے روشنی، لیکن
جو آگ بنتی ہے اُس روشنی سے ڈرتا ہوں

خوشی نہ اتنی ہو جو دل پہ بار ہوجائے
میں غم سے ڈرتا نہیں ہوں خوشی سے ڈرتا ہوں

رہوں کسی کا میں محتاج وہ نہ وقت آئے
میں اپنی زندگی میں بے کسی سے ڈرتا ہوں

نہ وزن ہوتا ہے جس میں نہ فکر وفن کوئی
میں شاعروں کی اسی شاعری سے ڈرتا ہوں

سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ساتھ کس کا دوں
خودی سے ڈرتا ہوں میں بے خودی سے ڈرتا ہوں

زباں پہ ہوتا ہے کچھ اور اُن کے دل میں کچھ
میں اپنے دوستوں کی دل لگی سے ڈرتا ہوں

میں ساتھ دیتا رہوں گا حق و صداقت کا
کوئی خفا ہو، کہاں میں کسی سے ڈرتا ہوں

کٹھن ہے آدمی کی آج کل پرکھ آنند
بسر ہو کھوٹ سے اس زندگی سے ڈرتا ہوں

❀❀❀
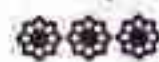
ڈاکٹر مسعود جعفری، حیدرآباد

صبحِ آزادی

پندرہ کے دن نے ہم کو اجالوں سے بھر دیا
بستہ قلم کتاب ہتھیلی پہ دھر دیا
چاندی ہمیں دیا تو کبھی آب زر دیا
رکھا نہیں اُداس ہمیشہ ثمر دیا

منزل قریب آ گئی دو سو برس کے بعد
منظر حسین ہو گیا صبحِ جرس کے بعد

ظلم و ستم کا دور غلامی کے پل گئے
آنسو برس برس کے تبسم میں ڈھل گئے
دروازے قیدیوں کے سرِ شام کھل گئے
نعرے بھی انقلاب کے سانسوں میں گھل گئے

صدیوں سے انتظار تھا جس کا وہ مل گئی
اپنا قبا بھی صبحِ بہاراں میں سل گئی

انگریزیت نے ایسی رچائی تھیں سازشیں
ہوتی ہی جا رہی تھیں دھواں دھار بارشیں
آزاد زندگی کی تمنا گزارشیں
کرنے لگے تھے لوگ بھی اس کی نمائشیں

تھمتا نہیں تھا سیل رواں انقلاب کا
دامن بھی تار تار تھا عزت مآب کا

پردیسیوں کا خوابِ حکومت بکھر گیا
کہتے ہیں لوگ درد کا دریا گذر گیا
آئی سحر تو رنگ گلستاں نکھر گیا
ہندوستاں کا پھر سے مقدر سنور گیا

تعمیرِ نو کا کام جواہر کے ہاتھ میں
اعلان حریت کا کیا جس نے رات میں

دستور ہند آ گیا جلنے لگے چراغ
میخانے پھر سے بھر گئے اٹھنے لگے ایاغ
گردش میں جام آ گیا روشن ہوئے دماغ
ہم کو نئے جہان کے ملنے لگے سراغ

اپنے قدم بھی آج ہواؤں پہ نقش ہیں
مانا مخالفین کے الفاظ ترش ہیں

سوہن راہی، لندن

میں جاگتا ہوں

میں جاگتا ہوں، کوئی نظم سر اٹھائے تو
اُسے میں سینۂ قرطاس پر رقم کردوں
مرے دکھوں کی صلیبوں پہ کیسے کیسے بدن
لٹک رہے ہیں نمائش کو کتنی مدت سے
میں ایک سانس میں کیسے جیا ہوں؟ کیسے مرا؟
ہے میرے ہاتھ کی تحریر میں لکھا شاید
مرے ہی ماتھے کی شکنیں گواہ ہوں شاید
میں اپنا ایک ستم کارساز کرنے کو
ہزاروں خواہشوں کا ایک جال بنتا ہوں
یہ جال سالہا سالوں سے لپٹا رہتا ہے
مرے وجود کے لا انتہا دریچوں پر

❁

ظفر اقبال ظفرؔ، حیلدار فتح پور

تجسس

ایک ٹھہرے ہوئے پانی پہ
نظر ہے اب تک
بلبلہ کس طرح بنتا ہے
ٹوٹ جاتا ہے
یہ تجسس
مرے اندر
ہے ازل سے
اب تک!

شجاع الدین شاہدؔ، ممبئی

گِدھ

شاخِ زیتون چونچ میں لے کر
اک کبوتر پیام امن لئے
جا رہا ہے دیارِ مغرب کو
اُس کی منزل ہے اک سفید سا گھر
گو بظاہر سفید ہے وہ
اس میں تاریکیوں کے سائے ہیں
اور ذاتی منفعت کے لئے
واں سے فرمان جاری ہوتے ہیں
عصبیت اور سیاہ کاری کے
منصوبہ بندیاں بھی ہوتی ہیں
ان کے ناپاک سے عزائم کی
قسمتیں بھی تو لکھی جاتی ہیں
زندہ قوموں کی مردہ قوموں کی
وہیں بیٹھا ہوا ہے اک گِدھ بھی
اپنے ہاتھوں میں ایک جال لئے
اپنے حواریوں کو ساتھ لئے
جشنِ محفل نئی منانے کو
سب نے پھیلائے اپنے دامِ فریب
اپنا اپنا شکار پانے کو
مسخ چہروں سے اضطراب عیاں
سب کی نظروں میں ہے عجیب ہوس
شاخِ زیتون چونچ میں لے کر
کیا کبوتر پہنچ سکے گا وہاں؟؟

افروز عالم، کویت

کیا ہو......؟

کبھی کبھی
بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا
اپنے وجود سے کہیں دور
کسی کوہ سے الجھ جاتا ہے
یوں
بھٹک کر تنہائیوں کی
باہوں میں
پناہ لیتا ہے!
کبھی کبھی
یوں بھی ہوتا ہے
مرے وجود کے نہاں خانے میں
سرکتی ہوئی کوئی صدا
اپنی سرگوشیوں سے
دل کو اُداس کر دیتی ہے
کہ
بے رنگ موسموں کی کڑواہٹ سے
الفاظ کے سحر میں
خواہشات کے ہجوم تلے
فریب کے بھنور میں
الجھ کر
وہ روٹھ جائے تو...... کیا ہو؟
مان جائے تو...... کیا ہو؟

سرور حسین، ہمن پورہ، پٹنہ

دہشت

گھنا جنگل یہ پہلے بھی بہت تھا
مگر یہ خوف نہ تھا
اندھیرا اس قدر گہرا نہیں تھا
کہ ہر رستہ اندھیرے کی خلا میں گم
بصارت...... بے نظر ہو کر بھٹکتی ہے
کہ کوئی ہم نفس صورت نظر آئے کہیں
مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
فقط اک اُس اندھیرے کے سوا
جو دل میں خوف بن کر جھانکتا ہے
اور کہتا ہے
کہ میری سلطنت ہے بس فقط جائے پناہ
یہاں پر خامشی کا سخت پہرہ ہے
یہ کیسی خامشی ہے جو
کہ ہر شئے اب صلیب بے زبانی پر لٹکتی
لب عیسیٰ کی خاموشی کا منظر پیش کرتی ہے
سماعت بے صدا جنگل میں محو خواب ہے
اب یوں
کہ جیسے بے ضمیری کا کفن اوڑھے
مرا احساس اب ہر ظلم پر خاموش رہتا ہے
کسی طوفان کے آنے کی کہیں کوئی خبر سن کر
ہوائیں سانس روکے منتظر ہوتی ہیں جیسے
کوئی لمحہ بھی اب اپنا پتہ دیتا نہیں
مگر یہ دل کی دھڑکن ہے کہ کیا ہے؟
جواب بھی چیختی ہے
خامشی کے بند دروازے کے پیچھے
خموشی بھی تو دہشت ہے
یہاں محفوظ ہم کیسے رہیں گے؟

ڈاکٹر رضوانہ آرم، جمشید پور (جھارکھنڈ)

خواب شگوفے

آ، خواب شگوفے چن لیں ہم
آ، رنج والم کو بھول چلیں

دہلیز پہ رکھ کے آس دیا
اور خواب نئے کچھ چن لیں ہم
دروازے دل کے وا کرنا
پھر لب پہ مہر ثبت کرنا
اور دل کو دلاسے دے دینا
اب صدیوں سے ان آنکھوں پہ
کچھ خواب اُترتے ہی نہیں
میں شاخ طلب پر پھل جاؤں
شاید کہ یہی ہے ربّ رضا
گم سم بوجھل سی دل کی فضاء
ہر آس خوشی میں ڈھل جائے
بس گردشِ دوراں ٹل جائے

سرخیٔ شفق کی نیرنگی
ذہن ودل کو گلرنگ کرے

ہر سو ہو معطر خنک ہوا
کچھ پھول کھلائیں گے دل میں
کچھ آس جگائیں گے دل میں
آ، خواب شگوفے چن لیں ہم
آ، رنج والم کو بھول چلیں

انجینئر محمد خورشید عالم، پرنسپل اقرا اکیڈمی، دربھنگہ

وہ ایک بوڑھا درخت

وہ ایک بوڑھا درخت
برگد کا.......... جو میرے لاج کے پاس ہے
نہ جانے کب سے کھڑا ہے
یونہی تنہا..........
نہ جانے اسے انتظار ہے کس کا
بہت وسیع ہیں بانہیں
بہت وسیع ہے ٹہنی
نہ جانے کتنی ہی نسلوں کو
اس نے دیکھا ہے...... نہ جانے کتنی ہی تہذیب،
اس کے در سے گذری ہے
کبھی تھی اردگرد اس کے نوابوں کی جاگیر
محل، دریچے، غلام، باندیوں کا ہجوم
عجب رعب تھا، دبدبہ تھا مگر..........
اب یہ عالم ہے کہ نہ نواب، نہ محل، نہ دریچے
نہ غلام، نہ باندیوں کا ہجوم
بس ایک پاگل، وجیہہ، خوبصورت نواب کا لڑکا
اور اس کے گرد محلے کے گالی بولتے چھوکروں کا ہجوم
اور یہ بوڑھا درخت نہ جانے کب سے کھڑا
ہے یوں ہی تنہا!

غزلیں

دیپک قمر، میرٹھ

نہیں ہے جام زریں زعفرانی
تمہاری شاعری چشمے کا پانی

بظاہر اب نہیں آتش فشانی
دکھائیں کس کو ہم سوزِ نہانی

بہت ہیں منزلیں اور موڑ رہ میں
مسافر کی نہیں رکتی روانی

محبت کو نہ دیکھیں آنکھ بھر کر
انہیں بھٹکا رہی ہے بدگمانی

نظر ہے فرض کی تکمیل پر ہی
برابر ہیں شکست وکامرانی

وہ ہیرے پربتوں میں کھوجتے ہیں
گلوں کی ہم کریں ہیں باغبانی

نہ اوّل اور آخر کی خبر ہے
نظر میں بس ظہور درمیانی

وہ ہے بیزار وشا کی جسم وجاں سے
اُسے خود سے ہوئی ہے سرگرانی

انوار فیروز، راولپنڈی، پاکستان

اگرچہ لاکھ بے نام ونشاں ہوں
صداقت کا مگر میں ترجماں ہوں

مرا کردار تاریخوں کا حصہ
کہاں میں ایک بھولی داستاں ہوں

فلک سے بھی پرے پرواز میری
اسی باعث یہاں میں لامکاں ہوں

کوئی چہرہ شناسا ہی نہیں ہے
کوئی بتلائے مجھ کو میں کہاں ہوں

زمانہ ساتھ میرے چل رہا ہے
میں اپنے آپ میں ہی اک جہاں ہوں

جنہوں نے نفرتوں کے تیر پھینکے
میں ان کے واسطے بھی سائباں ہوں

مرا ہمسر کوئی انوار کیا ہو
میں اپنا آپ ہی خود آسماں ہوں

پرویز اقبال، مونگیر

کن مرادوں کا ہم انجام ہوئے جاتے ہیں
قیدیٔ گردشِ ایام ہوئے جاتے ہیں

ہے جنوں کا یہ تقاضہ کوئی تسخیر کریں
ہم بہاروں کا بھی پیغام ہوئے جاتے ہیں

یہ تو ہے شہر منافق کی ہی اک بازی گری
ہم بیاباں کا جو الزام ہوئے جاتے ہیں

اک ذرا تجھ سے محبت کی ہے تعذیر عجب
نیک جذبات پہ بدنام ہوئے جاتے ہیں

کیسا آغاز ہے خوابوں کے سفر کا آخر
نذر، اندیشہ انجام ہوئے جاتے ہیں

کیسے کترانے لگے سارے شناسا چہرے
جب سے ہم پیکر آلام ہوئے جاتے ہیں

اتنا کافی ہے گلستانِ وفا میں پرویز
ہم بہاروں کا بھی پیغام ہوئے جاتے ہیں

منور رانا، کولکاتہ

سنبھالنے نہیں آتا سنبھل کے جاتا ہے
کھلونے والا تو خود ہی بہل کے جاتا ہے

یہ پوچھئے کہ گذرتا ہے کس اذیت سے
وہ ایک آنسو جو پلکوں پہ چل کے جاتا ہے

عجیب آنکھیں ہیں ہر وقت روتی رہتی ہیں
عجیب جام ہے ہر وقت چھلکے جاتا ہے

میں راہِ عشق کے ہر پیچ وخم سے واقف ہوں
یہ راستہ مرے گھر سے نکل کے جاتا ہے

یہ وہ مقام شفا ہے جہاں پہ صدیوں سے
اٹھا کے لاتے ہیں جس کو وہ چل کے جاتا ہے

عقیل گیاوی، دھنباد (جھارکھنڈ)

صبح کی تازہ ہوا کا اب نہیں اظہار تک
شعلگی منظر یہ منظر دشت سے گلزار تک

حادثہ کیسا ہوا اب کے ہمارے شہر میں
مضمحل ہیں شہر کی بجلی کے ننگے تار تک

میرے اس کے فاصلے کے درمیاں ہی رہ گیا
تیر دشمن کا نہیں پہونچا مری دستار تک

خوں خرابے سے رہا محفوظ دشت زندگی
جنگ کی دھمکی رہی محدود بس گفتار تک

قہر خیزی کا عجب منظر ہے میرے سامنے
ہوگئی مسمار گھر کی آہنی دیوار تک

زندگی گذری ہے کتنے منظروں سائے عقیل
پھول کی خوشبو سے تپتی ریت کے انبار تک

قمر سیوانی، محلہ پرانہ قلعہ (سیوان)

ظرف دریا ہے دل سمندر ہے
پیاس پھر بھی مرا مقدر ہے

تم کہاں تک مجھے سنبھالوگے
راہ میں ہر قدم پہ ٹھوکر ہے

کس نے پوچھا ہے حال دل میرا
کون اتنا غریب پرور ہے

میرے آنسو کا ایک اک قطرہ
اپنی اپنی جگہ سمندر ہے

جس کے ہاتھوں میں کل کھلونا تھا
اس کے ہاتھوں میں آج خنجر ہے

گھر سے نکلو تو ہو یہ اندازہ
کون بھوکا ہے کون بے گھر ہے

رات دن رہتا ہے پریشاں وہ
دوستوں کا کرم قمر پر ہے

سید جعفر امیر، امریکہ

ہوئی سحر تو شب غم کا اضطراب نہ تھا
جنونِ عشق اِدھر، اور اُدھر شباب نہ تھا

رہی وہ رونقِ محفل نہ اس کے جانے سے
فسونِ رقص گیا، نغمۂ رباب نہ تھا

یہ فائدہ تو ہوا مجھ کو دہشت گری سے
بچے کو اپنے کوئی خانہ خراب نہ تھا

سنا تھا پہلی نظر میں دلوں کا ٹکرانا
نظر جوان سے ملی کل تو اجتناب نہ تھا

رہا نہ عشق بتاں نہ رہا وہ دیدۂ تر
وہ آنکھ سوکھ گئی جس کو عذرِ آب نہ تھا

ڈاکٹر پریمی رومانی، جموں

ہوئی ہے گفتگو ان سے خیالوں میں
مجھے لایا گیا ہے یوں خوابوں میں

جوابوں کی لطافت سے سوالوں میں
بھروں خوشبو تصور میں خیالوں میں

مجھے ڈستی ہے تنہائی کی تاریکی
رہا ہوں عمر بھر زہرہ جمالوں میں

سکڑ جاؤں تو بن جاؤں میں اک نقطہ
بکھر جاؤں تو بٹ جاؤں مثالوں میں

رہے گا تیرگی سے واسطہ جس کو
نہ آنکھیں کھول پائے گا اُجالوں میں

رازؔ سیوانی، سیوان

یہاں ڈر کر قلندر بولتا ہے
نہ چارہ گر نہ رہبر بولتا ہے

کمال دست اہل فن تو دیکھو
سدا سولی پہ چڑھ کر بولتا ہے

حکومت باز کی ہے دل یہ لیکن
ہمیشہ سچ سخنور بولتا ہے

یہ کس احسان نے گویائی دے دی
زباں تیشے کی پتھر بولتا ہے

کبھی دستار کے قابل نہیں تھا
خیالوں میں کبوتر بولتا ہے

گماں ہوتا ہے سچ کا جھوٹ جس پر
یہ کیوں قاتل کا خنجر بولتا ہے

دھڑ سے یہ الگ سر بولتا ہے
سخن وہ رازؔ اکثر بولتا ہے

راج پریمی، بنگلور

بول اونچے نہ بول دیوانے
بند مٹھی نہ کھول دیوانے
کان دیوار کے بھی ہوتے ہیں
اور آہستہ بول دیوانے
کون، کتنا بُرا ہے، جانے دے؟
اپنے دل کو ٹٹول دیوانے!
دِل دُکھے نہ، کسی کا باتوں سے
صرف نظروں سے بول دیوانے
سانس لیتی ہوئی ترازو میں
اپنا ایمان، تول دیوانے
راج دنیا ہے، یہ لٹیروں کی
بھید دِل کے، نہ کھول دیوانے
راج ہرسمت ہے، کمینوں کا
بات تیکھی ہے، بول دیوانے

انجم سیوانی، سیوان

حُدودِ جَور سے آگے گزر گئے ہم بھی
ستمگروں سے بچا کر نظر گئے ہم بھی
زمیں پہ ظلم وتشدد کا بول بالا تھا
یہ سوچ کر ہی خلا میں اُتر گئے ہم بھی
ہمارے سامنے کوئی پہاڑ رائی ہے
اِسی اَنا میں جو ڈوبے تو مر گئے ہم بھی
اُدھر خیالِ جہاں تھا اِدھر تھی رسمِ وفا
بشکلِ اشک تو آنکھوں میں بھر گئے ہم بھی
درِ نیاز پہ مامور تو ملائک تھے
حریمِ ناز میں بے بال و پر گئے ہم بھی
ہر ایک گام پہ حالات ناگوار تو تھے
مگر حصار میں گھِر کر اُبھر گئے ہم بھی
ستم سے آنکھ ملانا محال تھا انجم
فضائے وقت کے تیور سے ڈر گئے ہم بھی

غلام مصطفیٰ روحی، سیوان

کہیں یہ پھول کہیں برگ وبار کی خوشبو
نہ دے کوئی مجھے خوشبو گلاب وعنبر کی
کسی کسی کو یہ دولت نصیب ہوتی ہے
زمانہ اس کا بھلا کیوں نہ مدح خواں ہوگا
خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے ہر دم
بہت حسین سی لگتی ہیں اس گھڑی پلکیں
ہر ایک سمت معطر ہوئی فضا روحیؔ

مہک رہی ہے چمن میں بہار کی خوشبو
مجھے تو چاہئے بس ''ماں'' کے پیار کی خوشبو
کہاں نصیب میں سب کے قرار کی خوشبو
لٹا رہا ہے جہاں میں جو پیار کی خوشبو
ملے اگرچہ جہاں میں وقار کی خوشبو
نشیلی آنکھ میں جب ہو خمار کی خوشبو
اڑی ہواؤں میں جب زلفِ یار کی خوشبو

سہیل غازی پوری، مدیر "شاعری" (پاکستان)

شہر فن میں تھیں بہت دشواریاں
کون کرتا حاشیہ برداریاں
ہر کسی کو اپنی ہی بس فکر ہے
بھول بیٹھے لوگ اب غم خواریاں
اب کہاں گنتے ہیں تارے رات میں
اب کہاں ہوتی ہیں شب بیداریاں
عزم محکم سے ملی منزل ہمیں
راستے میں رہ گئیں دشواریاں
شہر والے دم بخود تھے دیکھ کر
دشت میں ہوتی رہیں گل کاریاں
کس طرح پاتے متاع فکر و فن
راستہ روکے رہیں ناداریاں
سر سے اونچا ہوگیا پانی مگر
مچھلیوں بیٹھی رہی خود داریاں
دیمکیں ساری کتابیں کھا گئیں
دیکھنے میں تھیں نئی الماریاں
ہیں مثالی ہر ستارے کے لئے
جگنوؤں کی آئینہ برداریاں
انگلیاں اپنی جلا بیٹھے سہیل
پھول کے دامن میں تھیں چنگاریاں

گلشن کھنہ، لندن

سینۂ احساس پر ہر زخم ہے اُبھرا ہوا
اس کو جب دیکھا تو غم کچھ اور بھی گہرا ہوا
یاد ہے اس سے بچھڑنے کا وہ منظر آج بھی
تھا رواں آنکھوں سے اک سیلابِ غم ٹھیرا ہوا
میری آہیں کون سنتا ہے سناؤں میں کسے
سننے والا میری چیخوں سے تو اب بہرا ہوا
دل مرا جو ٹوٹ کر ٹکڑے ہوا تو یوں لگا
جیسے اس سے اک تعلق اور بھی گہرا ہوا
لوگ سب ہیں بھوک اور افلاس کے مارے ہوئے
زندگی کا یہ سمندر موت کا صحرا ہوا
اس کے چہرے سے نظر ہٹتی نہیں گلشن مری
یوں ہے جیسے اس کا چہرہ میرا آئینہ ہوا

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ-۴ (بہار)

نذر احمد فرازؔ

تمہارے جاتے ہی ہر دیدہ تر کو دیکھتے ہیں
وہیں ہے ماتم غم ہم جدھر کو دیکھتے ہیں
فراز ہوگئے رخصت ہوا ہے سناٹا
اداس اداس ہم شعری سفر کو دیکھتے ہیں
کہاں وہ عشق جواں کی ٹھہر گئیں کرنیں
رکی رکی ہوئی بامِ سحر کو دیکھتے ہیں
سنا ہے فیض سے آگے نکل گئے تھے فراز
غزل کے سوزِ دروں کے اثر کو دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس نے غزل کا بدل دیا لہجہ
اسی زمین کی ہم رہگزر کو دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کی غزل کا بڑا کرشمہ تھا
اُسی دیار کے جادو نگر کو دیکھتے ہیں
وہ جب رہا تو سجی غمزدوں کی بزمِ سخن
سنا ہے لوگ اب اس کے ہنر کو دیکھتے ہیں
کہاں فراز کہاں اعظم شکستہ جاں
ذرا سی چل کے ہم اس کی ڈگر کو دیکھتے ہیں

ڈاکٹر محسن جلگانوی، حیدرآباد

کبھی شعلہ، کبھی شبنم کی ردا ہیں ہم لوگ
آج تک خود نہیں سمجھے ہیں کہ کیا ہیں ہم لوگ
اپنا سر اپنے ہی نیزے پہ لئے پھرتے ہیں
جانے کس جرم کی سنگین سزا ہیں ہم لوگ
راکھ کے ڈھیر میں بارود چھپا رکھی ہے
ہم کو مت چھیڑنا شعلوں کی قبا ہیں ہم لوگ
برف موسم کے درندو! ذرا بچ کر رہنا
ایک جلتے ہوئے جنگل کی ہوا ہیں ہم لوگ
زندگی تجھ سے نہ ملنے پہ پریشان نہ ہو
تجھ سے ناراض نہیں خود سے خفا ہیں ہم لوگ
اس سے مل لیتے مگر خود سے کہاں مل پاتے
اس کے بھولے ہوئے رستے کا پتہ ہیں ہم لوگ

سیما عابدی، امریکہ

ارتعاش روشنی کچھ دیر تو ٹھہرے ذرا
خالی آنکھوں میں پرانا خواب ہی جاگے ذرا
اس بھٹکتے پاؤں کو رستوں سے شکوہ تو نہیں
منزلوں کی بے نیازی سے کہو پرکھے ذرا
مدتوں سے ہم پہ ہے کالے تمدن کا عذاب
چپ کا پتھر چاک ہو تو یہ کہن پگھلے ذرا
کب تلک سنگین یادوں پر بھروسہ جاں کرے
خوب چیخو ظلمتوں کی رات دم توڑے ذرا
ہو سکے تو آج ہو جائے حساب زخم دل
ہے یہی پل اس بہانے قرضِ جاں اترے ذرا
دم گھٹے سینوں نے توڑا ہے بھرم انصاف کا
آج قاتل کی نگاہوں میں کشش و پیچ ہے ذرا
اپنی اپنی نیتوں کا عکس ہوتے ہیں عمل
سیما سچ کہنے سے آئینے نہیں ڈرتے ذرا

علاء الدین حیدر وارثی، دربھنگہ

فضا میں گل کھلانے سے زمیں دھانی نہیں ہوتی
اگر فاراں کی چوٹی سے نگہبانی نہیں ہوتی
سنا ہے حسن والوں پر کرم تیرا نہیں ہوتا
اگر سرزد کبھی ان سے یہ نادانی نہیں ہوتی
ہر اک تخلیق میں خالق کا پرتو مسکراتا ہے
کبھی بھی نامکمل شکل انسانی نہیں ہوتی
علاجِ دردِ تنہائی نہیں ہے کچھ سوا ان کے
اگر وہ ساتھ ہوتے پھر یہ ویرانی نہیں ہوتی
مری تازہ شباہت میرے البم کی بدولت ہے
پرانی کوئی بھی تصویر خوبانی نہیں ہوتی
سدا آواز نے محلوں پہ اپنا دبدبہ رکھا
یہاں گونگوں کی دنیا سے تو سلطانی نہیں ہوتی
ہمیں دیوانگی مجنوں کی حیدر یاد کیوں آتی
اگر بحر محبت میں یہ طغیانی نہیں ہوتی

رونق شہری، جھریا (جھارکھنڈ)

سیلاب کوسی کی نذر

جسم کا بوجھ گرایا نہیں جاتا ہوگا
ساتھ اس کے کوئی رستہ نہیں جاتا ہوگا
آپ کیا سوچتے ہیں زہر ملے دریا سے
کوئی بھی آدمی پیاسا نہیں جاتا ہوگا
اس اذیت میں نہ تھا نام خدا بھی لب پر
خوف کے مارے بھی بولا نا نہیں جاتا ہوگا
لاش پر جو بھی ہے پتھر کا بنا بیٹھا ہے
رسم کے طور پر رویا نہیں جاتا ہوگا
چہرۂ دنیا تھا مکروہ بہت پہلے ہی
اس سلیقے سے سنوارا نہیں جاتا ہوگا
اپنے آنسو میں چمکنے کا نہیں یہ مطلب
ہوکے آنگن سے ستارہ نہیں جاتا ہوگا
منصف وقت نے پھر توڑ دیا اپنا قلم
فیصلہ اس سے بھی لکھا نہیں جاتا ہوگا

احسان ثاقب، گوبند پور، نوادہ (بہار)

یہ تو بس مرا جنوں ہے یہ تو ہاں میری خطا ہے
میں نے دل کے ہر ورق پر ترا نام لکھ دیا ہے
جسے تو کہے فسانہ اسے میں کہوں حقیقت
کہ وہی ہے میری منزل جہاں تیرا نقش پا ہے
یہ یقین اس کا مجھ کو مجھے بس وہی ملے گا
مرے کاتب قلم نے جو نصیب میں لکھا ہے
ادھر آ تجھے دکھاؤں نئے دور کی نوازش
کہ کماں اٹھی نہیں ہے مگر تیر چل گیا ہے
سر راہ تن سے چادر بے گمان گر پڑے گی
وہ بھی سانحہ اٹھے گا جو ابھی نہیں اٹھا ہے
کھلی آنکھ رکھنے والوں کے مشاہدے غلط ہیں
یہ میں نہیں زمانہ کھلے عام کہہ رہا ہے
یہاں کون معتبر ہے چلو میں بھی دیکھوں ثاقب
وہ زباں سے بولتا ہے کہ قلم سے بولتا ہے

ڈاکٹر عبرت بہرائچی (یوپی)

غم کے رہنے کے لئے دل میں کوئی گھر رکھنا
اپنی دلجوئی کی خاطر کوئی منظر رکھنا
سنگ بنیاد محبت کی اگر رکھنی ہو
دل ناداں کو قریب اپنے بٹھا کر رکھنا
آدمیت کے اُصولوں کے منافی ہوگا
جسم پر پھول کے جلتا ہوا پتھر رکھنا
اتنی بارودی سرنگیں ہیں زمیں کے نیچے
پاؤں تم رکھنا جہاں سوچ سمجھ کر رکھنا
ورنہ کھل جائے گا عظمت کا بھرم لوگوں پر
پاؤں چادر سے کبھی اپنے نہ باہر رکھنا
جس کی گہرائی سے احساس ہو خودداری کا
بحر قلزم کی طرح دل میں سمندر رکھنا
کیا خبر دیش پر کب آن پڑے سخت گھڑی
وقت نازک کے لئے سر کو بچا کر رکھنا
صدیوں سے نہ طلب جس نے کیا ہو پانی
دھیان میں اپنے کوئی ایسا سمندر رکھنا
عصر حاضر کا تقاضا ہے یہی اے عبرت
عالم خواب میں بھی ساتھ میں خنجر رکھنا

ڈاکٹر عظیم ہاشمی، بتیا

وہیں پہ ہم بھی صدیوں سے کھڑے ہیں
جہاں پہ میل کے پتھر گڑے ہیں

تجربوں کے ہیں جن میں سارے موسم
وہ سوکھے پیڑ عظمت میں بڑے ہیں

نئے سورج کے پہریدار سارے
اجالے ہی سے کیوں سہمے ڈرے ہیں

پگھل جائیں گے ہلکی بارشوں سے
اس آنوے میں سبھی کچے گھڑے ہیں

وہی بے لاگ باتیں ہیں ابھی تک
کہاں مجھ میں ابھی ہیرے جڑے ہیں

عظیم ہاشمی بولے گا سب کچھ
مگر حالات کے تیور کڑے ہیں

رئیس الدین رئیسؔ، علی گڑھ

نہ کام آئے گی میرے یہ بے زبانی کیا
سنا سکے گا نہ چہرہ مری کہانی کیا

زمین دشتِ غزل تو ہی خود بتا میں نے
سراب لفظ کو بخشے نہیں معانی کیا

ہر ایک روز نئی جستجو نئی منزل
ہمارے پیروں سے لپٹی ہے بے مکانی کیا

میں لمحہ لمحہ نئے بیج بوتا رہتا ہوں
زمینِ فکر کرے گی نہ مہربانی کیا

ورق ورق جو مضامیں کی فصل کاٹتا ہوں
دیئے ہیں فکر نے بازو مجھے کسانی کیا

سفیر شہرِ دِگر بھیگے بھیگے آتے ہیں
مرے ہی شہر میں برسا نہیں ہے پانی کیا

ہر ایک رات رئیسؔ آسماں سے پوچھتا ہوں
نہ ختم ہوگی کبھی تیری بدگمانی کیا

محبوب حسین مہرؔ، بھسی (مشرقی چمپارن)

مروت چھین لیتی ہے، شجاعت چھین لیتی ہے
کسی کو دینے کا ارمان سارا، دل میں رہ جاتا
بنو سنورو، مگر اتنا نہ سنورو، دنیا کے اندر
گھمنڈ، غرور دنیا میں کسی کا رہ نہیں پاتا
محبت، پیار والفت کا، بہے گا جب کبھی دریا
ذرا سی بھول پر ساری مصیبت سر پہ آتی ہے
بدل دنیا گئی ہے، مہرؔ تم اب تک نہیں بدلے

مری گاڑھی کمائی کو عورت چھین لیتی ہے
ضرورت آدمی کی ہر سخاوت چھین لیتی ہے
ہوس کی ہر نگاہ عورت کی عصمت چھین لیتی ہے
انا کی لت کتنوں کی شجاعت، چھین لیتی ہے
محبت دشمنوں سے بھی عداوت، چھین لیتی ہے
وہی اک بھول ہی پرکھوں کی عزت، چھین لیتی ہے
حماقت آدمی کی تاب وطاقت، چھین لیتی ہے

ڈاکٹر نور محمد عاجز، دربھنگہ

نہ دل نہ اب دماغ رہا اختیار میں
اب کیا کہوں کہ حال ہے کیا انتظار میں
ٹکڑے ہیں آرزوؤں کے روشن کچھ اس طرح
ہر شب شب دیوالی ہے اب کوئے یار میں
وہ اعتبار جس پہ کہ تکیہ تھا دل کا دوست
یہ دل ہوا تباہ اسی اعتبار میں
دھوکہ ہے، اک فریب ہے رنگین سا سہی
رکھا ہی کیا ہے دوستو قول و قرار میں
گویا کہ اضطراب ہی ہے روح زندگی
ملتا کہاں قرار ہے مجھ کو قرار میں
میری فغاں کے سوز سے ہے آتشیں شفق
حدت کہاں سے ہوگی یہ اتنی شرار میں
ہو جو سکوں تو اور بھی رہتا ہے مضطرب
دل کو ہے چین ذہن جو ہو انتشار میں
نہ وہ، نہ گل، نہ شمع نہ بزم جام ہے
عاجز لگادو آگ تم ایسی بہار میں

کرشن پرویز، کھرار، روپر (پنجاب)

انہیں یہ ڈر کہ پریشاں کریں گے دیوانے
ہمیں یہ خوف کہ بڑھ جائیں گے یہ پروانے
کلی پہ رنگ گلوں پر نکھار کی خاطر
بہار مانگ رہی ہے لہو کے نذرانے
چمن میں خاروں نے دامن ہمارا تھام لیا
کبھی گئے تھے چمن میں جو دل کو بہلانے
ہر ایک شخص خود اپنے میں ہوگیا محدود
برائے نام ہیں دنیا میں اب تو یارانے
کسی نے حال نہ پوچھا تو پھر گلستاں میں
بہار آئی تھی کانٹوں کے زخم سہلانے
پرکھ ہی لیں گے کبھی وقت کی کسوٹی پر
وفا کی راہ میں اپنے ہیں کون بیگانے
سکون دل کے لئے سب تیرے جہاں والے
کہاں کہاں پہ بھٹکتے ہیں یہ خدا جانے
کیا ہے وقت نے پرویز حال یہ اپنا
ہمارے گھر میں ہی ہم کو کوئی نہ پہچانے

ڈاکٹر نسیم اختر، وارانسی (یوپی)

(تمثیل نو" کے لئے)

لہو منظر شرارے دیکھتے ہیں
ہم ان میں نین تارے دیکھتے ہیں
کہاں ڈل جھیل میں پھولوں کے نغمے
کہ اب ٹوٹے شکارے دیکھتے ہیں
چہکتی تتلیاں، خوش رنگ طائر
حسیں پیکر نظارے دیکھتے ہیں
تبسم ریز لب، مخمور آنکھیں
سہانے استعارے دیکھتے ہیں
دیے بن تیل کے اب بجھ رہے ہیں
ہم ایسے بے سہارے دیکھتے ہیں
سوا نیزے پہ بھی آئے گا سورج
کتابوں میں اشارے دیکھتے ہیں

ظفرؔ مجیبی، شاستری نگر، موتیہاری

خوشبو گلاب میں ہے رنگت شباب میں ہے
ہے شمس میں تپش تو بجلی سحاب میں ہے
پیری چھپاتا کیوں تو ایسے خضاب میں ہے
رنگت زوال کی اب تیرے شباب میں ہے
کیا ڈھونڈتا ہے اب تو الماریوں میں اپنی
کل جو لکھا تھا خط وہ اس کی کتاب میں ہے
قاصد جو لایا تھا خط اس پر یقین کر لے
تھی جس کی جستجو وہ اس کے جواب میں ہے
شیریں زبان تیری نظریں جھکی جھکی سی
پوشیدہ حسن سارا تیرے حجاب میں ہے
اس رات کو بھلا دو جس رات خون بہا تھا
ظالم کی زندگی تو خود ہی عذاب میں ہے
مجرم جو آپ ہی ہے مجرم کو دیں سزا کیا
جرم و ستم نوشتہ اس کی کتاب میں ہے
کب تک رہے گا پیاسا تیرا ظفر الٰہی
رحمت کی کر تو بارش بندہ عذاب میں ہے

سیدہ نسرین نقاش، مدیرہ ''صدا'' سری نگر

وہ بھول جائے گا دشمن کا نام ناممکن
ہمارے ساتھ کرے گا کلام ناممکن
عطا کرے گا ہمیں زہر یہ تو ممکن ہے
پلائے گا وہ محبت کے جام ناممکن
بھلا تو دیتے ہیں ہمیں ہر بات دن کے ہنگامے
نہ یاد آئے کوئی وقت شام ناممکن
وہ انجمن میں کرے گا ہر ایک کو آداب
ہمیں بھی جھک کے کریگا سلام ناممکن
کبھی کے حق میں خلوص و وفا کے نامے گئے
ہمارے نام بھی آئے پیام ناممکن
رقیب خوف سے میرے اُسے جو چھوڑ گیا
نہ لے گا مجھ سے وہ اب انتقام ناممکن

تمہاری فکر میں ہے اب بھی تشنگی نسرینؔ
سخنوروں میں ملے گا مقام ناممکن

روما نہ رومیؔ، کراچی (پاکستان)

کوئی دھوکا، دغا بازی، ریا کاری نہیں مجھ میں
ستم سہہ کر زمانے کا میں آگے بڑھتی رہتی ہوں
اسیر زلف کرنا اس قدر مشکل نہیں تجھ کو
میں چاہوں تو مجھے بڑھنے سے آگے کون روکے گا
زباں تو میں بھی رکھتی ہوں اڑا دوں ہوش محفل کے
میں جس کی ہوں اسی کی راہ پر چلنے دے اے دنیا
میں رومیؔ مصلحت آمیز جملے لکھ نہیں سکتی

بناوٹ پر فریبی اور مکاری نہیں مجھ میں
کہ اک باحوصلہ عورت ابھی ہاری نہیں مجھ میں
مگر کیسے بتاؤں یہ اداکاری نہیں مجھ میں
کسی کو زک نہیں دیتی کہ ہشیاری نہیں مجھ میں
کسی کو رنج دینا یا دل آزاری نہیں مجھ میں
وفا عورت کا زیور ہے سو غداری نہیں مجھ میں
قلم انصاف کرتا ہے طرفداری نہیں مجھ میں

حسرتؔ مونگیری، مونگیر

جو بے شعور تھا اسے چلنا سکھا دیا
سانچے میں وقت کے اسے ڈھلنا سکھا دیا

یہ زندگی فقط تھی مجازِ نشاط کار
اپنے بدن کو دھوپ میں جلنا سکھا دیا

فرمان ہے غنیم کا تم جاؤ اپنے شہر
اس نے مجھے بھی شہر بدلنا سکھا دیا

یارب ترا کرم ہے کہ خاروں کے درمیان
خوشبو سے بھر دیا ہے مچلنا سکھا دیا

صدیوں سے تھے جو نیند کی آغوش میں پڑے
حسرتؔ نے ان کی آنکھ کو ملنا سکھا دیا

ہریندر گری شادؔ، گیا

پھر آنسوؤں سے اپنی تھکن دھورہی ہے رات
گھٹنوں میں سر چھپائے ہوئے رورہی ہے رات

وہ چاند کا غبار ہوا لے اُڑی ہے شاید
تاریکیوں کا اندھا سفر ہورہی ہے رات

شاید کہ اس کی جیب سرِراہ کٹ گئی
ہر شئے کو گھورتی ہوئی اب سورہی ہے رات

چادر کی طرح تن پہ اندھیرا لپیٹ کر
برفیلی دُھند اوڑھے ہوئے رورہی ہے رات

فٹ پاتھ پہ بکھرے ہوئے ہیں شادؔ ہزاروں
لاشوں کی اک جلوس کو پھر ڈھورہی ہے رات

ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی (یوپی)

خلوص، پیار، نجابت، کہاں تلاش کریں
نئی صدی میں یہ دولت کہاں تلاش کریں

جو بن چکی ہے ضرورت کہاں تلاش کریں
ہمیں بھی چاہئے شہرت، کہاں تلاش کریں

جہاں بھی جاؤ وہاں نفرتوں کے ڈیرے ہیں
تمہیں بتاؤ محبت کہاں تلاش کریں

مرے وجود میں موجود ہے اجل سے کوئی
دیارِ قلب میں راحت کہاں تلاش کریں

وہ چشم جس میں مروّت کا کوئی اشک نہ ہو
ہم ایسی آنکھوں میں الفت کہاں تلاش کریں

علومِ شعری سے محروم ہوگئی غزلیں
ہم ان میں صنعت وحرفت کہاں تلاش کریں

ہمارا گھر ترے آنے سے ہوگیا جنت
گھر اپنا چھوڑ کے جنت کہاں تلاش کریں

فریب دے کے زمیں جس کو کھاگئی ہے قمرؔ
وہ حسن خوب وہ صورت کہاں تلاش کریں

نظر اپنی اپنی

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

نام کتاب: سودیدہ ور، مصنف: پروفیسر عبدالمنان طرزی، اشاعت: ۲۰۰۸ء، صفحات: ۲۰۸، قیمت: ۔/۲۰۰ روپے، ناشر مصنف: ایچ۔ اے منان طرزی، محلہ فیض اللہ خان، دربھنگہ۔۸۴۶۰۰۴، مبصر: حسن امام درد، دربھنگہ

پروفیسر عبدالمنان طرزی کو اردو زبان پر نہ صرف حاکمہ تصرف حاصل ہے بلکہ پرتاثر شعر گوئی کی وہ استعداد حاصل ہے جو فی زمانہ ہی نہیں بلکہ ماضی قریب کے شعراء کے یہاں بھی مفقود ہے۔ ساتھ ہی تحقیقی، تنقیدی اور تحسینی شعور بھی بڑی بالیدہ ہے۔ کسی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے متعلق دیگر دانشوروں کے خیالات کا بھی احترام کرتے ہیں۔ طرزی صاحب کی شعر گوئی کا نیا دور ۲۰۰۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس درمیان ان کی شعری تخلیقات کی سولہ کتابیں آچکی ہیں۔ جن کے اشعار کی مجموعی تعداد سولہ ہزار سے زیادہ ہے۔ ساتھ ہی ہندی فکشن کی دو کتابوں کا ترجمہ اور سابقہ شعری مجموعہ (پہلا ایڈیشن ۱۹۷۲) ''لکیر'' کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

زیر نظر کتاب ایک سو نابغۂ روزگار دانشوروں کا شعری تذکرہ ہے۔ صرف تذکرہ ہی نہیں ہے ان کے کارناموں پر تحقیقی و تحسینی نظر بھی ڈالی گئی ہے اور پھر طرزی صاحب کے کلام کی شعری ندرت نے حسن اظہار کا جادو جگایا ہے۔ جس میں غزل کی دلربائی، نظم کی معروفیت اور ترسیل کا نکھار ہے۔ ان ایک سو دیدہ وروں کی تصویروں کا حصول بھی ایک بڑا کارنامہ ہے، جو امیر خسرو، قلی قطب شاہ جیسے قدماء سے لے کر عصر جدید کے نوجوان قلم کاروں تک محیط ہے۔

طرزی صاحب کی منظوم تذکرہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ معنوی معروفیت کے ساتھ ساتھ تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال نے ایک دلفریب شعری جمال پیدا کر دیا ہے۔ رفتگاں وقائماں سے لے کر سودیدہ ور تک، جو تنقیدی اشارے ہیں وہ اتنے جامع ہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے سند کی حیثیت رکھیں گی۔ یہ چند مثالیں میری گفتگو کا ثبوت ہیں۔

رضوان احمد کے افسانوں پر تبصرہ:

ہو اگر فنکار کا بالیدہ تخلیقی شعور
ان کے افسانوں میں ہے کچھ ایسا فنی انضباط

وہ ہر اک تخریب کو تعمیر کا دیتا ہے نور
یعنی ہے تہذیب فن کا نام ان کی احتیاط

سہیل عظیم آبادی کے فن پر:

ان کا فن ہے زندگی کی راستی کا ترجماں
ان کا فن آواز ہے مظلوم اور مجبور کی

ان کا فن ہے غربت وافلاس کی رسوائیاں
جستجو ظلمت کی بستی میں شواع نور کی

امیر خسرو:

منہ پر جو کیس ڈارے اک سوگئی تھی گوری
ہر صنف میں سخن کے چھوڑے نقوش اس نے

اس کی پریم نگری چھو دیس رین سگری
راگوں سے اور سروں سے تھے اس کے رشتے گہرے

قلی قطب شاہ:

بغور اس کے فن کا جو لیں جائزہ — نمونہ ہے مخلوط تہذیب کا
وہ ایک تہذیب کا ترجماں — کھلا جس سے ہے رنگ ہندوستاں
مزاج سخن ہندی اور ہندوی — تو ہے دیومالائی تلمیح بھی

مولانا مقبول احمد خاں:

کتنی ہی گزری ہیں دربھنگہ میں ایسی ہستیاں — تھی زمانے میں جو علم وفضل والی بے گماں
ہستیوں میں ایسی ہی مقبول احمد خاں بھی تھے — آفتاب وقت ہی کتنے چراغ ان سے بنے
تیس سے انیس ہو، پینتیس تک کی زندگی — مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ہی میں کٹی

دیدہ ور محقق ور جحان ساز ناقد گوپی چند نارنگ نے طرزی صاحب کی زود گوئی سے متاثر ہو کر انہیں جن لکھ دیا' اور ہمارے اکثر دانشوران کرام نے بھی یہی لیبل لگانے کو ترجیح دی۔ لیکن ایسے کارنامے انجام دینے کے لیے اللہ رب العزت اپنے بندوں میں سے چن لیتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں جینیس ہوتے ہیں نہ کہ جن! ویسے آج کے دور میں اردو ادب میں جینئس اور نابغۂ روزگار کے تمغے سے مزین ایک بھیڑ نظر آتی ہے۔

ایک بات اور عرض کردوں کہ طرزی صاحب کی بیشتر تخلیقات کی حیثیت دستاویزی ہے۔ یہ آئندہ کے محققین کے لئے بڑی کارآمد ہوگی۔ میری رائے ہے ہر اچھی لائبریری اور یونیورسٹی کے کتب خانوں میں اس کو رہنا چاہئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس تذکرے میں صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ تمام اردو دنیا بہ شمول یورپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے دیدہ ور کا بھی تذکرہ ہے۔

نام کتاب: سید شمیم احمد: آئینہ در آئینہ۔ مصنفہ: ڈاکٹر انوری فرمان، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی-۶، صفحات: ۱۸۳، قیمت: ۲۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۰۸ء، مبصر: حسن امام درد، دربھنگہ

زیر تبصرہ کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر انوری بیگم، جمشید پور کوآپریٹو کالج کی صدر شعبۂ اردو ہیں، جس چیئر پر کبھی منظر شہاب جیسے عظیم ادیب فائز ہوا کرتے تھے۔ مصنفہ نے کم عمری میں ہی بہت تیزی سے ادبی سفر طے کیا ہے۔ وہ ناقد، محقق، شاعر اور کہانی کار بھی ہیں، ان کی تحقیق ''قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ کلچر'' ''افسانوی مجموعہ ''کرچیاں اعتماد کی'' اور تین شعری مجموعے ''خاموش شگوفے'' ''طائر خوں فشاں'' ''درد آشنا'' منظر عام پر آ کر قارئین سے داد تحسین پا چکے ہیں۔ اب ''سید احمد شمیم، آئینہ در آئینہ'' میں انہوں نے شمیم کی تمام تخلیقات کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ خصوصاً نظموں کی تہ بہ تہ پوشیدہ مفہوم ومعنی تک رسائی حاصل کر کے قارئین کو اپنے تاثرات سے روشناس کرایا ہے۔ زبان وبیان اتنی پر معنی اور شگفتہ ہے کہ نثر میں شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ نمونہ ''تجسس'' نے نگاہوں کے کان بھرے'' اور نگاہیں امواج معنی سے الجھنے لگیں..... پھر کیا تھا دل نے ان لہروں کی رعنائیوں میں ڈوب ڈوب جانے کے لئے مچلنا شروع کر دیا اور میں نظموں اور غزلوں کی دھڑکنوں میں اترتی چلی گئی۔ خدا معلوم دھڑکنوں کی زبان نے میرا ساتھ دیا بھی یا نہیں؟ اور اگر دیا تو کہاں تک؟

مصنفہ کے مندرجہ بالا استفہام کا جواب میں (راقم الحروف) کہتا ہے کہ انہوں نے ان دھڑکنوں کو نہ صرف زبان عطا کی بلکہ صفحۂ قرطاس پر بھی اجاگر کر دیا، دیکھئے ''سید احمد شمیم نے ابہام کی بجائے ریشمی پردوں کو اپنے اظہار کا فن بنایا ہے۔'' شاعر کا سچ ایک ناز دلربائی سے اپنی چھب دکھاتا ہے اور قاری کو سحر زدہ کر دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں متجسس ذہن و دل سچ کی اس آنکھ مچولی میں برابر شریک ہوتے ہی اور سچ کی یافت پر کیف ونشاط سے جھوم اٹھتے ہیں۔'' ...... اس مختصر تبصرہ میں زیادہ اقتباس کی گنجائش نہیں ہے۔ مقالہ نگار نے شمیم کی تنقیدی بصیرت کے سلسلہ میں یہ صحیح لکھا ہے کہ ان کے تخلیقی ذہن نے ان کے لئے تنقید کی راہ ہموار کی۔ ان کی تخلیق تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے اور تنقید تخلیقی ذہن کی پیداوار ہے۔ لیکن یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ جس تمکنیت کے ساتھ ان کا نام شاعری میں لیا جاتا ہے ویسا تنقید کے لئے نہیں لیا جاتا۔ سید احمد شمیم کے چند ہی تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں جس کی پذیرائی تو ہوئی لیکن نقادوں کی صف میں انہیں جگہ نہیں دی گئی۔

راقم الحروف شمیم کی تمام مطبوعہ کتابوں پر تبصرہ کر چکا ہے، اور متعدد مضامین اور مختلف جگہ پر جو خاکے شائع ہوئے ہیں انہیں بھی پڑھ چکا ہے لیکن اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملا ہے اس کا اجمالی تذکرہ ضروری ہے۔ انہوں نے متعدد خاکے، انشائیہ کے انداز کے لکھے ہیں وہ ایسی تحریر ہے جو زبان و بیان پر حاکمانہ قدرت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ بات ان کے تحریر کردہ آٹھ خاکے پر صادق آتی ہے۔ ان اشخاص کے خاکوں کے ذریعہ انہوں نے اپنی یادوں کو اپنی شخصیت کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اور جن کو اپنے خاکے کا موضوع بنایا ان کی بڑی غیر جانب داری سے مصوری کی ہے۔ معیار میں مجتبیٰ حسین کے چند کامیاب خاکے سے کم نہیں۔

میری رائے ہے کہ اگر شمیم کے خاکوں کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو ان کی پہچان بھی معتبر انشائیہ / خاکہ نگاروں میں ہو جائے گی۔

زیر نظر کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ انوری فرمان کے ''حرف آغاز'' کے بعد عبدالقیوم ابدالی کا پیش لفظ، اور ظہیر غازی کا تعارفی مقالہ ہے۔ سید احمد شمیم کا مختصر تعارف اور پھر ۹۶ صفحات پر سید احمد شمیم۔ آئینہ در آئینہ کے نام سید احمد شمیم کی تقریباً تمام تحریروں پر تنقید و تبصرہ' اور آخر میں ۶۱ صفحات پر غزلیں اور نظمیں ہیں۔

یہ کتاب شمیم فہمی پر ایک نادر کتاب ہے اور میرا مشورہ ہے کہ کالج کے اردو اساتذہ، محققین اور طلبا کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔ کتاب کی کتابت وطباعت بھی کافی خوبصورت ہے۔

ساون میں دھوپ کا خالق: ودیا ساگر آنند، مرتب: سید معراج جامی، صفحات: 304، سائز: ڈیمائی، قیمت 300 روپے، ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ودیا ساگر آنند ہفت رنگ شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ فلسفی ہیں، دانشور ہیں، قانون داں ہیں، مؤرخ ہیں، صحافی ہیں، ادیب ہیں اور شاعر ہیں۔

''ساون میں دھوپ'' ان کا نیا مجموعہ کلام ہے جس میں غزلیں، نظمیں، رباعیات، قطعات اور تضمین شامل ہیں۔ اس مجموعہ پر مشاہیر ادب نے اپنی رائے دیتے وقت ان کی شاعری کو آنکا پرکھا ہے۔ ''ساون میں

دھوپ'' پر مضامین لکھنے والوں میں ویریندر شرما، ششی بھوشن، خاور امروہوی، یونس حسین، گلشن کھنہ، خالد یوسف، مظفر حسن عالی، رشید احمد جالندھری، رؤف خیر، ساحر شیوی، اکبر حیدر آبادی، امین جالندھری، بانو ارشد، فیاض عادل فاروقی، ممتاز رفیق، عطیہ خان، صفیہ صدیقی، اسحاق ساجد، ارشد علی خان، مظفر صدیقی، غفور شاہ قاسم، حلیم شرر، عقیل دانش، حسین انور صدیقی، فہیم بسمل شاہجہان پوری، عبید حاصل، شکیل جے پوری، احتشام اختر، امجد مرزا امجد، نذیر فتح پوری، شاہین فصیح ربانی، میمونہ علی چوگلے، ذکیہ خلیل احمد، امام اعظم، پریتا پاچپئی، سلیم انصاری اور سعید رحمانی کے نام شامل ہیں۔ ودیا ساگر آنند کو منظوم خراج تحسین پیش کرنے والوں میں ساحر شیوی، کامل جنیٹوی، رفیق شاہین، طالب شملوی، ساغر وارثی، قیصر شکیلی، سعید رحمانی اور رضا رامپوری جیسے نئے پرانے شاعروں نے آسودگی کا احساس دلایا ہے۔ ان تمام تخلیقات کو سید معراج جامی جیسے کہنہ مشق شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی نے کتابی شکل دے کر تہہ داری اور استواری عطا کی ہے۔ ودیا ساگر آنند کی شاعری میں اقدار حیات کی شگفتگی ہے، اعتماد اور عزم مصمم ہے، آگ اور روشنی کا فلسفہ ہے، مافی الضمیر کا اظہار معنویت ہے، جوش، جذبہ اور والہانہ پن ہے، تہذیبی اور سماجی شعور ہے، عہد کے رویوں کی ترجمانی ہے، ہیئت، اسلوب، آہنگ اور زبان و بیان کے نت نئے ذائقے ہیں، امید اور رجائیت کی پیغامبری ہے، تعصب، گروہ بندی، فتنہ وفساد، بغض وعناد اور دوسرے منفی جذبوں کی شدید مذمت ہے، خودی اور خودداری کا درس ہے، طبقاتی ناہمواری اور سماجی تضادات کی جہتیں ہیں، فرد کی حقیقی شناخت اور پہچان کی علامتیں ہیں، آفاقی اور یونیورسل پیغام کا گہرا ادراک ہے، عشق ومحبت کے نت نئے شیڈز ہیں، زندگی سے پیار کرنے کی ہمک ہے، امن ومحبت اور آشتی کی فضا ہے، فکر کا اجلا پن اور تخیل کی وسعت ہے، ساتھ ہی اردو زبان اور اردو شاعری سے شیفتگی کا اظہار ہے، اور بقول ڈاکٹر خاور امروہوی ''ساون میں دھوپ'' کی شاعری میں درج ذیل محاسن کلام ہیں:

صنعت مطلع، صنعت حسن مطلع، ترافق، صنعت ردالعجز علی العروض، صنعت ردالعجز علی الحشو، صنعت تجنیس زائد و ناقص، صنعت تجنیس مزیل، صنعت طباق ایجابی، صنعت طباق سلبی، صنعت تجنیس مضارع، صنعت اشتقاق، صنعت تجنیس تکرار لفظی، صنعت تکرار معنوی، صنعت تلمیح، صنعت رعایت لفظی، صنعت محاورہ، صنعت تعلیق، صنعت تضمین، صنعت سہل ممتنع، صنعت کسر نفسی اور صنعت مقطع کے علاوہ صنعت سہ مصرعی، صنعت قطعہ، صنعت مسدس، صنعت مثمن، صنعت معشر اور صنعت رباعی۔

سولہ صفحے میں گلیز کاغذ پر رنگین تصاویر ہیں، کتاب بے حد خوبصورت شائع ہوئی ہے۔

''انشاء'' کا ''رومی نمبر'': ف س اعجاز، صفحات: 160۔ سائز: کراؤن۔ قیمت: ایک سو بیس روپے۔ ناشر: انشاء پبلی کیشنز، 258 ذکریا اسٹریٹ، کولکاتا۔ 700073۔ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

عالم ہست و بود کے بہت سارے اسرار و معارف کو آٹھ سو سال پہلے پیش کرنے والے صوفی شاعر جلال الدین رومی کے عارف وحدانیت حق اور تفہیم بندگی و خداوندی کو تسلیم کرتے ہوئے یونیسکو نے 2007ء کو رومی کا بین الاقوامی سال قرار دیتے ہوئے یہ اعتراف کیا تھا کہ رومی اسلامی تہذیب کے عظیم مفکرین اور اسکالروں میں

سے ایک ہیں۔ افغانستان، اسلامی جمہوریہ ایران اور ترکی کے عوام ان کو اپنا شاعر مانتے ہیں لیکن رومی پوری بنی نوع انسان کے شاعر ہیں۔

ف س اعجاز قلم کے دھنی ہیں۔ شاعر، تنقید نگار، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ چوبیس سال سے کلکتہ سے ''انشاء'' نکال رہے ہیں اور پوری اردو دنیا میں عمدہ نگارشات کی وجہ سے توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ''انشاء'' کے سترہ خصوصی شمارے قبل شائع کر چکے ہیں۔ اٹھارہواں خصوصی نمبر 2008ء کا کارنامہ ہے۔ اس میں رومی پر ف س اعجاز، ظفر احمد نظامی، ستیہ پال آنند، ع واحد، سجاد حسین، عقیل ہاشمی، محمد نسیم الدین فریس، کے کے کھلر، تقی عابدی، شکیل الرحمٰن اور صابر ارشاد عثمانی کے بے حد اہم مضامین اور علقمہ شبلی کی ایک غزل کی شمولیت سے رومی شناسی میں مدد ملتی ہے۔ سجاد حسین کے پانچ مضامین اس نمبر میں شامل ہیں۔ 30 ستمبر 1207ء کو بلخ میں پیدا ہونے والے جلال الدین رومی کے بارے میں ظفر احمد نظامی تفصیل بتاتے ہیں کہ وہ آئینۂ خانوادۂ نور تھے۔ سلطان العارفین اور خاتم الکاملین کے القاب سے مشہور تھے۔ دنیا کے علم و فضل میں درخشندہ تھے، آفتاب عالم تاب کی طرح تابند تھے۔ سرور کائناتؐ کے ذریعہ خواب میں سلطان العلماء کے لقب سے سرفراز ہوئے جس سے وہ عمر بھر صاحب عز و ناز ہوئے۔ ان کے دادا جلال الدین حسین اور دادی ملکۂ جہان تھیں جو زمین پر رہتے ہوئے آسمان تھیں۔ والد (محمد بہاء الدین) کی طرف سے ان کا نسب خلیفۂ اول صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے اور والدہ کی جانب سے سلسلہ خلیفہ چہارم حضرت علیؓ سے پھول بن کر کھلتا ہے۔

آج رومی چار دانگ عالم میں مشہور ہیں۔ مغربی ممالک میں ان پر بہت کام ہو رہا ہے، بقول ف س اعجاز ایک امریکی سرجن ماہر رومی نویت ارگن نے گزشتہ پچاس برسوں سے خود کو مطالعۂ رومی کے لئے وقف کر رکھا ہے اور ان کے پورے کلام کا ''دیوان کبیر'' کے عنوان سے بائیس جلدوں میں انگریزی میں ترجمہ شائع کروایا ہے۔.................. مغرب میں رومی کو مقبولیت اچانک حاصل ہوئی اور اس میں روحانی کشف سے بڑھ کر ایک نوع کے فروغ تجارت کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ امریکہ میں اس وقت رومی پر ہزاروں ویب سائٹ اور ویڈیوز موجود ہیں۔ رومی کی شاعری کا جدید آسان انگریزی بول چال کی زبان میں ایک پنجابی نژاد یوگا گرو اور اوسط درجہ ناول نگار دیپک چوپڑہ نے ترجمہ کر کے ہالی ووڈ کے چوٹی کے موسیقاروں اور گلوکاروں کے تعاون سے ''گفٹ آف لو'' (Gift of Love) کے نام سے ایک CD پیش کی ہے جس کی لاکھوں لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اس سی ڈی میں کئی ماہرین کے علاوہ صف اول کے موسیقار فلپ گلاس اور گلوکارہ میڈونا کا تعاون بھی شامل ہے۔

رومی کا جادو آج اکیسویں صدی میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ''انشاء'' کے اس رومی نمبر میں بہت ساری نئی جانکاری ہے اور اس میں شامل مضامین سے رومی پرت در پرت منکشف ہوتے ہیں۔ با تصویر اس نمبر سے بار بار استفادہ کیا جائے گا۔

کاغذ پہ صحرا .... سہیل اختر، صفحات: 278۔ سائز: ڈیمائی۔ قیمت 250 روپے۔ IDco, IDco, JM(D) ٹاور، جن پتھ، بھونیشور۔ 751022 (اڑیسہ)۔ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

سہیل اختر تازہ کار غزل گو ہیں۔ ایک سو چالیس غزلوں کے اس مجموعہ کو پڑھ کر مجرد تصورات، تفلسف کی لہروں، عقلیت کے سرمایہ اور اسلوب کی چمک سے آشنائی ہوتی ہے۔ ان کے یہاں وسیع النظری ہے۔ گہرائی ہے، ترکیبی ہیئت ہے، اظہار کی ساختیں ہیں، تجسس کی لچک ہے اور عصر کے تناظر میں غور وفکر کی ترجمانی ہے۔ محسوسات وجذبات کی کیفیت کی ہمہ پہلوئی بھی ان کی غزلوں کی صفت ہے:

کیا کبھی شب کو دن بنا پایا؟
آدمی کو ہے اختیار بھی کچھ

سنا ہے یار لوگ اب سوئیاں جیبوں میں رکھتے ہیں
انہیں لگتا ہے ہمت میری غبارے میں رہتی ہے

جو تجھ کو سوچوں تو روشن نئے نئے امکاں
جو تجھ کو لکھوں تو کاغذ بھی جیسے پھیلتا ہے

یہ دفتروں سے لوٹتی تھکی اداس لڑکیاں
بغیر آرزو کے جی رہی ہے زندگی عجب

شہر کرفیوں میں ہے سنسان گلی چپ ہیں شجر
کانپ جاتا ہوں جو پتا بھی کھڑکتا ہے کوئی

رومانی عناصر کے اسلوب میں بھی سہیل اختر کے یہاں تخلیقیت ہے، زبان کے تخلیقی حسن سے جمالیاتی کیفیت کے کوندے لپکانے کا ہنر انہیں آتا ہے:

وہ مثل آتش ومہر ومہ وستارہ سہی
جو مجھ میں پیکر انور ہے وہ ہے اور کوئی

یہ کپکپاہٹ بھی سسکیوں کی تمہاری اب تو
گراں ہوئی ہے تنی ہوئی میری خامشی پر

شوق آنکھوں کی انہی بھول بھلیوں میں ہے گم
شاید اب دل کی طرف کوئی سڑک جاتی نہیں

اپنے دور کی روایت اور سماجی منظرنامے پر سہیل اختر بھرپور نگاہ ڈالتے ہیں:

ہر ایک ذہن ہر نظر پہ چینلوں کا ہے اثر
اب اختلاف رائے کی زمین بھی سمٹ گئی

ایک جیسی ہیں یہ خوں ریزی کی تفصیلیں تمام
اب پڑھا کرتے ہیں ہم سرخیِ اخبار فقط

سہیل اختر کی غزلوں میں کئی زاویے ہیں اور کئی طرح کے ذائقے بھی ہیں۔ کتاب بے حد خوبصورت چھپی ہے۔ کوثر مظہری اور عبدالاحد ساز نے پیش لفظ لکھا ہے۔ فلیپ پر سعید رحمانی کی رائے ہے۔

نام کتاب: شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری: مصنف: محمد منصور عالم۔ صفحات: ۴۵۵۔ قیمت: ۳۷۰ روپے۔ رابطہ: پروفیسر، شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)۔ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

محمد منصور عالم تنقید اور تحقیق کی گہرائی پر نظر رکھنے والے محقق اور ناقد ہیں۔ ''بہار میں تذکرہ نگاری'' امعان'' ''تمیز تحریر'' ''نخہائے تحقیق'' ''حریر دو رنگ'' اور ''فروغ اقبال'' کے بعد نئی تنقیدی کتاب ''شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری'' دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ محمد منصور عالم نے فاروقی کی نبض پر انگلی رکھی ہے اور نقد فن پر حکیمانہ نظر ڈالی ہے۔ تنقید کے بارے میں ان کا نظریہ ہے:

''تنقید ایک سنجیدہ محاکے کا سنجیدہ عمل ہے۔ اگر ہمیں تنقید کے ذریعے کوئی علمی اور ثقافتی کام کرنا ہے تو عقیدت و محبت کی وہ آنکھ کھولنی ہوگی جو اپنے محسن کی ادبی کوتاہیوں کو دیکھنے کے وقت بند ہو جاتی ہے اور یہ ذرا سخت مرحلہ ہے۔''

فاروقی کی تنقید پر ان کی بند اور کھلی آنکھوں نے کئی دشواریوں سے گذر کر موازنہ، تجزیہ، تمیز اور فیصلہ کیا ہے۔ ''اثبات ونفی'' ''افسانے کی حمایت میں'' ''تعبیر کی شرح'' ''تنقیدی افکار'' جدید شعری جمالیات'' خدائے سخن میر کہ غالب؟'' داستان امیر حمزہ کا مطالعہ'' ''شعر غیر شعر اور نثر'' ''شعریات اور نئی شعریات'' فاروقی کے تبصرے'' ''نظم کیا ہے؟'' اور ''انداز گفتگو کیا ہے؟'' جیسی کتابوں اور بعض مضامین پر تنقید کرتے ہوئے محمد منصور عالم نے کلیم الدین احمد سے موازنہ کیا ہے اور اپنے تنقیدی خیالات کی صداقت اور ابدیت کو بروئے کار لاکر نکتہ رسی کی ہے۔ مثلاً حالی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' پر فاروقی کے نظریے اور کلیم الدین احمد پر گرفت کو محمد منصور عالم نے اس طرح تنقیدی بصیرت عطا کیا ہے:

''لیکن جب میں نے حالی اور کلیم الدین احمد کے بیانوں کو ان کی کتابوں میں دیکھا تو یہ پایا کہ فاروقی کی گرفت ڈھیلی ہے۔ متعلقہ مقام پر مضمون آفرینی کی نفی حالی کا مقصد نہیں۔ یہ فاروقی کی اپنی اپج ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ کلیم الدین احمد نے حالی کی تعریف جوش کو ''آمد'' کے مترادف سمجھا ہے۔ یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ انہوں نے جوش کو ''بے ساختگی'' کے مترادف سمجھا ہے؟''

دوسری مثال فراق گورکھپوری کے سلسلے میں دیکھئے۔ فاروقی کی تنقید پر محمد منصور عالم کی غیر معمولی تنقید اس طرح ہے:

''فاروقی نے فراق پر متعدد بار لکھا ہے۔ ابتدا میں وہ فراق کی شاعری کے مداح تھے۔ ان کی شاعری میں ''نیا آہنگ'' ''تکنیکی صلاحیت'' ہوش مندی'' اور ''تفکر'' کے عناصر پاتے تھے اور سمجھتے تھے کم۔ ''فراق صاحب نے اپنی شاعری کا بڑا حصہ معنی آفرینی اور پیکر تراشی کی نذر کیا ہے (بحوالہ انداز گفتگو کیا ہے، ص:۳۹) لیکن بعد میں انکا خیال بدل گیا۔ اب وہ فراق کو ''بڑا شاعر'' نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ ''وہ بڑے شاعر نہ تھے۔'' (انداز گفتگو کیا ہے۔ ص:۴۰) بڑے شاعر نہ سہی، فراق اہم شاعر یقیناً ہیں۔ کہتے ہیں:

> ''فراق صاحب نے ۱۹۵۰ء کے آس پاس نمایاں ہونے والی نسل کو متاثر ضرور کیا اور اس لئے وہ اہم شاعر یقیناً ہیں۔'' (ایضاً ص:۴۰)

لیکن کچھ ہی دیر کے بعد فراق معمولی شاعر ہو گئے:

> ''فراق جیسا معمولی شاعر ہمارے نقادوں کے لئے Challenge بن گیا۔'' (ایضاً ص:۷۷)

اب ادبی تنقید کے نئے قاری کے سامنے یہ سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ ''بڑا شاعر'' ''اہم شاعر'' اور ''معمولی شاعر'' کے اول، دوم اور سوم، تین درجوں میں فراق کس درجے کے شاعر ہیں؟''

ڈاکٹر محمد منصور عالم نے فاروقی کی تنقید کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا ہے کہ پوری کتاب ناول کا مزہ دیتی ہے، بت شکن اس کتاب میں بدنیتی نہیں ہے بلکہ صحیح تنقید کا محاکمہ ہے۔ منصور عالم نے ڈوب کر بلکہ غوطہ لگا کر فاروقی کی تنقید کو جس طرح پانی کیا ہے اس کی مثال اردو میں نہیں ملے گی۔ اس کتاب سے محمد منصور عالم بحیثیت ناقد منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہیں۔ کتاب آفسیٹ پر خوبصورت چھپی ہے۔

نام کتاب: تفہیم و تنقید، مصنف: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن۔ صفحات: ۱۴۴۔ قیمت سو روپے۔

رابطہ: حیدر منزل، روڈ نمبر ۲۔ نیو کریم گنج، گیا (بہار)۔ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

تین تحقیقی و تنقیدی کتابوں کے بعد تنقید کی چوتھی پیش کش ''تفہیم و تنقید'' اس لئے اہم ہے کہ اس میں ادبی اقدار و معیار کا تعین بھرپور طور پر ملتا ہے اور ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن کے نظریات نقد کی نوعیت متوجہ کرتی ہے۔ غیر معمولی ذہانت و بصیرت سے لکھے گئے درج ذیل مضامین اس کتاب میں شامل ہیں:

''کلیم عاجز کی شاعری ایک نیا انداز نظر'' ''ایک شاعر...... ظہیر صدیقی'' ''اقبال کی شاعری میں طنز کے عناصر'' شاہد جمیل کی شاعری'' خوابوں کے ہمسائے'' کی روشنی میں'' ''گل لاجورد...... ایک مطالعہ'' ''مغلطیہائے مضامین'' مظہر امام...... ایک تخلیقی ناقد'' ''پڑاؤ: جواب کا انتظار کرتا ہوا ایک سوال'' الیاس احمد گدی: ایک معتبر افسانہ نگار'' وحید الدین خاں اور پیغمبر انقلاب...... دانشورانہ افکار کا جائزہ'' آثار اثر: ایک جائزہ'' جگر مراد آبادی کی غزل گوئی: ایک تعارفی جائزہ'' مناظر عاشق ہرگانوی کا تنقیدی رویہ اور تناسب'' سید احمد قادری: ایک ہمہ جہت فنکار''

شاخیں: ایک تعارف'' اردو داستانوں میں ویلین کا تصور: ایک تعارفی مطالعہ'' اور'' خط خیر: ایک طائرانہ نظر۔''

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن کی اپنی فکر اور اپنی نظر ہے اسی لئے وہ دوسروں سے الگ معلوم ہوتے ہیں۔ کلیم عاجز کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے ان کے لہجے کا تیکھاپن دیکھئے:

''افسوس یہ ہے کہ ان کی اپنی انفرادی خصوصیات اور انفرادیت کی جانب توجہ کم دی گئی اور پیرو میر کی حیثیت سے انہیں زیادہ دیکھا گیا۔ اس تنقیدی روش نے کلیم عاجز کی شاعری اور ان کی شخصیت کی افہام وتفہیم میں یک رخاپن کو جگہ دی گئی۔ پیرو میر کہہ کر بظاہر ان کا قد بڑھانے کی کوشش ہوئی لیکن بباطن اس سے ان کے بونے پن کو محسوس کرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں میر کی پرچھائیں سمجھا جانے لگا۔ ان کی اپنی شخصیت اور فن گم ہو گیا۔''

اقبال پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں اور ہر ناقد نے ان کے کلام کو اپنے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن نے گہرائی اور گیرائی سے اقبال کو پرکھا اور جانچا ہے اور صداقت تک پہنچنے کی کوشش کی ہے:

''اقبال ایک لحاظ سے اردو کا مظلوم ترین شاعر بھی ہے کہ ابھی تک اردو دانوں میں اقبال کے مقام کے تعین کے سلسلے میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔ اور اس کی شاعری ''شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا'' کی مصداق بن گئی ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو ایک گروہ ہرگز یہ اعلان نہ کرتا کہ اقبال دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اور دوسرا گروہ یہ کہتا کبھی نظر نہیں آتا کہ اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ اب سوچ کے ان دو کناروں کو ملانے اور اس پر پل بنانے کا کام کون انجام دے؟۔''

وحید الدین خاں کی کتاب ''پیغمبر انقلاب'' کا دانشورانہ اور ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن لکھتے ہیں:

''پیغمبر انقلاب سیرت کی کتاب ہے۔ لیکن مروجہ سیرت کی کتابوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں نہ جذباتی عقیدت ملتی ہے اور نہ ہی کھوکھلی مذہب پرستی بلکہ انتہائی سائنٹفک ڈھنگ سے مدلل اور منطقی پیرائے میں سیرۃ رسول کا تاریخی اور علمی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔''

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن کی نکتہ سنجی اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی قوت فیصلہ اور جرأت فیصلہ کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔ ان کی ادب شناسی، افہام وتفہیم اور غیر معمولی تجزیاتی صلاحیت کی آئینہ دار ہے۔!

نام کتاب: شاعر کوکن: ارباب علم وفن کی نظر میں: سلطانہ مہر۔ صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

برطانیہ میں رہ کر سلطانہ مہر اردو کی جیسی اور جتنی خدمت کر رہی ہیں اس کا اعتراف ہوتا رہا ہے، ان کی

مرتب کی ہوئی تذکرے کی کتابیں بیحد مقبول ہوئی ہیں۔ اب انہوں نے اردو کے ایک سپاہی ساحر شیوی پر کتاب ترتیب دی ہے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۶ء میں پیدا ہونے والے ساحر شیوی کی زندگی کا بیشتر حصہ نیروبی (زوبقہ) میں گذرا۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۹۳ء تک۔ ۱۹۹۴ء میں وہ برطانیہ میں منتقل ہوگئے۔ ہر دو جگہ شاعر اور صحافی کی حیثیت سے فعال رہ کر پوری اردو دنیا کو اپنی طرف انہوں نے متوجہ کیا ہے۔ اسی لئے انہیں پذیرائی ملتی رہی ہے۔ درجنوں اداروں سے بحیثیت صدر، سکریٹری اور رکن وابستگی رہی ہے۔ ایک درجن سے زیادہ ایوارڈ مل چکے ہیں۔ کئی ممالک میں بحیثیت شاعر مدعو کئے گئے ہیں۔ شاعری کے تیرہ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ نثر میں تنقید، افسانہ اور ترتیب کی نصف درجن کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ ان کے لکھنے پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔ خود ان پر آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ چار پانچ رسائل سے ان کی وابستگی بحیثیت مدیر قائم ہے۔ ایسی خوبیوں کے مالک ساحر شیوی کے فکر وفن پر مشاہیر اردو کے چند مضامین سلطانہ مہر نے اپنی پسند سے ترتیب دیکر فنی اور فکری مقصد کی تکمیل کی ہے۔ اس کتاب میں بالترتیب " وزیری پانی پتی، بخش مائل پوری، امین جالندھری، مظفر حنفی، عقیل دانش، نارنگ ساقی، مناظر عاشق ہرگانوی، خالد یوسف، مختار الدین احمد، تسلیم الٰہی زلفی، اسحاق ساجد، فیاض عادل فاروقی، امام اعظم، صابر ارشاد عثمانی، امجد مرزا امجد، شفیق الدین شارق، صفات علوی، حفیظ جوہر، سید سرور ظہیر غزالی، عبدالقوی ضیا، پرم جیت کھنہ، گلشن کھنہ، رفیق شاہین، اکبر حیدر آبادی، عشرت رومانی، ظفر مراد آبادی، شاہد حنائی، رشیدہ قاضی، انور شمیم انور، مجاہد فراز، ستیہ پال آنند، فراز حامدی، منور احمد کنڈے اور سلطانہ مہر کے مضامین، سات کتابوں پر ۵۸ مشاہیر ادب کی آراء اور تیرہ شاعروں کے منظوم تحسین نامے شامل ہیں جن سے ساحر شیوی کے انداز بیان ترسیل، جز وتخلیق اور شخصیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ ان کے یہاں جو خود اعتمادی ہے، بلند حوصلگی ہے، توانائی کی جلوہ ریزی ہے، متوازن تخلیقی رویہ ہے، فکر کی تابانیاں ہیں اور فن کی رعنائیاں ہیں، ان سب کے برتاؤ کی نوید اس کتاب سے ملتی ہے۔ سلطانہ مہر کی ترتیب میں رنگ و بو ہے، امنگ و ترنگ ہے، جمالیاتی حسن ہے، شائستگی کا نکھار پن ہے اور جہت در جہت گرمی وحرارت ہے۔ کتاب بے حد خوبصورت شائع ہوئی ہے۔

نام کتاب: یہ کیا جگہ ہے۔ لیٰسین احمد۔ صفحات: ۱۵۶۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔ رابطہ: ۱۵۹/۲-۳-۱۷، واحد کالونی، انڈیا فنکشن ہال لین، یاقوت پورہ، حیدر آباد-۵۰۰۰۲۳۔ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

زندگی اپنے وجود کے اثبات کے لئے مختلف صورتوں میں الگ الگ راستے تلاش کرتی ہے۔ لیٰسین احمد کے افسانے بھی میڈیم ہیں۔ دراصل انسان کا ہر عمل تنہا ذات کے ساتھ اجتماعی کیفیت کا نام ہے۔ لیٰسین احمد فکری سطح پر موجودات کا عرفان بخشتے ہیں اور تخلیقی سطح پر اسے حواس کی لذتوں اور احساس کی کیفیتوں سے امتزاج دیتے ہوئے نئے ذہنی پیکر تراشتے ہیں۔ ان کے یہاں اجنبیت، مغائرت، دوری، بیگانگی، لاتعلقی، بے طرفی، کنارہ گیری، لااعتنائی، بے حاصلی، نارسائی، غیر معنی داری اور عدم وابستگی کی کیفیت ضرور ملتی ہے لیکن اثبات ذات کے افہام وتفہیم بھی ملتے ہیں۔ معاشرے کے اندھیروں کی روشن کلید بھی ملتی ہے اور تہذیبی روایات، سیاسی تشکیلات، اقتصادی مظاہر اور اجتماعی کشید کا ارتباط بھی ملتا ہے۔ دو ایک مثال ملاحظہ کیجئے:

''اس کے ہم پیشہ بھائی نے اس سے پوچھا: ''تم بتاؤ، تمہیں کیا کیا ملا؟''
وہ خوش ہو کر بولا: ''میں جہاں گیا تھا وہاں انسان نہیں خوفناک جانور رہتے ہیں۔ لیکن میں خوش ہوں اس لئے کہ اس بستی سے زندہ واپس آ گیا۔'' (یہ کیا جگہ ہے؟)

''اس کی لاش ہم کو ساحل پر ملی تھی۔ ٹکڑے ٹکڑوں کی شکل میں۔'' بڑے ابا بتا رہے تھے ''میڈیکل رپورٹ کے مطابق پہلے اس کو ریپ کیا گیا تھا اور پھر ٹکڑے ٹکڑے۔''

''میری کنپٹیوں میں دھماکے ہونے لگے۔ مجھ کو یوں محسوس ہوا جیسے میرا سر پھٹ جائے گا۔ ہم پر سکتہ طاری تھا۔ بڑی مشکل سے ڈیڈی نے پوچھا ''اس کو کس نے قتل کیا؟''۔ ''اسی اسرائیلی نے جو اس سے محبت کرنے کا دم بھرتا تھا۔ جو اس کی خاطر اسلام قبول کرنا چاہتا تھا۔''

میرا سر چکرانے لگا۔ پہلی بار......... زندگی میں پہلی بار میں بڑے ابا کے سامنے بلند آواز میں چلایا: ''اور آپ سر جھکا کر وطن چلے آئے۔ کیا آپ کو وہاں پتھر بھی نہیں مل سکے؟''۔ (سفر رایگاں)

''اس نے تحمل سے مسز ساہنی کی بات سنی اور پھر اپنی بیوی کے متعلق پوچھا تو دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ اس کو اپنی بات دہرانی پڑی تب وہ بولیں ''لنچ کے بعد وہ منیجر سے لفٹ مانگ رہی تھیں۔ بھائی صاحب کیا آپ کو نہیں معلوم کہ منیجر آپ کی کالونی کی طرف ہی رہتا ہے۔''

اس کی سانسیں سینے میں رک سی گئیں اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے تباہ کن سیلاب کا پانی فلیٹ میں گھس گیا ہے۔'' (بے اعتبار موسم)

اپنے ماحول کی نامساعدت کو بیان کرتے وقت یٰسین احمد نفسیات سے کام لیتے ہیں اور حقیقت کی تلخی کو زبان عطا کرتے ہیں۔ اس مجموعہ میں درج ذیل ۲۹ افسانے شامل ہیں: ''روپیہ، ڈالر'' یہ کیا جگہ ہے؟'' سورج نہیں ڈوبا'' سفر رایگاں'' سوکھی کونپل'' بچہ فارم'' کھلونوں کی دکان'' دل بدحواس'' ہم زبان'' ہیموگلوبن'' دوسری شفٹ'' ڈائیلسس'' آسان نہیں ہے موت'' میرے پاپا'' اسٹینٹ'' برادران یوسف'' گل جو مرجھاتے نہیں'' سبیل'' یہ کون مرا؟'' گلاب میں اُگی ناگ پھنی'' بے اعتبار موسم'' انکھوئے'' جڑیں کٹنے کے بعد'' مس آف اے بیچ'' شادیٔ مرگ'' تجوری میں بند لکشمی'' تصویر کے پردے میں'' اعمال نامہ'' اور'' دعا''۔ یٰسین احمد تخلیقی تابش اور فنی تکمیل کے ساتھ مشاہدہ اور تجربہ کی مختلف جہتوں کو شعور بخشتے ہیں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے کتاب خوبصورت شائع کی ہے۔

نام کتاب: سہرے ہی سہرے، پروفیسر طلحہ رضوی برق، ترتیب: ڈاکٹر قدسیہ فاطمہ ضیاء، صفحات: ۶۴، سائز ڈیمائی، قیمت: ۵۰ روپے، علامہ قتیل اورینٹل لائبریری، شاہ ٹولی، دانا پور کینٹ، پٹنہ۔ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

شادی کے موقع پر سہرا اور رخصتی کے کتابچے عام طور پر شائع ہوتے ہیں لیکن مجموعہ کی شکل سہرے کی اہمیت کو اجاگر کرنے والی کتابیں نہیں ہیں۔ حالیہ برسوں میں امان خاں دل کی ایک کتاب امریکہ سے چھپی تھی جس میں ان کے لکھے سہرے شامل ہیں اور اب ۶۴ صفحے کی مجلد کتاب طلحہ رضوی برق کی آئی ہے جسے ان کی صاحبزادی ڈاکٹر قدسیہ فاطمہ ضیاء نے مرتب کیا ہے۔ ایک عورت اور ایک مرد نکاح کے بعد ایک دوسرے کے ساتھی بنتے ہیں تو یہ اجتماع ساری کائنات کا سب سے انوکھا واقعہ ہوتا ہے۔ وسیع کائنات میں ان گنت چیزیں ہیں جو جوڑے کی صورت میں ہیں۔ کسی بھی دو چیز کے درمیان کامل مطابقت ہوتی ہے یہ عورت اور مرد میں بھی پائی جاتی ہے۔ جب ایک عورت اور ایک مرد جیون ساتھی بنتے ہیں تو شعوری منصوبے کے تحت ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ لطف و انبساط کے اس موقع پر تہنیت و مبارک باد سہرا اور رخصتی نامہ کے ذریعہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کی جڑیں روایتوں کی زمین میں پیوست ہیں جن کی آبیاری اکیسویں صدی میں بھی ہو رہی ہے۔ طلحہ رضوی برق کا شمار استاد شاعروں میں ہوتا ہے۔ تخلیقی بصیرت کے علاوہ زبان و بیان کی شگفتگی اور تازگی و نیرنگی سے وہ اپنے قلم کی جہات روشن کرتے ہیں۔ ان کی فکر سخن کی دسترس میں سہرے اور رخصتی بھی ہیں جن میں تخلیقی اپج، محاسبہ، معانقہ اور مشاہدہ کے عصری میلانات ملتے ہیں۔ کتاب ''سہرے ہی سہرے'' میں ۲۵ سہرے اور ۶ رخصتی شامل ہیں:

پابندیٔ محبت ہے رسم و راہ الفت — اے آرزوئے جاناں سہرے کی ہر لڑی ہے
اس انجمن میں دل کے غنچے چٹک رہے ہیں — ہے موسم بہاراں سہرے کی ہر لڑی ہے

کامیابی پاؤں چومے، شادکامی ہو نثار — رحمت حق سر بسر جلوہ فگن سہرے میں ہے
مجمع البحرین یارب موتیوں کی کان ہو — نازش ملت مرا، فخر وطن سہرے میں ہے

پروفیسر فاروق احمد صدیقی کی بیٹی کی شادی پر رخصتی نامہ سات بند میں ہے۔ پہلا بند ملاحظہ کیجئے:

مبارک صد مبارک ڈاکٹر فاروق صدیقی — کہ تم سے ہو رہی ہے آج ادا وہ سنت نبوی
بشارت بخشش و انعام حق کی جس میں ہے مخفی — رسول اللہ بھی خوش اس سے ہیں اللہ کی مرضی
تمہاری لاڈلی، نازوں کی پالی یاسمین بیٹی — بنی دلہن جو سج دھج کے چلی دولہا کے گھر ڈولی

اس کتاب کی ترتیب کار قدسیہ فاطمہ ضیاء کی رخصتی پر دو تین اشعار دیکھئے:

قدسیہ میری بیٹی مری جان سے عزیز — اے باسلیقہ، رشک ہنر، نازش تمیز
مادر سے خانہ داری کا تونے پڑھا سبق — جد و پدر سے لی ادب و شعر کی رمق
جا ساتھ اپنے شوہر عالی وقار کے — ہاں! زیر سایہ رحمت پروردگار کے

بالیدہ و شستہ روشن امکانات سے بھرپور اس کتاب میں تراشیدہ نکتہ سنجی اور سادگی و پرکاری ہے۔ سرورق جاذب ہے۔

نام کتاب: نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، مصنف: ڈاکٹر سید آل ظفر، اشاعت: ۰۸ء، قیمت: ۲۵۰ روپے
صفحات: ۲۴۰، رابطہ: حسینا ہاؤس، زکریا کالونی محلہ سعد پورہ، امنا، مظفر پور، مبصر: ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، مظفر پور۔

نظیر اکبر آبادی اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل کے شاعر ہیں۔
نظیر اردو کے تمام شاعروں سے اس طرح مختلف ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری کے موضوعات اپنے گردو پیش سے منتخب کئے اور ان کی زبان بھی عوامی زبان سے بہت قریب ہے۔ ہمارے تمام کلاسیکی شعراء ولی سے غالب تک غزل کے شاعر ہیں جب کہ نظیر نظم کے شاعر ہیں۔ انہوں نے موضوعاتی نظمیں لکھیں اور ہندوستانی موسموں، تیوہاروں، میلوں ٹھیلوں اور عوامی رسم ورواج کو خصوصیت کے ساتھ اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ نظیر کو ہمارے تنقید نگاروں اور شاعروں نے کمتر درجے کا شاعر یا طبقۂ عوام کا شاعر قرار دیا اور بہت دنوں تک ان کی شاعرانہ خوبیوں سے منہ موڑتے رہے۔ سب سے پہلے پروفیسر عبدالغفور شہباز عظیم آبادی نے نظیر اکبر آبادی کی شخصیت اور شاعری کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا اور ایک بہت عمدہ کتاب ''زندگانی بے نظیر'' لکھی۔ ان کے بعد نیاز فتح پوری نے رسالہ نگار کا ''نظیر اکبر آبادی نمبر'' بہت اہتمام سے شائع کیا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے ''اردو شاعری پر ایک نظر'' حصہ اول کے ضمیمہ میں نظیر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا اور ان کی شاعری کا بہت عمدہ تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا۔ ہمارے بڑے تنقید نگاروں میں مجنوں گورکھپوری، اختر اورینوی، احتشام حسین وغیرہ نے نظیر کی شاعرانہ خوبیوں کو اجاگر کیا۔ اب نظیر کی شاعری اور ادبی خدمات کے موضوع پر اردو میں کئی درجن کتابیں ملتی ہیں۔

ڈاکٹر سید آل ظفر، شعبۂ اردو، بی۔ آر۔ اے۔ بہار یونیورسٹی، مظفر پور میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہیں۔ انہوں نے نظیر کی شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر کی تلاش کی ہے اور ان کی انسانی خدمات کو سراہا ہے۔
نظیر سے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے ان سے استفادہ بھی کیا ہے اور کلام نظیر کا تفصیل سے تجزیہ کر کے یہ دکھایا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے ہندوؤں کے تیوہاروں اور مہا پرشوں پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بڑی آمد ہے۔ اس طرح نظیر نے اپنی وسیع المشربی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ سکھوں کے گرونانک جی پر نظم لکھتے ہیں تو مسلمان صوفیوں اور فقیروں کی بھی دل کھول کر تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔ نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعہ سماج کے مختلف مذہبوں اور گروہوں کے درمیان یگانگت اور ہم آہنگی، بھائی چارہ اور میل جول کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر سید آل ظفر کا یہ تحقیقی مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے جس کے مطالعے سے نظیر اکبر آبادی کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں اور نظیر کی شاعری کے خصائص روشن ہوتے ہیں۔ مقالہ نگار نے نظیر کی شاعری سے مثالیں بہ کثرت پیش کی ہیں۔ اس طرح ان کی گفتگو مدلل ہوگئی ہے۔
یہ کتاب قومی یکجہتی کے مطالعے میں ممد ومعاون ثابت ہوگی اور نظیر کی شاعری کے مطالعے کو ایک بار پھر تازہ کرے گی۔ مجھے امید ہے کہ ان کی تنقیدی وتحقیقی کتاب علمی وادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

نام کتاب: سمندر سوچتا ہے، شاعر: رئیس الدین رئیس، صفحات: ۳۳۶، اشاعت: ۲۰۰۸ء،
رابطہ: دلی گیٹ، علیگڑھ۔ مبصر: رفیق شاہین، علی گڑھ۔

رئیس الدین رئیس جو وطن مالوف علی گڑھ کی مردخیز مٹی سے اگے شجر سایہ دار وثمر بار ہیں چار دہوں سے لگاتار کاروبار سخن میں ہمہ تن مشغول ومصروف ہیں۔ موصوف کا پہلا شعری مجموعہ ''آسمان حیران ہے'' ۱۹۹۵ء

میں اور شعری مجموعہ ثانی ''زمین خاموش ہے'' ۲۰۰۱ء میں منصۂ شہود پر جلوہ فگن ہو کر حلقہ اہل علم و دانش اور شائقین شعر و ادب سے بھرپور خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اور اب ۲۰۰۸ء میں ان کا تیسرا شعری مجموعہ جسے کلیات کا درجہ حاصل ہے بعنوان ''سمندر سوچتا ہے'' منظر عام پر نمودار ہو کر خوب خوب پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔

رئیس الدین رئیس نے یوں تو حمد و نعت آزاد نظمیں اور رباعیاں بھی تخلیق کی ہیں لیکن غزل سے انہیں والہانہ عشق ہے اور یہ ان کی ترجیحات میں شامل ہونے کے سبب ان کا سرمایہ افتخار و امتیاز بھی ہے۔ رئیس کے لئے غزل محض مشغلہ نہیں بلکہ ریاضت بھی ہے اور عبادت بھی انہوں نے اپنی روز و شبانہ کی ریاضت و مزاولت اور مشق و ممارست کی کڑی منزلوں سے گذر کر اور اس بت صد طراز کی مشاطہ گری اور گیسو آرائی کر کے اس ماہ لقا اور بت طناز کو اپنے شیشے میں اچھی طرح اتار لیا ہے اور اب یہی غزل مسخر ہو کر نہ صرف ان کے اشاروں پر رقص کناں ہے بلکہ ان کی شہرت و مقبولیت کا سبب بھی بن گئی ہے۔ رئیس ایک باشعور پختہ گو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہیں اپنی خوش بختی پر فخر و ناز ہے کہ آج وہ اپنی عصری حسیات اور ارضی حقیقت پر مبنی ترفع و متنوع اور جدید و منفرد انداز کی شاعری کے تخلیق کار ہونے کے باعث معاصر شعرا کی صف اول میں جگہ پا چکے ہیں۔ بطرز رنگ و آہنگ اور مزاج و اسلوب ہم انہیں دور لاتحریک کا مابعد جدید شاعر قرار دینے میں خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ ان کی زبان و بیان اگرچہ اصطلاحات و علامات تشبیہات و استعارات اور کنایات و اشارات کی مرہون منت ہے اس کے باوجود خوشگوار حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ان کے اشعار معنی و مفاہیم کی ادائیگی اور ترسیل و ابلاغ کے لئے راہ کا روڑہ یا رخنہ نہیں بنتے ہیں۔ ''سمندر سوچتا ہے'' کا سنجیدہ مطالعہ ہمیں اچھی طرح باور کرا دیتا ہے کہ ان کی شاعری کو تجریدیت تکثیریت رجعت انفعالیت قنوطیت ابہامیت مہملیت اور مجہولیت جیسی کمیوں اور کوتاہیوں سے دور کا علاقہ بھی نہیں ہے۔ ان کی شاعرانہ اور فنکارانہ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ بیشتر اوقات عام اور واستعارات کی زبان میں بات کرتے ہیں اور ان کی بات جدت پسند قارئین کی سمجھ میں آتی ہے اتنی ہی یہ روایت پسندوں کو بھی بآسانی ذہن نشیں ہو جاتی ہے۔

رئیس الدین رئیس کی ایک نمایاں صفت یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری کی بنیاد کا پتھر اور اس سمت میں ان کا پہلا قدم ان کی خود شناسی ہے۔ وہ اپنی ذات کے بحر زخار میں شناوری کے دوران ہی کائنات کے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔ اور اس طرح ان کا ذاتی غم کائنات کے غموں سے ہم آہنگ ہو کر ان کی آپ بیتی کو جگ بیتی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ رئیس کی شاعری رومان کی تمثیلی و فرضی حکایتوں الف لیلوی شہزادے شہزادیوں کی داستانوں اور خیالی جنتوں سے ماورا ہمارے دور جاریہ اور اس زمانے کی شاعری ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ارضیت اور زمینی صداقت کی شاعری ہے جو معاصر مسائل و مشکلات اور سنگینی حالات کے آگے خود سپردگی یا مغروریت اختیار کرنے کے بجائے منفی حالات و حقائق کے خلاف سینہ سپر ہو جاتی ہے اور مسائل سے نظریں چرانا گناہ سمجھتی ہے۔ شاعری کے لئے کچھ موضوعات و مضامین تو انہی خارجی سطح پر عصری اخبارات حالیہ رجحانات و تغیرات اور حادثات و واقعات سے مل جاتے ہیں اور کچھ موضوعات داخلی سطح پر از خود ان کے اپنے جذبات و احساسات اور نجی تجربات ہوتے ہیں۔ رئیس کے موضوع معمہ نہیں ہوتے۔ وہ آسانی

سے پہچان لئے جاتے ہیں اورانہیں عنوان دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا ہے۔ان کی شاعری کے آئینے میں معاصر زندگی کی جھلک بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔اقدار اعلیٰ کا زوال۔تہذیبی ورثے کی پامالی انسان کی انسان سے بے زاری زرگری کے لئے ضمیر فروشی حرص وہوس فحاشیت وعریانیت عدم مساوات عدم انصاف عدم تعاون شعبہ شعبہ بدعنوانیاں ورشوت ستانیاں دہشت گردی قتل وغارت گری مسجد مندر کی سیاست ہندو مسلم منافرت اورنسل کشی جیسے دردناک واقعات جو ہمارے ملک ومعاشرہ کی قسمت بن چکے ہیں۔رئیس الدین رئیس نے معاشرے کے اسی منظرنامے کواپنے شعری نگارخانے کی زینت بنالیا ہے۔متذکرہ حالات کے سیاق وسباق میں ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے زمیں بے اذاں سرخ آسماں کیسے ہوا
شہر کے ہر شخص کا چہرہ دھواں کیسے ہوا

اچھلے سر معصوموں کے بھی نیزوں پر
شہر کا موسم کیوں اتنا سفاک ہوا

زرد ومدقوق بچے پھر رہے ہیں ہر گلی
اور دیواروں پہ لکھی ہیں دعائیں اے خدا

بسے ہو شہر میں تو اب اداکاری بھی آئے گی
یقیں رکھو پھر اس کے ساتھ عیاری بھی آئے گی

رئیس معنی کی مطابقت سے لفظوں کے انتخاب میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔انہیں لفظی نظام اوراس کے دروسے بھی خاصی آگاہی اورانہیں بجاطور پر برتنے کی بھی قدرت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ مشکل سے مشکل خیال کوشعر میں ڈھالناان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے،دیکھئے انہوں نے اپنے داخلی جذبات کی کیا خوب عکاسی کی ہے:

ورق ورق تجھے تحریر کرتا رہتا ہوں
میں زندگی تری تشہیر کرتا رہتا ہوں
بہت عزیز ہے مجھ کو مسافتوں کی تھکن
سفر کو پاؤں کی زنجیر کرتا رہتا ہوں

رئیس الدین رئیسؔ ایک ہمہ رنگ وہمہ گیراور کثیرالجہات موضوعات کے شاعر ہیں۔انہیں اپنی انااور خودداری بہت عزیز ہے اوریہی بات ان کے متعدد اشعار سے بھی واضح ہے۔وہ جدت کی راہ چلتے ہوئے جب روایت سے قریب تر ہوجاتے ہیں تو کبھی کبھی رومان پرور خوب صورت اشعار کہہ کربھی اپنی دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ان کی اس کتاب میں کاٹ دار طنز کے اشعار بھی کچھ کم نہیں ہیں۔انہوں نے میدان جنگ کے رزمیہ پس منظر میں بھی گرانقدر اشعار تخلیق کئے ہیں۔توقع کی جاسکتی ہے کہ''سمندر سوچتا ہے''سے رئیس الدین رئیسؔ کا قد مزید بلند ہوگا۔

نام کتاب: منظومات آسیؔ،مرتب: ڈاکٹر حسن امام دردؔ،صفحات:۲۸۴،قیمت:۲۵۰روپے،مطبوعہ:۲۰۰۸،ناشر: اردو ادارہ،امیر منزل قلعہ گھاٹ دربھنگہ،مبصر: ڈاکٹر ایم۔صلاح الدین،دربھنگہ

مولانا آسیؔ بیسویں صدی کے عہد وسطیٰ کی ایک معروف شخصیت تھے جو اپنے وقت کے جید عالم، سحرالبیان مقرر،معلم اخلاق،معلم درسیات،مجاہد آزادی،صحافی اور انقلابی فکر کے حامل زود گو اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں کے استاد شاعر تھے۔جن کا دائرہ عمل دربھنگہ سے شانتی نکیتن اور صداقت آشرم پٹنہ وجمشید

پورے سابرمتی آشرم تک پھیلا ہوا تھا، جن کی زندگی کا بیشتر حصہ پروفیسر عبدالباری، ڈاکٹر سید محمود، آچاریہ کرپلانی، مولانا شفیع داؤدی، ڈاکٹر راجندر پرساد، مولانا مظہر الحق اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عبقری ہستیوں کے زیر سایہ خدمتِ قوم وملت میں گذرا، جنہوں نے شمالی بہار کے بڑے بڑے مشاعروں کو گرمایا، اپنی صدارت سے سرفراز کیا اور اپنی شاعری کا سکہ جمایا وہ اپنی بے نیازی اور خود فراموش طبیعت کے سبب اپنی بیش بہا تخلیقات ونگارشات کو مربوط ومجموع شکل میں منظرِ عام پر لانے کی ضرورت محسوس کر سکے نہ اپنی کائنات شعری کو بچو کر رکھنے کے روادار ہو سکے۔ ظاہر ہے ایسی شخصیتیں گردشِ زمانہ کے گرد وباد میں گم ہو ہی جاتی ہیں لیکن کچھ لوگ متاعِ گم شدہ کے جویا ہوا کرتے ہیں جن کی بدولت لوگ انسانی تہذیب وتمدن اور لسانی وادبی ارتقا کے نشیب وفراز سے آشنا ہوا کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں ڈاکٹر امام اعظم اور معروف بزرگ ادیب وشاعر حسن امام دردؔ بھی ہیں جنہوں نے متھلا کے ایک فراموش شدہ مقتدر شخصیت کو یادگار بنا دیا ہے۔ اوّل الذکر نے دانشورانِ ادب کو اردو ادبی سرکل کے توسط ''مولانا عبدالعلیم آسیؔ ایوارڈ'' دینے کا سلسلہ ۲۰۰۴ء سے جاری کیا تو جناب دردؔ نے مولانا آسیؔ کی نگارشات وتخلیقات کو منصۂ شہود پر لانے کی ٹھانی۔ مولانا مرحوم نے مربوط ومجموع شکل میں اپنی تحریریں چھوڑی ہی نہیں تھیں بنابریں بڑی کدوکاوش اور تلاش وجستجو کے بعد انہیں جو نثری تحریریں دستیاب ہوئیں انہیں ۲۰۰۷ء میں اکٹھی کر کے ''منثوراتِ آسیؔ'' کے نام سے شائع کرادی اور اب دستبردِ زمانہ سے محفوظ منتشر شعری تخلیقات کو ''منظوماتِ آسیؔ'' کے نام سے پیش کر دیا ہے۔ اس میں حمد، نعت، منقبت، نظم، غزل، مرثیہ، سہرا وتہنیتی نظم، قطعہ اور رباعی پر مشتمل اردو کلام اور غزل وقطعہ پر مشتمل فارسی وعربی کلام ہیں۔ ناچیز کی واقفیت کے مطابق مولانا اپنے وقت کے جتنے بڑے زود گو مقبول اور محترم شاعر تھے اس لحاظ سے یہ شعری مجموعہ ان کی پوری شعری کائنات کو محیط نہیں ہے کہ جن کی بنا پر مولانا کے شاعرانہ قد کی تعین انشراحِ صدر سے کی جاسکے تاہم جہاں مولانا آسیؔ جابجا تذکرے تک ہی محدود تھے اور ان کی باقیات تک معدوم تھیں یہ بھی غنیمت ہے اور انہیں ''مشتے نمونے از خروارے'' کی مصداق باور کیا جاسکتا ہے کہ جو کچھ سامنے ہے اس کے منظرنامہ میں مولانا کی شاعری ان کے مفکرانہ، مصلحانہ اور مجاہدانہ کردار کے پرتو، ان کے جذبات کے خلوص، ان کے تجربات کی صداقت اور فکر وخیال کی ندرت سے مملو ہو کر اور اساتذۂ کبائر کے مختلف رنگوں کے امتزاج سے قوسِ قزح بن کر ابھری ہے جو اپنی سطح پر مولانا کی شخصیت کی طرح جتنی نرم، سبک اور پرسکون ہے اندر سے اتنی ہی تند وتیز اور ہنگامہ خیز ہے۔ جیسا کہ مولانا نے کہا ہے:

جس کا ہر جرعہ بڑھا دیتا ہے ذوقِ تشنگی
میرے دستِ شوق میں وہ جام تند وتیز ہے

اس طرح جو شاعری بلند انسانی خیالات کو ہمارے سامنے پیش کرے کہ ہمارے جمالیاتی حظ کی تسکین بھی ہو اور دماغ میں حقیقت کے شعور سے نئی روشنی آئے جو ہمارے نفیس ترین اور شریف ترین جذبات کو بیدار اور متحرک کردے وہ یقیناً سچی اور اچھی شاعری کے زمرے میں آتی ہے جس سے بے اعتنائی کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔

لہٰذا مولانا کے جامِ دست شوق کی تندی وتیزی کتنی سرور آگیں ہے یہ جاننے کے لئے یہ مجموعہ اہل ذوق کو دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ یہ دعوت بصد شوق پذیرائی کی مستحق ہے کہ اس سے متاع گم شدہ کی بازیافت میں پتہ پانی کرنے والے کی حوصلہ افزائی ہوگی اور فخر متھلا کی قدر شناسی بھی ہوگی۔ ایسی گرانقدر و مستحسن کاوشوں پر جناب دردکو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

نام کتاب: احتساب، مؤلف: ناوک حمزہ پوری، صفحات: ۴۸، قیمت: مفت، مطبوعہ: ۲۰۰۷ء، ناشر: دارالادب حمزہ پور، ڈاکخانہ شیر گھاٹی ضلع گیا۔ 824211، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

مامون ایمن کو یہاں کے لوگ نہیں جانتے اور اس کا احساس انہیں بھی ہے۔ کہتے ہیں:

جنگل ہی ملے خواب کے شہروں میں بھی
دوری ہی رہی قرب کے رشتوں میں بھی
کیا طرفہ تماشہ ہے کہ ایمن صاحب
ہم غیر رہے اپنے ہی لوگوں میں بھی

اس ناشناسی کے مشاہدے نے ہی جناب ناوک حمزہ پوری کو یہ تعارفی کتابچہ بعنوان ''احتساب'' شائع کرنے پر مجبور کیا ہے۔ مامون ایمن کی خمیر الہ آبادی ہے مگر بقول علامہ قمر رعینی (راولپنڈی): ''مامون ایمن امریکہ میں اردو رباعی کے باوا آدم کہلانے کے مستحق ہیں۔'' لہٰذا حضرت ناوک نے ان کی ننانوے رباعیاں شامل کر کے مکمل تعارفی خاکہ کے ساتھ انہیں رباعی کا مجتہد قرار دینے پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔ خود ایمن نے بھی اسی طرح کا یقین یوں ظاہر کیا ہے:

راہی ہوں، کسی راہ کا ہو جاؤں گا
پانے کے لئے خود کو، میں کھو جاؤں گا
زندہ مجھے رکھے گی رباعی ایمن
پودا نئے اسلوب کا بو جاؤں گا

اب یہ ہیچمداں اس پر کیا لکھے جب فی زمانہ رباعی کے معترفِ فن آگاہ ہی انکی فنکارانہ کاوشوں کا احتساب پیش کر رہے ہیں اور صرف ڈاک خرچ -/25 روپے کے عوض مفت یہ کتاب عنایت کر رہے ہیں۔ ایمن نئی بستی کے قلمکاروں بالخصوص امریکہ میں اردو کو فروغ دینے والوں کی صف اوّل میں بھی شمار کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے محب اردو کے کارناموں سے آگہی کے میسر موقع سے استفادہ میں کوتاہی کو میں کفرانِ نعمت کے مترادف سمجھتا ہوں۔

نام کتاب: آوارہ لمحے (شعری مجموعہ)، شاعر: پی۔ پی سریواستو رند، صفحات: ۱۱۲، قیمت: -/۱۰۰ روپے، مطبوعہ: ۲۰۰۷ء، ناشر: پی۔ پی سریواستو رند، R-16 سیکٹر، نوئیڈا-201301، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

آوارہ لمحوں کو گرفت میں لانے کا عمل تخیلی اور تخلیقی قوت کے ہنرمندانہ بنت کا متقاضی ہوتا ہے۔

پی۔ پی سریواستو رند اس ہنر میں طاق ہیں کہ یہ داغ اسکول سے نسبت رکھتے ہیں اور ریاضت کا یہ عالم ہے کہ نصف صدی کے عرصے میں یہ نواں مجموعہ اہل نقد ونظر کی نذر کر دی ہے۔ یہ زود گوئی بہتوں کی طرح صرف مجموعوں کے انبار لگانے پر منحصر نہیں بلکہ اپنی فکری اور تخلیقی کاوشوں سے اہل نقد ونظر کا متاثر کر کے ڈھیروں ادبی اعزازات واکرامات وصول کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ 49 غزلوں پر مشتمل ہے، یہ غزلیں معاصر اردو غزل کے دامن میں ایک ایسا اضافہ ہے۔ جس پر سرسری نظر ڈال کر گذرا نہیں جاسکتا کہ انہوں نے غزل کی روایت کو اپنی اختراعی صلاحیت سے نئی توسیع دی ہے۔ عصر حاضر کی نیرنگ زندگی اور ان کی بدلتی حسیت کو باطنی سوز وگداز کا پیکر دینے کے لئے الفاظ کے نئے تلازمات کی تلاش، نئی بندشوں اور نئی ترکیبوں کی جو اختراع کی ہے وہ قابل توجہ ہے اور ایسی کاوشیں محض تجربے کے شوق میں نہیں کیں بلکہ عصری حسیت کے کرب نے ان پر مجبور کیا۔ مثلاً:

سازشی لمحوں نے وہ تیزاب پھینکا تھا بدن پر
زخم بھی بھرتے کہاں تک پٹیاں کم ہوگئی ہیں

سوانہوں نے نئی پٹیوں کی جستجو کی اور خوب کی ہے۔ اشعار میں جذبہ واحساس اور تغزل کا فطری بہاؤ انکتا یا ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ ان میں جابجا جذبہ کی شدت، تخیل کی نادرہ کاری، استعاراتی اظہار کی ندرت، رمزیاتی بندش، تاثر کی تہہ داری اور امیجری کی جودت دیکھتے بنتی ہے۔ مثالوں سے اپنی حد کو پھلانگنا نہیں چاہتا صرف ایک شعر دیکھیں:

سلگتی رات کا ایندھن الاؤ پر رکھ کر
اداس لمحوں کے شعلے نئے بناتا ہوں
یہ تیور ہے رند کے اظہار کا اس لئے کہتے ہیں
کوئی تو آکر خریدے گا خراشیں روح کی
ہم بھرے بازار میں بیٹھے ہیں یہ سودا لئے

آج ہر حساس روح گھائل ہے اور ان کے لئے یہ آئینہ ہے۔ اس لئے میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آج کی اردو شاعری کے بازار میں رند کا یہ سودا معنوی وصوری دونوں اعتبار سے حظ اور فکر کو مہمیز دینے والا ہے۔

نام کتاب: تذکرہ علمائے بہار، جلد دوم، مؤلف: ابوالکلام قاسمی شمسی، صفحات: ۲۹۶، قیمت: -/۱۵۰ روپے، مطبوعہ: ۲۰۰۶، ناشر: مؤلف مذکور پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ۔ مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

سرزمین بہار مادی اعتبار سے ہی زرخیز نہیں رہی ہے بلکہ ذہنی وفکری اپج کے اعتبار سے بھی یہ مالا مال رہی ہے اور ہر دور میں، ہر سطح پر اس نے اپنے Talent کی پیداواری صلاحیت کا اعتراف زمانے سے کروایا ہے مگر افسوس ہے کہ یہاں کے لوگوں میں بالعموم فروتنی غالب رہتا ہے بصورت دیگر اپنے وطن مالوف کو اپنے حوالے سے نمایاں کرنے کے حوصلے کا فقدان رہتا ہے جس کے سبب ''بہاری'' کا تصور پسماندگی اور ناشائستگی کی علامت بن گیا ہے لیکن یہاں کے کچھ حساس لوگ اس افسوسناک تصور کو باطل کرنے اور یہاں کے لوگوں کو احساس کمتری کے حصار سے نکالنے کی کاوشیں کرتے رہے ہیں۔ انہیں میں مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی بھی ہیں جنہوں نے یہاں کے

علماء کی علمی، ادبی، ملی اور قومی خدمات کو اجاگر کرنے کا پروجیکٹ اپنے سر سنبھالا اور بفضلہ تعالیٰ دو منزلیں طے کر لیں۔ ''تذکرہ علمائے بہار جلد اول'' 1996ء میں شائع کر چکے ہیں اور یہ دوسری جلد زیر نظر ہے۔

پہلی جلد گزرے زمانہ کے تذکرہ پر مشتمل تھی یہ دوسری بھی وفات یافتگان کے حالات وکوائف کو محیط ہے۔ اس میں گرچہ 283 علماء کے تذکرے ہیں مگر تشنہ ہیں کیوں کہ بہتیرے قابل ذکر علماء کے حالات وکوائف تک رسائی سے یہ عاجز رہے اور بعضوں کے کمالات وخدمات کو تذکرہ کے دائرے میں سمیٹنا ممکن نہ تھا۔ جس پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے مؤلف نے خود ہی لکھا ہے: ''مجھے احساس ہے کہ کتاب کے مطالعہ کے وقت آپ کو تشنگی کا احساس ہوگا لیکن یہ میری مجبوری اور تذکرہ کی مجبوری ہے (تاہم) اس کمی کو دور کرنے کے لئے ماخذ کی نشاندہی کردی گئی ہے۔'' بصورت مجموعی ابوالکلام قاسمی شمسی کے اس پروجیکٹ کے تحت شائع ہونے والی کتابیں ہماری تاریخ کے باب میں اضافہ ہیں اور یہ کاوش علمی وادبی دونوں اعتبار سے وقیع ہے۔ اپنی وراثت کو نجو کر تاریخ کا حصہ بنا دینے کی کوشش قابل قدر ہے۔ زبان سہل اور عام لوگوں کے استفادے کی اہل ہے۔ اس کی خاطر خواہ پذیرائی مؤلف کو اگلی منزل کی طرف تیز گام کرنے کا حوصلہ دے گی، انشاء اللہ۔

نام کتاب: میر کارواں، مدیر: ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی وغیرہ، صفحات: ۴۶۶، قیمت: /۴۰۰ روپے، مطبوعہ: ۲۰۰۷ء، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

ایک خواب کی تشکیل وجمیل تجسیم کرنے والی ہستی کو خراج تحسین پیش کرنے والی کتاب کا نام ''میر کارواں'' ہے۔ اردو کے توے پر اپنے مطلب کی روٹیاں سینکنے والوں کو درس عبرت دینے والی وہ ہستی ہے شعبۂ حیاتیات میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے سائنسداں پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری...... جنہوں نے سائنسی فتوحات کے علاوہ ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کے بانی ڈائریکٹر اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر بن کر اصغر گونڈوی کی تلقین ع ''پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا'' کو حقیقی روپ دیدیا اور بتا دیا کہ معمولی آدمی، غیر معمولی کیسے بن جاتا ہے۔

یہ کتاب اس مؤقر ہستی کو فوکس کر کے انسانی کردار کے انہیں پہلوؤں کو اجالتی ہے اس میں بڑی بڑی مؤقر ہستیوں کے تاثرات وخیالات پر مبنی مختلف النوع پینتالیس مشمولات ہیں جن میں نہ صرف پروفیسر جیراجپوری کی زندگی کے ہر مدارج، کردار کے تقریباً ہر پہلو اور خدمات وکارنامے کی جھلک موجود ہے بلکہ ایک عہد کی تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیوں کی تاریخ بھی سمٹ آئی ہے۔ پروفیسر جیراجپوری کی خودنوشت: ''کچھ یادیں، کچھ باتیں'' ''ابھرتے نقوش'' اور ان کے سائنسی کارناموں کے بارے میں ڈاکٹر قیصر حسین باقری وغیر کی مؤلفہ ''رومانس آف ریسرچ'' کے جائزے بھی ہیں جن سے پروفیسر موصوف کے ادبی ورک اور سائنسی فتوحات کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ یہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی اساسی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے اور نئی نسل کے لئے بصیرت افروز وشمع ہدایت ہے۔ صوری اعتبار سے نفیس ودل پذیر ہے۔ زندگی میں کچھ کر دکھانے کی تڑپ رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے اور بہر صورت پذیرائی کی مستحق ہے۔

نام کتاب: دوہا غزل-دوہا گیت (عالمی انتخاب)، انتخاب کار: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، صفحات: ۲۳۲،
قیمت: ۵۰ روپے، مطبوعہ: ۲۰۰۶ء، ناشر: مکتبہ کہسار، بھیکن پور ۳، بھاگلپور، مبصر: ڈاکٹر ایم صلاح الدین، دربھنگہ

ڈاکٹر مناظر عاشق کی افتادِ طبع بھی غضب کی ہے خود دور کی کوڑی لانے میں سبقت کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ یہ شعری گلدستہ بھی ان کے اسی رجحان کا غماز ہے۔ دوہا غزل اور دوہا گیت، ظاہر ہے اردو شعریات میں نو وارد ہیں جو خلاق واختراعی ذہن کے مالک اور تنوع پسند شاعر ڈاکٹر فراز حامدی کی اختراع ہیں جنہیں ابھی قبولِ عام تو حاصل نہیں ہوئی ہے مگر ان صنفوں کی نادرہ کاری، تہہ داری، اثر پذیری، شوخی وبانکپن نے بہتیرے شعراء کو متوجہ کرلیا ہے۔ دوہا اور گیت ہندوی زبانوں کی قدیم ومقبول اصناف سخن ہے۔ ڈاکٹر فراز حامدی نے ان کی ہیئتوں کو مسخ کئے بغیر ہندی سے الگ کر کے غزل وگیت کی صنفی خصوصیات کے امتزاج سے اردو کی الگ پہچان اور اسلوب کا جداگانہ انداز انہیں عطا کیا ہے جسے دیگر شعراء نے اپنا کرنئی جہت دینے کی نرالی کاوشیں کی ہیں۔ ڈاکٹر مناظر نے خود بھی انہیں اپنے ذوقِ سخن کا حصہ بنالیا ہے۔ لہٰذا دنیا بھی میں پھیلے شعراء کی ان ہی کاوشوں کو اعتبار بخشنے اور اہل ذوق واہل نقد ونظر کو ان کی جانب متوجہ کرنے کے لئے ڈاکٹر مناظر نے ان کے دلکش تخلیقی نمونوں کا انتخاب بڑے قرینے سے پیش کیا ہے۔

نام کتاب: تلاش منزل، مصنف: عبدالغفار ثاقب، پتہ ناشر: مکتبہ جام نور-۶ دہلی، صفحات ۱۷۶،
قیمت: ۵۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر محمد قیس، دربھنگہ

یہ ثاقب کی دوسری تصنیف ہے۔ اس میں بھی "الدین النصیحۃ" کے جذبات کارفرما ہیں۔ تکمیل کتاب تک ثاقب کی کوشش یہی رہی ہے کہ بیان میں شریعت، حقیقت اور اصلیت سے ذرہ برابر بھی علیحدگی نہ ہو۔

عبدالغفار ثاقب کی پہلی تصنیف "تاریخ کا پہلا ورق" مذہبی تاریخ از ابتدائے تخلیق ابوالبشر حضرت آدمؑ تا عہد پاک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا پس منظر ہے۔ ثاقب کو اس کتاب کی روشنی میں صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں نیشنل ایوارڈ سے ۲۰۰۴ء میں سرفراز کیا جاچکا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں اسلاف کے مذہبی عملیات میں رخنہ اندازی، افترا پردازی اور بہتان تراشی کا مدلل مطالعہ پیش کیا ہے۔ ثاقب کے خیال میں غیر منقسم ہندوستان میں تقریباً دوسو سال سے صیہونی سیاسی منصوبہ کے تحت افتراق بین المسلمین پیدا کرنے کی تگ ودو میں بظاہر خیر سگالی کا پیغام لے کر آئے مندوبین نے بڑی مہم سر کرلی۔ ان کے دام تزویر میں پھنس کر ہوس پرور وحریص سیم وزر چند سائی گر علمائے سوء نے اپنی موشگافیوں کے زور پر بغرض "سیہ کردن صفات کمالیہ گرانمایہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارکہ میں توہین آمیز ونازیبا کلمات کی تکرار، متبعین سنن سے متعلق ناروا تخاطب، عاملین سنن کے حق میں کفریات، واہیات اور متبدعات پر مشتمل کتابیں اور ملفوظات تصنیف وتالیف کرا کر خصوصاً کم سواد بہ علم دینیات مسلمانوں میں تقسیم کرادی جن سے مسلمانوں کے رفاہی امور بنام عامہ، عملیات دینی بتقلید خلفائے راشدین وصحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، ائمہ

مجتہدین، محدثین ومفسرین، اولیائے کاملین وبندۂ صالحین، اخراجات براہ فی الخیر یہ ادارۂ خدمات غرباء ومساکین سے بے رغبتی بڑھنے لگی ہے۔ نتیجہ میں فضائے ملت اسلامیہ مکدر ہونے لگی ہے کہ ان علمائے سوء نے ان پر بدعت اور فضول خرچی کے فتاوے صادر کردیے ہیں، جب کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے: ''لاسرف فی الخیر'' تو ایسی پیر پرستی سے کتش عاملین دین وسنن داغدار ہونے سے مسلمانوں کا بے حساب نقصان ہورہا ہے۔

فرائض اور واجبات دین کی ادائیگی میں محبت کم اور امید وبیم کا عنصر زیادہ غالب ہوتا ہے۔ سنن ومستحبات پر مخلصانہ عمل ہی نے مسلمانوں میں محبت رسول اور اتفاق واتحاد پیدا کیا جنہیں عالم انسانیت عقیدت واحترام سے دیکھنے لگا جن کو کچھ نام نہاد مسلمان نے غیر ضروری یا بدعت وخرافات بتا کر اختلاف بین المسلمین کا بیج بودیا جو انتشار کا باعث بنا جب کہ اتباع رسول کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا ہے۔ اس میں عشق کی کارستانی زیادہ ہوتی ہے۔ محبت قربانی کا طالب ہوتی ہے اور پیشگی قربانی کے لئے نہ تو واضح درجہ بندی قرآن حکیم سے ثابت ہے اور نہ حدیث پاک ہی سے کسی حد بندی کا سراغ ملتا ہے:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ☆ ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما (حافظ شیرازی)

ثاقب ایک عالم نکتہ داں، باصلاحیت ادیب، صاحب پر بہار طرز نگارش، کامل استاذ، مفتی اور قاضی شریعت کے ساتھ ساتھ خطیب ممبر ومحراب اور مجلس مقرر ہیں۔ لہٰذا! ''تلاش منزل'' میں بیانیہ عبارت آرائی، فروعی تشریحات اور عرفی خیالات، تسلسل مضامین سے قدرے بے ربط اور ذہن وفکر پر بار ہیں۔ اس کتاب کی عبارت آرائی پر نظر ثانی کی اشد ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ پروف ریڈنگ میں فرض منصبی سے قطعی بے اعتنائی برتی گئی ہے، تاہم نفس مضمون کی تفہیم منزہ ومطہر ہے۔ یہ کتاب ثاقب کی محنت شاقہ وجانفشانی وعرق ریزی در مطالعہ کتب نوادر کی وجہ سے ان کی پہلی تصنیف ''تاریخ کا پہلا ورق'' سے زیادہ معلوماتی، کارآمد اور فیض بار ہے۔ 'نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول'

نام کتاب: شہر نامہ (مجموعہ رباعی)، شاعر: علقمہ شبلی، مرتب: ڈاکٹر مظہر کبریا، قیمت: ۱۲۵ روپے، مطبوعہ: ۲۰۰۸ء، ناشر: اثبات ونفی پبلی کیشنز: ۸۹/۵ رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس، کولکاتہ ۷۰۰۰۱۶، مبصر ڈاکٹر ایم صلاح الدین، دربھنگہ

جناب علقمہ شبلی کا شمار فی زمانہ ان گنے چنے شاعروں میں ہوتا ہے جو ہماری شاعری کو فنی جہتوں اور نئے امکانات سے آشنا کرانے کے جذبے سے سرشار رہے ہیں۔ یہ رباعیوں کا مجموعہ ان کے اس جذبہ اور فنکارانہ قدرت کی ایک جھلک محض ہے، ورنہ رباعیاں تو انہوں نے بہت لکھی اور رنگارنگ لکھی ہیں۔

گرچہ رباعی تکنیکی اعتبار سے مشکل صنف گردانی گئی ہے پھر یہ اپنی طبع مخصوص یعنی میلان کی بھی متقاضی ہوتی ہے اس لئے اکثر بڑے شعراء کے یہاں بھی نمونہ ہائے قدرت کلامی کے طور پر ہی نظر آتی ہے لیکن علقمہ شبلی کی رباعی گوئی پر ممتاز شاعر وناقد پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی رائے کہ:

''علقمہ شبلی صاحب ان شعراء میں ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے رباعی کو ناپید ہونے سے بچالیا ہے۔ رباعی لکھنے والوں کی تعداد

انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے اور ان انگلیوں پر گنے جانے والے شعراء میں علامہ شبلی بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں۔''

اس سند کے بعد تو پھر ان کی رباعیوں کی کہکشاں پر کمند ہی ڈالنا باقی رہ جاتا ہے اور قابل دید پہلو یہاں یہ ہے کہ رباعی کے روایتی موضوعات سے پرے یہ رنگ برنگے ''شہرنامے'' ہیں۔ ان ۱۸۸ شہرناموں میں رباعی کی کسی کسائی تکنیکی پابندی کے ساتھ ملکی اور غیر ملکی ایک سو تین شہروں کا شاعر نے ایسا منظر نامہ خلق کیا ہے جو پیرایۂ بیان کی سادگی کے باوجود تحت الفاظ میں کارفرما جذبے کے وفور اور فکری عمق کی شعاعوں میں ان شہروں کی نیرنگیوں، سرشاریوں اور محرومیوں کی نہ صرف رنگارنگ پرتاثیر تصویریں دکھاتے ہیں بلکہ لمحۂ آئندہ کے امکانات کی بھی بشارت دے جاتے ہیں۔ ندا فاضلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''تخلیقی عمل نہایت پیچیدہ عمل ہے۔ ان پیچیدگیوں کو سلجھانے میں شعری حرارت کے ساتھ قدرت کا بھی ہاتھ ہوتا ہے، جب شعری بشارت میں قدرت کی مہربانیاں شامل ہو جاتی ہیں تو الفاظ کا جادو جاگتا ہے۔''

اور میرے خیال میں جذبہ صادق ہو تو قدرت مہربان ہوتی ہی ہے۔ یہ رباعیاں اس کی مظہر ہیں کہ ان کے جادو جگاتے الفاظ ہمیں سرشار کر جاتے ہیں۔ منتشر و مختلف رسائل و جرائد کے اوراق پارینہ سے چن چن کر ایسے نوادرات کو یکجا کر دینے کے لئے ڈاکٹر مظہر کبریا قابل تحسین ہیں اور ان کی یہ کاوش لائق پذیرائی ہے۔

نام کتاب: جگ بوڑی کی لہریں، شاعر: ساحر شیوی، اشاعت: ۲۰۰۸ء، قیمت: /۲۰۰ روپے، پبلشر: پبلشنگ ہاؤس ۹۔ سولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۲، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ساحر شیوی ایک معتبر شاعر ہیں۔ انہوں نے داخلیت سے پر معیاری شاعری سے جدید شعری روایت میں اضافہ کیا ہے۔ نیم شگفتہ، وقت کا سورج، صحرا کی دھوپ، سلسلہ منتشر خیالوں کا، پانچواں آسمان، ابھی منزل نہیں آئی، کوکن میرا یہاں وغیرہ شعری مجموعے ان کی انتھک لگن اور تخلیقی دھنک کو درشاتے ہیں۔ ان کی نثری خدمات قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ساحر شیوی کی زندگی میں ہجرت در ہجرت پختہ تر مشاہدات و تجربات کا وہ رنگ ہے جس سے ادب کے کنواس کا ہر گوشہ منور ہے۔ ''جگ بوڑی کی لہریں'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں نغمانے، غزلیں، نظمیں، گیت، رباعیات، کہہ مکرنیاں، ثلاثی، قطعات، سہرے، دوھے اور سین ریو شامل ہیں۔ ساحر شیوی کی شاعری کا جوہر ان کی غزلوں میں کھلتا ہے۔ لفظوں کی تراش خراش سے معنی آفریں پیدا کرنا ان کی ہنرمندی میں شامل ہے۔ ان کا لہجہ سادہ ہے مگر پرکاری سے عاری نہیں۔ اشعار میں عصری حسیت کی جلوہ باری ہے:

رات ہونے کو ہے پھر بھی کیا جانے کیوں
شاخ پر کچھ پرندے چہکتے رہے

اجیرن اپنی بھی زندگی نہیں کرتے
غموں کے بوجھ سے ہم خودکشی نہیں کرتے

قسمت پر تکیہ کرنے کی بات نہ کر
گدیریں بھی ساتھ میں ناداں لے کر

زندگی سے بے خبر ہے زندگی
اک ادھوری رہ گزر ہے زندگی

اس مجموعہ میں شامل غزلیں اس سرسبز گلستان کی مانند ہے جس میں رنگارنگ پھول کھلے ہیں۔ نظموں میں شاعر نے حدیث دل بیان کرنے کی سبیل ڈھونڈی ہے۔ جگ بوڑی کی لہریں نظم پر تاثیر ہے اور شاعر کے اپنے وطن عزیز سے حد درجہ لگاؤ کو واضح کرتے ہیں۔ یہ فطری عمل ہے کہ وطن سے ہم بے حد محبت کرتے ہیں موضوع بدبدل کر اس کی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ یہ نظم جگ بوڑی ندی کی طغیانی اور اس سے ہوئے نقصان کو قاری کے سامنے تو رکھتا ہی ہے ساتھ ہی شاعر کے دل میں جذب اس ندی کی شبیہہ کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ''عشق اردو''، ''تمنا''، ''مایوس''، ''تمہارے گاؤں میں''، ''آج کی عورت''، ''اے ماں'' وغیرہ نظمیں خصوصی طور پر اچھا تاثر دیتی ہیں۔ ''تاج محل'' اور ''آمنہ'' نے خوب محظوظ کیا۔ نظموں میں شاعر کا کمال فکر اور دردمندی نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ''گیتوں'' کا اپنا آہنگ ہے۔ ندیوں کی لہروں کی طرح بل کھاتی موسیقی بکھیرتی ہوئی شاعری کا روپ گیت میں نظر آتا۔ اس مجموعے میں شامل ۳۱ رباعیاں ساحر شیوی کے وسعت افکار کی نمائندہ ہیں۔ کہہ مکرنیاں (پچاس) کا الگ مزہ ہے۔ ''جگ بوڑی لہریں'' اپنے دامن میں سہرے سجائے ہوئی ہیں۔ عام طور سے سہرے کو شعری مجموعے سے الگ رکھا جاتا تھا اب یہ پیش کش خوش آئند ہے کہ سہرے کے مجموعے کتابی شکل میں آنے لگے ہیں اور اسکی پذیرائی بھی ہو رہی ہیں۔ مامون ایمن کا پیش کردہ خوبصورت مجموعہ اس ضمن میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ساحر شیوی نے سہرے بہ طرز فلمی نغمے کامیابی کے ساتھ قارئین تک پہنچائے ہیں۔ دوہے اور سین دیو کا انگریزی ترجمہ معیاری ہے۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ ''جگ بوڑی کی لہریں'' بہ ایں معنی مکمل ہے کہ اس میں ساحر شیوی کے متعدد اصناف سخن پر طبع آزمائی کو ایک ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے اور ان کی شاعری کو اکائی میں برآمد کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر دیا ساگر آنند، خالد یوسف، اسحاق ساجد، عقیل دانش کے مضامین شامل ہیں جن میں ان کی شاعری کی خصوصیات کو احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ نغمانہ سے متعلق انور شیخ سے ایک شعری مصاحبہ بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ نغمانہ کے تعلق سے بہت سی ضروری اور غیر ضروری باتیں قارئین تک آئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں شاعر کے احوال وکوائف درج ہیں جن سے ساحر شیوی کو جاننے میں آسانی ہوتی ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ گٹ اپ بھی شاندار ہے اور سب سے زیادہ بچی ہے انتساب کے اشعار جس میں زندگی کی عظیم ہستی ''ماں'' کو خراج پیش کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے ساحر شیوی کا یہ مجموعہ پسند کیا جائے گا اور اس پر سودمند گفتگو ہوگی۔

نام کتاب: فروغ اقبال، مصنف: محمد منصور عالم، سن اشاعت: جنوری ۲۰۰۸ء، صفحات: ۳۴۴، قیمت: ۲۵ روپے، ناشر: محمد منصور عالم، یونیورسٹی پروفیسر، شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

پروفیسر محمد منصور عالم مطالعہ پسند اور سنجیدہ فکر ونظر کے مالک ہیں۔ ''فروغ اقبال'' سے قبل ان کی کتابیں بہار میں تذکرہ نگاری، امعان، تمیز تحریر، نخبائے تحقیق، حریر دورنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری شائع ہو کر علمی وادبی حلقے میں پسند کی گئیں۔ اردو میں اقبالیات کا ذخیرہ وسیع وقیع ہے۔ اقبال کے حوالے سے

مختلف موضوعات پر سکہ بند تنقیدیں بھی کتابی صورت میں موجود ہیں تو عظمتِ اقبال کے اعتراف میں تحاریر شیدائی اقبال کو محظوظ کرتی رہی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب فروغ اقبال بھی اقبالیات کے مطالعہ میں اضافہ ہے۔ جامع پیش لفظ میں مصنف نے اقبال کی شاعری کے حوالے سے رائج بیانات کو موضوع بناتے ہوئے سودمند بحث کا آغاز کیا ہے۔ اس میں اقبالیات پر کام کرنے والے تنقید نگاروں کی پرکھ کا جواز سامنے آیا ہے۔ وہ شاعر اقبال کو کھلے ذہن و دل سے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ تمہید رقم کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے اقبال کے مطمع نظر اور سرچشمہ شاعری کو سامنے رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی گفتگو کو باوثوق بنانے میں آل احمد سرور کے اس جملے سے مدد حاصل کی ہے جس میں انہوں نے اقبال کو ہندوستانی فکر، یورپین فکر اور اسلامی فکر کا فرماں روا کہا ہے۔ بلاشبہ اقبال کی عظمت انہیں نکتوں میں پوشیدہ ہے۔

''فروغ اقبال'' کے مضامین کا آغاز اقبال اور کلیم الدین احمد سے ہوتی ہے۔ ۲۸ صفحات پر پھیلے اس گفتگو میں کلیم الدین احمد کی نگاہ ناقدانہ کی جانچ پرکھ کی گئی ہے جو انہوں نے اردو شاعری پر ایک نظر حصہ دوم اور ''اقبال ایک مطالعہ'' میں روا رکھا ہے۔ محمد منصور عالم صاحب نے حوالے جات اور مدلل نکات کو بروئے کار لاتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ''اقبال ایک مطالعہ'' میں کلیم الدین احمد کی تنقید ناکام ہوگئی ہے۔ ''اقبال اور عبدالمغنی'' کا مطالعہ ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالمغنی کے وسائل اور اقبال پر ان کی تنقیدی رویے کا پتہ دیتا ہے۔ اقبال اور محمد علی جوہر اچھا معلوماتی مضمون ہے۔ اقبال اور سردار جعفری میں اقبال کے نظریہ اشتراکیت اور سردار جعفری کی فکر کو پیش کیا گیا ہے۔ اقبال اور آل احمد سرور میں ''دانش ور اقبال'' اور ان کی دوسری تنقیدی کتابوں میں اقبال پر لکھے گئے مضامین سے بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے کوشش کی ہے کہ آل احمد سرور کا نظریہ اقبال واضح ہو کر سامنے آجائے۔ انہوں نے اس مضمون کے آخر میں کلیم الدین احمد کی لغزشوں اور آل احمد سرور کی گرفت کا مزید تذکر کیا ہے۔ اقبال اور شمس الرحمن فاروقی اس کتاب کا اہم مضمون قرار پاتا ہے۔ مصنف نے پیش لفظ میں خصوصی طور پر اس مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال پر محترم فاروقی کا کام سب سے عمدہ ہے۔ یہ مضمون اقبال دانی میں کتنا اہم ہے جاننے کے لئے بالغ النظر قاری کو اسے ضرور پڑھنا چاہئے۔ اقبال اور رباعی کے عنوان سے مشمولہ مضمون میں اقبال کی رباعی اور شعری پر بحث ہے۔ اقبال اور ابلیس بشر، اقبل اور فنون لطیفہ اچھے مضامین ہیں۔ تشابہات اقبال مصنف کی عرق ریزی کی چیدہ مثال ہے۔ مکالمات اقبال میں اقبال کے خیالات ان کی چنندہ نظموں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ مضامین کے بعد اقبال کی چند نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ بھی پچیل کر فکری گوشے کو سامنے لانے میں کامیاب ہے۔ نظموں میں حقیقت حسن، جبریل وابلیس، ذوق وشوق، مسجد قرطبہ، ابلیس کی مجلس شوریٰ، ساقی نامہ، تنہائی، شعاع آفتاب پر مصنف نے تجزیاتی نگاہ کی ہے، یہیں مصنف کی تنقیدی ربروچ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال شناسی اور اقبال فہمی کا جوہر یہیں ملتا ہے کہ آزادئ فکر کے ساتھ نظموں کا مطالعہ کتاب کی زینت ہے۔ اقبال کی چند نظموں کا تقابلی مطالعہ بھی خوب ہے۔ اقبال کا شجرہ نسب اور توقیت اقبال سے قبل فکر، تخیل، تشکیل شعر میں اقبال کے موضوعات، نظموں کے عنوانات دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب کی طباعت عمدہ ہے۔ اس کی قیمت بھی مناسب ہے۔ شیدائی اقبال اور اقبال پر مزید کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب ناگزیر ہے مجھے۔ یقین ہے پروفیسر محمد منصور عالم صاحب کی یہ کتاب حلقۂ علم وادب میں پسند کی جائے گی اور بحث کے دریچے وا ہوں گے۔

نام کتاب: عہد رفتہ (شعری مجموعہ)، شاعر: رمضان علی سحؔر، اشاعت اول: مارچ ۲۰۰۸ء، قیمت: -/۵۰ روپے،
ناشر: اعظمی پبلی کیشن، پائپ روڈ، کرلا ممبئی ۷، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

رمضان علی سحر نوجوان شاعر ہیں۔ عہد رفتہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں ایک حمد ایک نعت شریف اور ۷۳ غزلیں شامل ہیں۔ جناب فیض الحسن صاحب نے سحؔر کے مختصر تعارف میں انہیں ''ایک خاموش شاعر جو صرف لکھنا جانتا ہے، سنانا نہیں جانتا''۔ متعارف کیا ہے۔ یہ خوبی سحر کو اس سے الگ کرتی ہے جس نے صرف سنانا اپنا وطیرہ بنا کر رکھا ہے۔ مہاراشٹر کالج شعبۂ اردو کے جناب محمد عالم ندوی نے زیر تبصرہ کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے اور سحر کے شاعری کے اوصاف اشعار کے حوالے سے درج کیے ہیں۔ ''غزل کا سحر اور سحر کی غزل'' عنوان سے ڈاکٹر شبیر رسول کا مختصر مگر جامع مضمون اس مجموعہ میں شامل ہے جس میں شاعر کی فکری وسیلے سے گفتگو کی گئی۔ ''صدائے دل'' کے عنوان سے سحر نے اپنے اساتذہ اور مجموعہ میں مدد دینے والے حضرات کا شکریہ ہے۔ کیا ہے آخر میں اپنے اس مجموعہ کو صم، بکم، عمی کی تفسیر بتایا ہے۔

''عہد رفتہ'' کا مطالعہ خوش گوار احساس کو جگاتا ہے۔ نوجوان شاعری کی فکری کمندیں کہاں کہاں ڈالی گئیں ہیں اشعار سے عیاں ہیں۔ ان کے یہاں سادگی ہے جو متاثر کرتی ہے۔ روایت کی پاسداری قدم قدم پر دکھائی پڑتی ہے۔ مشاہدات و تجربات آج کے ہیں اور اس کا بیان پرکاری لئے ہوئے ہے۔ ان کے بعض اشعار ناہموار معاشرہ پر طنز کی شکل میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ رمضان علی سحر نو وارد ادب ضرور ہیں لیکن ان کے اشعار امکانات کے وسیع آسمان کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے ان کی وسعت فکر، اور انداز بیان کے سلسلے میں اچھی رائے قائم ہوتی ہے۔ بعض اشعار دامن تھام لیتے ہیں۔ اس مجموعہ سے منتخب اشعار پیش ہیں جن سے ان کی تفعن طبع کا اندازہ ہوگا:

یادوں کے قافلے میرے ہمراہ تھے سدا
میں زندگی میں اکیلے تنہا نہ ہو سکا

کتنا نادان ہے میرا دوست
چھوڑ کر گاؤں اب وہ شہر جائے گا

ہے بس میں میری نیند نہ قابو میں میرا دل
رہ رہ کے ترا خواب پریشان کرے گا

موت اور زیست میں فاصلہ کچھ نہیں
آدمی سوچتا ہے کہ مہلت ہے سب

ہے نہ کوئی زمین و مکان
لحہ لحہ کہے الاماں

مکمل کرتا ہوں ہر بات کو بہتر بناتا ہوں
بدن وہ سب بناتے ہیں، میں اس پر سر بناتا ہوں

جب کہ تدبیر میں کمی نہ کروں
پھر بھی تقدیر کو اٹل لکھوں

اس زیست کی کہانی بڑی مختصر رہی سمجھا جو زندگی کو مجھے موت آگئی
کھوگئی ہے کہاں پھول کی دلکشی اب درختوں کے سائے کہاں گم ہوئے

متاثر کن گٹ اپ میں یہ مجموعہ قارئین پسند کریں گے اور سحر کے اولین نقش کو سراہیں گے۔

رسالے کا نام: اثبات سہ ماہی۔ جلد: ۱، شمارہ: ۱۔ مدیر: اشعر نجمی، مراسلت کا پتہ: اثبات، پوسٹ باکس نمبر ۴۰، شانتی نگر پوسٹ آفس، میرا روڈ ایسٹ، تھانے -۴۰۱۱۰۷۔ قیمت: -/۵۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

اثبات کا پہلا شمارہ پوری تب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اشعر نجمی نے نقش اول میں قارئین کی دلچسپی کا پورا خیال رکھا ہے۔ ادب کے ساتھ ادب کیلئے عنوان سے اداریے میں ایک مثبت فکر وعمل کی چاپ سنائی پڑتی ہے اس میں اردو رسائل وجرائد کو درپیش مسائل مختصر مگر پوری طاقت سے رکھے گئے ہیں۔ اس میں شمس الرحمٰن فاروقی سے غیر مشروط تعاون کا ذکر در آیا ہے اور مرحومہ جمیلہ فاروقی کو خراج عقیدت کے طور پر جناب فاروقی کی ۱۲ غیر مطبوعہ غزلیں شامل اشاعت ہے۔ ان غزلوں میں تازگی احساس اور پاکیزہ جذبات بطور خاص متاثر کرتے ہیں۔ مضامین میں جارج لوکاش کے مضمون کا ترجمہ ٹیگور کے ناول کے حوالے سے ایک سودمند بحث کی شکل میں موجود ہے۔ فضیل جعفری نے اختر الایمان کی نظم ''یادیں'' کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ اقبال اور لینن کو فکری تناظر میں عمران شاہد بھنڈر نے قاری کو روبرو کیا ہے۔ ناصر عباس نیر کا مضمون ''بدلتی دنیا میں ادب اور تنقید'' باذوق قاری کو بہتر معلومات فراہم کرتا ہے۔ ندیم احمد کا مضمون ''جدید تنقید: منصب اور طریق کار کی جستجو'' تنقید کے جڑے کئی سوالات کا احاطہ کرتا ہے۔ مضمون نگار نے معتبر حوالوں اور مثالوں سے تنقید کے طریق کار کی جستجو کی ہے۔ ''اواخر صدی میں تنقید پر غور خوض'' کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی کا پر مغز مضمون اثبات کے مشمولات میں چار چاند لگاتا ہے۔ غزلیات میں سید امین اشرف، ظفر گورکھپوری، کاوش بدری، سعادت سعید، سحر انصاری، عبدالاحد ساز، شاہین، کشن کمار طہور، فرید پربتی، جمیل الرحمٰن، راحت حسن، صدر ہمدانی وغیرہ کے کلام شامل ہیں۔ گیبرئیل گارسیا مارکیز پر خصوصی مطالعہ قارئین کے لئے تحفہ سے کم نہیں ہے۔ رضوان واسطی کی رباعیاں، کے سچدانند، خورشید ناظر، پنچھی جالونوی، سعید احمد، تابش کمال، اور شکیل اعظمی کی نظمیں اثر رکھتی ہیں۔ منشایاد، سلطان جمیل نسیم اور حسین الحسن کے افسانوں کی تاثیر کا تعلق براہ راست مطالعہ سے ہے۔ پریم چند کا دو مضمون پھر سے پڑھ کر کئی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ محاسبہ میں ظفر اقبال نے ناصر کاظمی کی شاعری سے بحث کی ہے۔ ناصر بغدادی نے ''نوک نیزہ پہ حرف حق'' بچی کھردری اور فکر انگیز تحریر ہے۔

کل ملا کر اثبات کا پہلا شمارہ بھرپور مواد پر محیط قابل مطالعہ اور خوبصورت ہے۔ یقین ہے نقش اول کی طرح اگلے شمارے بھی ادب میں ادب کے ساتھ، ادب کے لئے اور ادب کے ذریعہ زندہ رہنے والے ادیب وقارئین کو مسرور کرتے رہیں گے۔ اشعر نجمی صاحب کو اس عمدہ جریدہ کے لئے مبارک باد۔

کتاب کا نام: کشتِ دیگراں، مؤلف: ڈاکٹر عبرت بہرائچی، سال اشاعت: درج نہیں، پتہ: ناظرہ پورہ، بہرائچ (یوپی)، قیمت: ۵۰/- روپے، ناشر: ظفر عزیز، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

عبدالعزیز خاں عبرت بہرائچی کے شعری ونثری تصنیفات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قلم ان تھک پرورش پا رہا ہے۔ جس عمر میں لوگ لکھنا پڑھنا چھوڑنے لگتے ہیں ڈاکٹر عبرت بہرائچی تازہ دم ہیں۔ ان کی تقریباً تیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی شاعری کا دامن بہت وسیع ہے۔

''کشت دیگراں'' عبرت بہرائچی پر اہل قلم حضرات کے مضامین کا مجموعہ ہے جس کو خود عبرت بہرائچی نے ترتیب دیا ہے۔ تلخ حقیقت کے عنوان سے انہوں نے دو صفحات پر اردو کی موجودہ صورتحال کو آئینہ کرتے ہوئے اسے زندہ رکھنے کے لئے چند مشورے دیے ہیں۔ ان کا یہ مشورہ واقعی قابل عمل ہے کہ بچوں کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کر زبان وتہذیب کا مستقبل تشفی بخش بنایا جاسکتا ہے۔

اس مجموعہ مضامین میں مشاہیر ادب کے کل سولہ مضامین اور چار خطوط شامل ہیں۔ ڈاکٹر عالم سرحدی، سید خالد محمود، ماسٹر شفیق احمد باغبان، محمد مزمل شاہ شاہین، محمد حسین مسکی، ڈاکٹر قمر رئیس، آذر بارہ بنکوی، جمال احمد صدیقی، ایم۔زیڈ احسان، مہربان کاشی پوری، انصار نگروری، بیکل اتساہی، راج کمل گپتا برگ گل، رفیق رضا، غلام علی شاہ اور حاجی انور علی کرانی نے عبرت بہرائچی کی شاعری اور نثر نگاری کو مختلف عنوانات کے تحت روشن کیا ہے۔ مضامین سے ڈاکٹر عبرت بہرائچی کے فکر وفن کا ایک خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے۔

کتاب جلد میں نہیں ہے مگر پیپر بیک بھی اچھا ہے۔ آخری صفحے پر مصنف کی کتابوں کی فہرست ہے۔ یہ کاوش عبرت شناسی کی راہ میں معاون ہوگی۔

کتاب کا نام: نعتیہ بیت بازی، انتخاب: مختار بدری، سن اشاعت: جولائی ۲۰۰۷ء، مرتب کا پتہ: ایوان رحمت، ۲، رحمت اللہ اسٹریٹ، کرشنگری، ۶۳۵۰۰۱، قیمت: درج نہیں، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

مختار بدری صاحب کی مرتب کتاب ''نعتیہ بیت بازی'' اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اول یہ کہ اردو میں بیت بازی پر کتابیں کم ہیں اس پر سے طرہ نعتیہ بیت بازی، کوشش بسیار کے باوجود ناامیدی ہاتھ آتی ہے۔ مختار بدری نے اس کمی کو پورا کرنے کی سعی کی ہے۔ نعتیہ اشعار پر مختص یہ کتاب مرتب کے تجربہ کار ذہن کی عکاس ہے۔ انہوں نے ''مجھے کچھ کہنا ہے'' میں لکھا ہے: ''اس زبان کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا شعری سرمایہ بڑا زرخیز ہے۔ اس کے شعروں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔'' یقیناً اردو اشعار کی دلفریبی اور دلکشی غیر اردو داں کو بھی اپنا گرویدہ بنائے ہے۔ مختار بدری نے اس مجموعہ اشعار میں بیت بازی کا طریقہ بھی بیان کیا ہے اور اپنے گھروں، محفلوں اور تعلیمی اداروں میں نعتیہ بیت بازی کو فروغ دینے کی التجا کی ہے۔

اس انتخاب میں الف سے ی تک سے شروع ہونے والے عشق رسول میں ڈوبے ہوئے اشعار، شاعر کے نام کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے آخری حصے میں احادیث رسول کا انتخاب

عنوان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ''نعتیہ بیت بازی'' کا پیش کش عمدہ ہے۔ ہر صفحے کے آخر میں خوبصورت گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ اہل ذوق حضرات کے گھروں میں اس طرح کی کتابیں کارآمد ہیں جو ادبی ذوق وشوق ابھارنے میں معاون ہوگی۔ مختار بدری مبارک باد کے قابل ہیں کہ انہوں نے ایسا نقش چھوڑا ہے جس کی تقلید سے فائدے ہی فائدے ہیں۔ اس کتاب کا تقسیم کار فرید بک ڈپو دریا گنج، دہلی ہے۔

کتاب کا نام: نئی جہتیں (شاعری)، شاعر: مختار بدری، پہلی اشاعت: نومبر ۲۰۰۷ء، قیمت: ۱۰۰ روپے،
تقسیم کار: فرید بکڈ پور (پرائیویٹ) لمیٹڈ، دریا گنج، نئی دہلی-۲، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

مختار بدری ایک ایسے فن کار کا نام ہے جس کی شاعری میں ہر جا زندگی کی جلوہ گری ہے۔ انہوں نے مدراس جہاں تامل زبان کا سکہ رائج ہے گیسوئے اردو کو شاداب بنائے رکھا ہے۔ اردو سے محبت ہے کہ انہوں نے وسیلۂ اظہار کیلئے اسی زبان کو چنا ہے۔ گرچہ انہوں نے تامل میں بھی لکھا ہے مگر ''سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کا ہے'' کی وجہ کر شاعری کے جواہر یہاں بکھیرے ہیں۔ 'نئی جہتیں' ان کی شاعری کا مجموعہ ہے اس میں گیارہ نعتیں، ایک سلام، ۴۸ غزلیں، متفرقات کے تحت اشعار، چند نظمیں اور نظامت کے منظوم انداز بیان شامل ہیں۔

''نئی جہتیں'' پڑھنے کے بعد رقیہ محوی کی باتیں سچ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے مطابق: ''سادگی اور تجربہ (مختار کے یہاں) ہے۔ کہیں کہیں رومان کی ہلکی چاندنی سے تخیل کی فضا جگمگا اٹھتی ہے۔'' مختار بدری نے تازگیٔ فکر کے ساتھ بڑی ہی سادگی سے جذبۂ دل کو صفحہ قرطاس پر اتارا ہے۔ انہوں نے سینکڑوں مشاعروں کی نظامت کی ہے اس لئے برجستہ اور برمحل اشعار کا انتخاب ان کے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس کا رنگ بھی شاعری میں در آیا ہے۔ ''نئی جہتیں'' سے منتخب اشعار پیش ہیں:

ہم عشق کے جلوؤں میں رہے محو کچھ ایسے
یہ بھی نہ رہا یاد کہ تم اتنے حسیں ہو

شجر میں گھونسلہ ہے گھونسلے میں چار چوزے ہیں
یہ منظر ہم نے جب دیکھا تو بچے یاد آئے ہیں

وہ جو ہیں باشعور ان کے لئے
سارے غم اچھے ہر خوشی اچھی

خاک یک مشت رہیں میری نظر میں صدیاں
کیا انہیں یاد نہیں وعدۂ موعود مسیح

کندھے پہ لیکے خود ہی صلیب آگیا ہوں میں
اب کیا زمانہ میرا تعارف کرائے گا

سب پیمبر فلک پہ ہیں خاموش
اور قیامت بپی ہے دنیا میں

لفظ آشنا ہے میری ذات
سامنے بولتے ہوئے اوراق

جریدہ کا نام: محاسبہ۔ (شعبۂ اردو، للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کا ترجمان)،
جلد: ا، شمارہ: جنوری تا دسمبر ۲۰۰۸ء۔ مدیر: رئیس انور۔ قیمت: ۵۰ روپے۔ مبصر: ڈاکٹر مجیر آزاد، دربھنگہ

کسی بھی تعلیمی ادارے کا ترجمان وہاں کی علمی، ادبی وترقیاتی سرگرمیوں پر محیط ہوتا ہے۔ یہ وابستگان

ادارہ کی کاوشوں اور ان کے اثرات کی پہچان اور تعین قدر کا ذریعہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات اس کے دامن میں افادیت کے لئے اتنے پہلو سما جاتے ہیں کہ اس کو دستاویزی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں شعبہ اردو کے آغاز سے اب تک پہلی بار 'محاسبہ' (ترجمان شعبہ اردو) کا شائع ہونا ایک خوشنما احساس سے کم نہیں ہے۔ محاسبہ کے مدیر پروفیسر رئیس انور صاحب نے شذرات کے عنوان اس جریدہ کو منظر عام پر لانے کے سبب کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''کوئی تین سال قبل شعبۂ اردو کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد اس کی کارگزاریوں کا جائزہ لینا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ مختلف محاذوں پر محدود دائرے میں ہی سہی شعبہ فعال رہا ہے مگر نئے کورسیز کی ابتدا اور طباعت واشاعت دو ایسے گوشے ہیں جہاں اب تک کوئی کام نہیں ہو سکا ہے اور یہی احساس شعبہ کے اس ترجمان کا محرک بن گیا''۔ (ص:۴)

شذرات کے مطالعہ سے محاسبہ کے مشمولات کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ مضامین کا خاکہ ذہن میں ابھرنے لگتا ہے۔ مدیر محترم نے مضامین پر تاثراتی نگاہ بھی ڈالی ہے جس سے قاری کو مطالعہ کی سمت کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ اس جریدہ میں کل تیرہ مضامین شامل ہیں ان کے مضامین کی نوعیت شعبہ اردو کے علمی وادبی تحریک وسرگرمی پر محیط ہے۔ پروفیسر شاکر خلیق (سابق صدر شعبۂ اردو) نے قیام متھلا یونیورسٹی اور شعبہ اردو سے وابستگی کو صفحہ قرطاس پر پھیلا دیا ہے۔ اس مضمون سے شعبہ کے ساتھ یونیورسٹی سے ان کا دیرینہ تعلق اور جذباتی لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی (سابق پروفیسر شعبہ اردو) نے شعبہ کی یادوں کو حسین ودلکش الفاظ ادا کئے ہیں یہ ان کا ہی کمال ہے کہ یادوں کو بھی موزونی عطا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دیرینہ کار کے ساتھ ساتھ شاگردوں کو بھی یاد کیا ہے۔ یونیورسٹی میں اردو کے تدریسی نظام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر ظفر سعید نے کالجز کے سال تاسیس اور وہاں منظور شدہ اردو یونٹ اور کام کر رہے اساتذہ، ان کے عہدہ اور تقرری کی تاریخ کے ساتھ یہ ثبوت فراہم کیا ہے کہ اب بھی ۴۳ کالجوں میں اردو یونٹ نہیں ہے اور ۹ کالجوں میں اردو کے لکچرر کی جگہ خالی ہے۔ یہ ایک ڈائرکٹری ہے۔ ڈاکٹر محمد ارشد جمیل نے شعبہ اردو کی تاریخ اور یہاں کے عملے پر عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ پروفیسر رئیس انور صاحب کا دو معلوماتی مضمون ''شعبہ اردو کی مولانا آزاد چیئر'' اور ''شعبے کی سیمینار لائبریری'' شامل اشاعت ہے، جن سے کئی دھند لکے چھٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ارشد جمیل نے شعبۂ اردو کے ساتھ اساتذہ کی تدریسی اور تحریری کارگزاریوں کو اپنے مضمون میں بیان کیا ہے۔ ''شعبہ کی علمی وادبی سرگرمیاں'' کے تحت ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی نے شعبہ کے ذریعہ منعقد سمینار و سمپوزیم کا ذکر کرتے ہوئے اسے نیک شگون بتایا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ساقی نے شعبے کی مجلس ادب کو فوکس کیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم صاحب نے ''شعبہ اور شہر کا ادبی تال میل'' کے عنوان سے ایک دستاویزی مضمون قلمبند کیا ہے۔ انہوں نے اس مضمون کے ذریعہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ شعبہ اور شہر کے ادبی مزاج میں خواہ جتنی بھی چشمکیں رہیں اس کا اثر اساتذہ اور شعبہ کی کارکردگی پر نہیں پڑا۔ مضمون میں جن نظموں کو پیش کیا گیا ہے یہ ہجویہ شاعری کے نمونے ہیں۔ بعض نظمیں

تیکھی ہیں اور یاد ماضی کو تازہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے لکھا ہے:

''شعبہ اردو اور وہاں کے اساتذہ پر اس طرح کے حملے ہوتے رہے اس کے باوجود شعبہ اردو کا تقدس برقرار رہا اور یہاں سے ہونہار طلبا فارغ ہوتے رہے''۔ (ص: ۵۴)

جمال اویسی نے ''ہمارے اساتذہ'' کے عنوان سے شعبۂ اردو کے دوران تعلیم اپنے اساتذہ کو یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے بھی ''زہے استاذ'' کی شہ سرخی سے شعبہ کے اساتذہ کو بطریق احسن یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر صاحب نے شعبہ کے فارغ التحصیل قلمکار طلبا کی ادبی کاوشوں کو قلمبند کیا ہے۔ انہوں نے اپنے علاوہ جمال اویسی، ڈاکٹر امام اعظم، خالد عبادی، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر آفتاب اشرف، مجیر احمد آزاد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مبین صدیقی، ڈاکٹر سہیل اختر، ڈاکٹر سلطان احمد وغیرہ کے اسمائے گرامی سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ شعبہ اردو کے طلباء علمی وادبی نہج پر یہاں کا نام روشن کر رہے ہیں۔

مجموعی طور پر 'محاسبہ' دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ نقش اول اتنا جامع، وقیع اور معیاری ہے کہ شعبۂ اردو کے وہ تمام گوشے روشن ہو گئے ہیں جس پر بہت پہلے فوکس ہونا چاہئے تھا۔ اس اہم کارنامے کے لئے شعبہ اردو کے اساتذہ بالخصوص پروفیسر رئیس انور مبارکباد کے قابل ہیں۔

نام کتاب: پس نوشت (کہانیاں)، مصنف: قیصر تمکین، اشاعت: ۲۰۰۷ء، قیمت: ۲۰۰ روپے،
رابطہ: شہزادہ، بی ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔ مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

قیصر تمکین کا کہانوی مجموعہ ''پس نوشت'' ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں شاعری بھی نہیں ہے اور دنیا کی کسی نامعلوم حقیقت سے آشنائی بھی نہیں کرائی گئی ہے۔ کسی ازم سے بھی متاثر نہیں آتی ہیں یہ کہانیاں۔ اس عہد میں ایسی کہانیوں کا شائع کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ کہانی کا حق ادا کرنا اور شاعری اور کہانی کے درمیان حد فاصل کھینچنا آسان ہے لیکن کہانی اور شاعری کے ساتھ رہ کر ان تمام ٹیکنکس کا انکار کرنا پھر بھی کہانی کہنا ایک دشوار کام ہے۔ کہانی کہنے کا فن اس وقت دشوار ہو جاتا ہے جب گرد و پیش سے ہٹ کر محض تخیلی گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں۔ ایسی کہانیاں بھی بڑی بوجھل ہو جاتی ہیں جن کے لئے ماتھا پچی کرنی پڑتی ہے جن کے الفاظ بھی بے ربط ہوتے ہیں۔ اسے شکوہ نہیں حقیقت کے آئینے میں دیکھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ادب جمالیاتی حسیت کا متقاضی ہے کہانی میں اس حسیت کی کچھ زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ قیصر تمکین نے کہانی کیوں لکھی، کس کے لئے لکھی اور کیسے لکھی یہ سب تلاش کرنا بے سود ہے، ان کی کہانی میں معاشرہ کا وہ ہر پہلو موجود ہے جس سے ہم روز دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ خاموش رہتے ہیں۔ کچھ سوالیہ نشان ابھرتے ہیں۔ جواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بس ایسا ہی ہوتا ہے اور تمام اصول وضوابط کی پابندیاں بھی محض دکھاوے کی صورت یا رسم ادائیگی کی نیت سے کی جاتی ہیں۔ جس کی حقیقی بنیاد ہی غائب ہوتی ہے۔ ہم بھی وہ ساری باتیں سوچتے ہیں جو قیصر تمکین نے سوچا ہے لیکن وہ سلیقہ اظہار جو

اس افسانہ نگار میں ہے وہ تحیر نہیں ایک نا معلوم خلاء میں لے جاتا ہے۔ جہاں پر چیز گڈ مڈ ہو جاتی ہے۔ اختیاری اور بے اختیاری کلمات کے اندر سچائیوں کا ایک بہتا سیلاب اس پر اٹھتی ہوئی جھاگیں جیسے سمندر کو کفن پہنا رہی ہوں۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جو لہریں اٹھتی ہیں وہ پہاڑوں سے کیوں ٹکراتی ہیں۔ کیا پہاڑوں کا سینہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے یا لہروں کو اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہوتا کیوں کہ وہ لوٹ جاتی ہیں اور وہ سمندر کا جز و بن جاتی ہیں کچھ اسی طرح کی کہانیاں ''پس نوشت'' میں شامل ہیں۔

احتجاج کرنے کا حق جمہوریت میں تو ہے لیکن سماج کی اجازت نہیں ہوتی۔ سینکڑوں سوال کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسی صورت میں بے بس اور لاچار صرف سوالوں کے گھیرے میں قید رہتا ہے اور آزادی کی پسپائی کسی نئے آئین کو تشکیل دینے میں ناکام۔ ماتم اس کا نہیں ہے کہ زندگی کے ان معصوم سوالوں کو جواب مل جائے۔ سوال یہ ہے کہ سوال کے اندر سوال کا یہ دراز سلسلہ چلتا رہتا ہے اور ہم قتل گاہوں میں ماتمی سناٹوں سے گھبراتے ہیں۔ عادی ہو جاتے ہیں اور اس میں مبہوت ساری ذہنی کثرت کر کے بے چینی کا سرمایہ سمیٹ لیتے ہیں لیکن قیصر تمکین نے بے چینی کے سرمایہ کو کہانی کا موضوع بنا یا دیا ہے اور وہ موضوعات ہمارے گرد و پیش میں جس صورت بھی ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں ان کے بے باکانہ احتجاج کی جرأت عام آدمی میں نہیں ہوتی۔ اسی سے پردہ اٹھانے کا اور ڈراپ سین ہونے کا عمل قیصر تمکین کی کہانیوں میں جاری وساری رہتا ہے۔

روسی مفکر کے اس قول کے مطابق تنقید نگار ایک ایسی مکھی ہے جو گھوڑے کو ہل چلانے سے روکتی ہے۔ قیصر تمکین بھی تنقید نگاروں کو یا تنقید نگاروں کی اجارہ داری کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی رواں دواں تحریر میں سماج کے ٹوٹتے بکھرتے رشتوں، بدلتے ہوئے پس منظر اور زندگی کے شکست وریخت کی داستان قلمبند کرتے رہتے ہیں۔

قیصر تمکین کا اپنا اسٹائل ہے اور یہی اسٹائل ان کو منفرد بناتا ہے۔ تجسس کا پہلوان کی کہانیوں میں ہے لیکن وہ تجسس کہانیوں کے ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ایسے کم ہی کہانی کار نظر آتے ہیں جو تجسس کو دو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک کہانی کے اندر پیوست تجسس اور کہانی کی دلچسپی برقرار رکھنے کا تجسس۔ یہ ساری ٹیکنیک قیصر تمکین کی کہانیوں استفتا، مسجد تو بنا دی، حلال گوشت، حرام خور، پس نوشت، بھو بھل، ختنے کے لڈو، چراغ تلے، ننھا دیوتا، ردعمل میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔

نام مجلہ: ''مخزن'' (۷)، اشاعت: ۲۰۰۸ء، مرتب: مقصود الٰہی شیخ،

رابطہ: ۲۴ پارک ہل ڈرائیو براڈ فورڈ بی ڈی ۸ او ڈی الف (یو کے)، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

برطانیہ سے شائع ہونے والے ''مخزن'' کا ساتواں شمارہ پیش نظر ہے۔ اس رسالہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مدیر جناب مقصود الٰہی شیخ پروڈکیٹو لٹریری کام میں یقین رکھتے ہیں۔ اس لئے محض شاعری اور کہانوی ادب پر ہی توجہ نہیں دیتے وہ Productive Outcome کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایسی تخلیقات کو شامل کرتے ہیں

جن سے اردو زبان و ادب کا بھلا ہو۔ نئے فکری رجحانات سامنے آئیں، بدلتے ہوئے عالمی منظرنامے میں اردو کی اپنی پہچان ہو سکے اور قاری کو اردو کے سلسلہ سے کوئی پیغام پہنچ سکے نیز تحریک مل سکے۔ اس رسالہ کا ایک خاص مزاج و معیار ہے اور وہ بخوبی نبھانے میں کامیاب ہیں۔ سادگی اور سلیقہ کے ساتھ حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے ادبا و شعراء کی تخلیقات کو مناسب مقام عطا کرتے ہیں۔ اداریہ بھی موضوعاتی خلاء کو پر کرنے کے لئے تحریر فرمایا ہے اور ضروریات کو مد نظر رکھا ہے۔

یہ رسالہ ایک طرح کی مہم جاتی کاوش ہے اور اس سے اردو ادب اور اردو زبان کے فروغ میں خاصی مدد ملے گی۔ مدیر موصوف قابل مبارک باد ہیں وہ اردو کے لئے ایسا ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔ برطانیہ میں اردو درسیات کے معاملات اور شمالی امریکہ میں اردو درسیات کے مسائل کے علاوہ معاشرے میں زبان کے کردار پر بہترین مضامین شامل اشاعت کئے گئے ہیں۔ ہم عصر افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ساتھ ان کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی افسانہ نگار اور تجزیہ نگار دونوں کا تعارف بھی شامل ہے۔ یہی معاملہ شعراء اور ان کی شاعری کا بھی اس طرح اسے ایک دستاویزی حیثیت بھی حاصل ہوگئی ہے۔

نام کتاب: خاکے، مصنف: عوض سعید، صفحات: ۱۴۹، مصحح: سید جمال اللہ قادری، اشاعت: دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶ء، ناشر: ڈاکٹر اوصاف سعید، رابطہ: اردو اکیڈمی جدہ، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

عوض سعید اردو کے معروف افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، شاعر اور خاکہ نویس میں شمار کئے جاتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے کہ: ''عوض کو قریب سے دیکھنے کے بعد میرا کچھ ایسا اندازہ ہے کہ اس کے افسانے عام افسانہ نگاروں کی طرح اس کے تجربات و مشاہدات کا عکس ہی نہیں ہیں بلکہ اس کی شخصیت کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔'' ص:۶

خاکہ لکھنا ایک مشکل فن ہے کیوں کہ شخصیات کے متعلق ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہوئے لطف زبان بھی باقی رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ خاکے میں جو سب سے زیادہ ضروری وصف ہے وہ رواں دواں تحریر ہے۔ اس کے علاوہ قاری کی دلچسپی برقرار رہے اس کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ عوض سعید نے اس کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ مخدوم محی الدین کے خاکے میں لکھتے ہیں: ''شاذ نے کہا چہرہ دیکھ کر خوش ہونے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملالیں اور کہیں کہ آپ کے ہزاروں مداحوں میں ہم بھی ایک ہیں۔'' (ص:۸) یہ بات مخدوم کی شخصیت کو اور بھی بلند بنا دیتی ہے اور مخدوم کے اندر کی خوبصورتی کا پتہ دیتی ہے۔ خورشید احمد جامی کے خاکے میں لکھا ہے: ''وہ عجیب و غریب انداز میں ہنس رہا تھا اور اسکے تتبع میں سامنے بیٹھے ہوئے اس کے شاگرد بھی بے پناہ انداز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ جب کھنکتے ہوئے قہقہے آہستہ آہستہ کھوکھلے ہونے لگے تو اس نے شیروانی کی نچلی جیب میں بڑے ہی پراسرار انداز میں ہاتھ ڈالا، پھر فاتحانہ انداز میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹیبل پر کاغذوں کا ایک پلندہ آگیا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ یہ شخص کچھ کرتب دکھائے گا۔ یا پھر غزلیں سنائے گا۔'' (ص:۲۳) عالم

خوند میری کا خاکہ لکھتے وقت ان کا انداز دیکھئے: ''سنا ہے کہ اب مسز عالم نے انہیں کچھ چھوٹ دے دی ہے۔جس کے نتیجے میں اب عالم صاحب کے بینک اکاؤنٹ میں ڈپازٹ کے علاوہ بھی کچھ رقم رہنے لگی ہے۔'' (ص: ۳۳)

سلیمان اریب کے خاکہ میں لکھا ہے: ''میں نے ایک دن اس سے پوچھا'' اریب میں آخر کیا کشش ہے جو لوگ اس سے ملنے کے لئے مچلتے ہیں۔'' جواباً اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا'' پیارے وہ بڑا نفیس آدمی ہے۔ایک دم نفیس'' (ص: ۴۱)

قاضی سلیم کے بارے میں یوں فرماتے ہیں: ''شاعری جتنی نکھر رہی ہے، گمنامی اتنی ہی بڑھتی جارہی ہے، بے تکلف محفلوں میں ان کا کہا ہوا یہ دلچسپ جملہ آج بھی گونجتا ہے۔'' (ص: ۵۱)

اقبال متین کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اقبال متین کے لئے میرے دل میں کوئی محبت نہیں ہے۔بھلا ایسے بے وقوف آدمی سے کون محبت کرے گا جو سب ہی کو برابر چاہتا ہو۔'' (ص: ۵۷)

مغنی تبسم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''مغنی کی شخصیت کا ایک جز ان کی اپنی ''نرگسیت'' بھی ہے۔'' (ص: ۶۵)۔جیلانی بانو پر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: ''.......مگر وہ اپنی کہانیوں اور کتابوں کے ذکر سے اپنے آپ کو یوں محفوظ رکھیں گی جیسے وہ افسانہ نگار نہیں کوئی اور مخلوق ہوں۔'' (ص: ۷۹)

عزیز قیسی کے خاکہ میں فرماتے ہیں: ''مرنا اگر ہے تو یہاں مستقلاً آجاؤ، اور ساتھ میں نواب کو بھی لے آؤ، مزہ آجائے گا۔'' (ص: ۸۳)۔وحید اختر کے بارے میں دوٹوک اور حقیقت پر مبنی بیان دیکھئے: ''وحید اختر سے مل کر آپ کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوگی، کیوں کہ شدید دل آزاری اور اپنے مقابل کسی بھی آدمی کو کمتر اور حقیر سمجھنا اس کا وصف خاص ہے Igo کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے عہد کے کسی بھی ادیب اور شاعر کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔'' (ص: ۸۴)

اور خاکوں میں شامل تمام شخصیتوں کا احاطہ جس انداز سے عوض سعید نے کیا ہے وہ خاکے کے فن میں اضافہ ہے۔کیوں کہ برملا کوئی بات کہنا اور اندر کی شخصیت کو باہر نکالنے کا ہنر اگر خاکہ نگار کو آتا ہے تو وہ شخصیات کی تہیں کھولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ شخصیت کے ساتھ انصاف بھی کرتا ہے اور اسے لافانی بھی بنا دیتا ہے اور یہ سلیقہ عوض سعید کو خوب آتا ہے۔

انہوں نے فن خاکہ نگاری کو وسعت بخشی ہے۔اردو اکیڈمی جدہ سے یہ مجموعہ شائع ہوا ہے اور ان کے لائق فرزند اوصاف سعید اس خاکے کے مجموعہ پر پیش لفظ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اپنے والد ماجد مرحوم کی مختلف تصنیفات میں سے ''خاکے'' ایک منفرد نوعیت کی کتاب ہے۔جس میں اردو شعر و ادب کی چند عظیم شخصیات کے بارے میں بڑے ہی دلچسپ انداز کی تحریر ملتی ہے۔''

ان کے لائق صاحبزادے ڈاکٹر اوصاف سعید کی ادب پر گہری نظر ہے جو انہیں ورثہ میں ملی ہے۔

❀❀❀
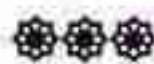
ڈاکٹر عبدالمنان طرزیؔ فیض اللہ خاں، دربھنگہ-۴ (بہار)

عکسِ ہستی

(ڈاکٹر وقار صدیقی کا شعری مجموعہ)

''عکسِ ہستی'' کتاب ایک شعری — لائے حضرت وقار صدیقی
اُن کی غزلوں کا ہے یہ مجموعہ — جو ''سخن بازناں'' سے اب نکلی
نظم، سہرا، غزل تو قطعے کچھ — نقش اپنی جگہ ہیں خوب سبھی
ایک شعر و سخن کے عامل کا — جیسے ہو یہ عمل بھی تسخیری
لفظ و معنی کی ہے یہ خلد بریں — حور جیسے زمیں پہ ہو اُتری
فن شاعر کو مل گئی معراج — آبِ زر سے حدیثِ شوق لکھی
صفحہ صفحہ نشاط افزوں ہے — موجِ کوثر کہ سلسبیل کوئی
جیسے خیام کا ہو میخانہ — جیسے حافظ کا شوقِ مے نوشی
اتنا آراستہ ہے ہر مصرع — پالکی میں ہو مہ جبیں بیٹھی
دشمنِ جاں، جمال ہے جس کا — سادگی بھی ہے جس کی زیبائی
یہ کرم بھی خدا کا ہے ان پر — پاگئے ہیں وقار صدیقی
ہو مبارک جنابِ والا کو — یہ عروسِ سخن کی گل پوشی
رقص میں ہے خیال کی ندرت — کیف پرور ہے جام اسلوبی
نقش سارے بصیرت آگیں ہیں — معتبر ہوگئی ہے دانائی
علم وفن کی ہے وادیٔ ایمن — لفظ ومعنی بساطِ جلوہ گری
عکس سازیٔ قامتِ جاناں — ہوش لوٹے جمالِ محبوبی
فکر تازہ کی ایسی قوسِ قزح — ماہ وش لے رہی ہو انگڑائی
معجزہ ہے یہ لفظ ومعنی کا — روح جس نے صنم میں ہے پھونکی
یہ قبائے عروسِ فن ہے جناب — ریشمی، اطلسی وکم خابی
فکرِ شاعر کا یہ حسیں اظہار — کوئے جاناں میں چاندنی نکھری
یہ اضافہ گراں ہے اردو میں — فکر و فن کا اثاثۂ شعری
آگہی کی یہی گراں دولت — ہے امانت بھی اپنی تہذیبی

ملکۂ شعر کی بھی اے طرزی
۹۵ ۵۷۰ ۳۰ ۱۷ ۱۱ ۲۲۶ = ۹۳۹
دیکھ کیسی ردا ہے زربفتی
۳۹ ۱۰۰ ۲۰۵ ۱۵ ۶۹۹ = ۱۰۵۸+
۲۰۰۷ء

راہ و رسم

❁ **پروفیسر قمر رئیس،** (وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی): تمثیل نو کا تازہ شمارہ ملا، اس بار بھی آپ نے قارئین کو ایک نئے میدان کی سیر کرائی ہے۔ سہرا اردو کی تہذیبی روایات کا ایک حصہ ہے، جواب معدوم ہوتا جارہا ہے۔ اکابرین اور معتبر شعرا نے سہرے لکھے ہیں جیسا کہ آپ نے دکھایا ہے۔ سہرا نویسی پر آپ نے بعض اچھے مضامین بھی شامل کردیئے ہیں، بلاشبہ اب یہ ایک یادگار مجلہ بن گیا ہے۔

❁ **فضیل جعفری** (ممبئی): 'تمثیل نو' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ رسالے کے بیشتر مندرجات لائق مطالعہ ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ کا رسالہ دوسروں کے ساتھ ساتھ علاقائی ادیبوں اور شاعروں کی بھی بھرپور نمائندگی کر رہا ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ تادیر جاری رہے۔

❁ **فدا فاضلی** (ممبئی): ماہنامہ 'تمثیل نو' کا نیا شمارہ ملا۔ بہت بہت شکریہ! دربھنگہ کے مختصر قیام کے دوران آپ سے مختصر اً ملا بھی ہوں۔ آپ ایسے دور دراز علاقہ میں ادبی سطح پر کافی فعال ہیں، پرچہ مجھے اچھا لگا۔ مواد اور اس کے انتخاب میں آپ کی محنت نمایاں ہے۔

❁ **حسن امام درد** (دربھنگہ): ''تمثیل نو' ایک عام رسالے سے الگ ایک دستاویزی سلسلہ ہو گیا ہے۔ گذشتہ کئی سال سے ادب، تہذیب اور تاریخ کے اہم موضوعات پر مبنی شمارے تواتر سے آرہے ہیں۔ جن کے لئے صرف ادبی بصیرت، علم و آگہی اور تحقیقی مزاج ہی نہیں بلکہ محنت شاقہ اور لگن ضروری ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ پرچہ 'جنگ آزادی کی ۱۵۰ویں سالگرہ پر' اور اس کے بعد ''سہرے کی روایت اور ادبی معنویت'' پر شائع ہوئے۔ ان کی اردو دنیا میں منفرد حیثیت ہے۔ ان دونوں سے ماقبل بھی اکثر شمارے کی یہی حیثیت تھی۔ مجھے گذشتہ پرچے کے چند تبصروں پر اپنے تاثرات پیش کرنے ہیں۔

''گیسوئے تنقید'' ڈاکٹر امام اعظم کے ادبی مضامین کے مجموعے کا ابواللیث جاوید نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ کیا ہے اور بڑے ہی خوشگوار انداز میں اس پر اپنا تاثراتی تبصرہ پیش کیا ہے۔ امام اعظم کی خوبی یہ ہے کہ ادبی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ صرف ادبی موضوعات پر مضامین ہی نہیں بلکہ شخصی مضامین میں بھی یہی رویہ شامل ہے۔ سب سے اہم مضمون مولانا ابوالکلام آزاد، ہندوستانی تعلیم کے معمار ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ! ''گرم سورج کا لہو'' ڈاکٹر منصور عمر کا شعری مجموعہ ہے، ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے، زبان وادب کے تمام اصناف پر ان کا قلم اعتماد اور وقار کے ساتھ چلتا رہا ہے۔ اب رہی بات اس مجموعہ شعری کی تو عرض کر دوں کہ بعض شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کے کلام کا انتخاب نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ہر شعر ایک گہرے سوچ، مشاہدے پر مبنی ہے جو اپنی معنوی جہات پر قاری کو دعوت فکر دیتا ہے۔ امام اعظم نے اس مجموعہ کلام پر حسین اور پر مغز تبصرہ کیا ہے۔ طرزی جناب..... مناظر عاشق ہرگانوی نے ۴۵ تاریخی تصویروں کے ساتھ پروفیسر عبدالمنان طرزی کے تعلق سے منظوم البم شائع کیا ہے۔ کتاب کے مختصر ہونے کے باوجود اس کی بھی ایک تاریخی حیثیت ہوگئی ہے۔ خصوصاً طرزی صاحب کا منظوم زندگی نامہ اہم اس لئے ہے کہ اس سے پہلے

طرزی صاحب نے اپنی ذات سے پردہ نہیں اٹھایا تھا۔ کتاب پر ڈاکٹر امام اعظم کا تبصرہ بڑا مبسوط اور جاندار ہے۔
آہنگ غزل۔ پر ڈاکٹر مجیر آزاد نے تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ اور اس کتاب کی خوبیوں کو اجاگر کر دیا ہے۔
چار سو شعراء کرام کی مختصر کیفیت اشعار اور فوٹو کو اکٹھا کر دینا اور پھر اسی خوبصورتی سے رنگین مصور کتاب شائع کرنا میں سمجھتا ہوں ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ اس قسم کی طباعت شدہ کتاب بیسویں صدی کے اوائل میں دیوان سعادت پیغمبر پوری شائع ہوئی۔ پھر میری نظر سے ایسی کتاب نہیں گذری اس کے لئے طرزی صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اسی سال ایک منظوم تبصرہ ''قامت'' کے نام سے شائع ہوا ہے جو منور رانا کے فکر و فن پر منظوم اظہار خیال ہے۔ طرزی صاحب کی پہلی کتابوں کے برعکس اس میں منور رانا کی تمام تخلیقات کا تعارف اور سیر حاصل تبصرہ ہے۔

❁ **ڈاکٹر امین اشرف** (علی گڑھ): ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ (سہرا نمبر) آپ نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے نکالا ہے۔ میں نے پہلی بار کسی ادبی رسالے میں سہرے کی معنویت وادبیت پر ایسے وقیع مضامین دیکھے ہیں۔ غالب اور ذوق کے بعد بھی بہت سے شاعروں کے اشعار آپ نے حوالے کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مشاہیر علم و اداب کی وفات پر قطعات لکھنے میں ڈاکٹر منصور عمر کو فن کارانہ مہارت حاصل ہے۔ یہ معمولی فن نہیں ہے اور ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ مولانا ولی رحمانی کا مضمون دعوت فکر دیتا ہے۔ پڑھنے کی چیز ہے۔ غزلیں اور نظمیں بھی خوب ہیں۔ آپ کو یہ خوب سوجھی کہ آپ نے شعر و ادب کا ''سہرا نمبر'' نکالا، واقعہ یہ ہے کہ سہرا بھی ادب یعنی شعری ادب کی ایک صنف سخن ہے۔ کم لوگوں نے اس پر دھیان دیا ہے۔ غالب اور ذوق کے سہرے تو ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔

❁ **کرامت علی کرامت** (کٹک): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ (جلد ۸، شمارہ ۳) موصول ہوا۔ آپ نے ''سہرا۔ خصوصی مطالعہ'' کا باب قائم کر کے اپنی اختراع پسند طبیعت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اس سلسلے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ موصوف کا مضمون ''اردو میں سہرے کی معنویت'' نہایت معلوماتی اور فکر انگیز ہے۔ میری شادی خانہ آبادی کی تقریب میں مظہر امام صاحب نے مسدس کی شکل میں جو سہرا لکھا تھا وہ شاید آزادی سے لے کر اب تک لکھا گیا سب سے بہتر سہرا ہے۔ یہ سہرا موصوف کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے۔ اس کی ایک نقل میں آپ کو اور بھائی مناظر عاشق صاحب کو بھیج دوں گا تا کہ آپ لوگ کسی نہ کسی طرح اسے محفوظ کر لیں۔ خالد رحیم کی شادی کے موقع پر ڈاکٹر حفیظ اللہ نیو لپوری نے ملک بھر کے بڑے شاعروں سے سہرے لکھوا کر انہیں کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر نیو لپوری کو کہا ہے کہ اس کا ایک نسخہ بھی آپ کو بھیج دیں۔ پروفیسر سید منظر امام صاحب کی خودنوشت نہایت دلچسپ ہے اور انشائیہ کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ منظر کاظمی واقعی بڑے پیارے انسان تھے۔ اس کے علاوہ بہت اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ لیکن اردو والوں کی گروہ بندی اور صوبائی تعصب نے انہیں ابھرنے نہیں دیا۔ آپ نے میری کتاب ''شاخ صنوبر'' پر مختصر مگر جامع تبصرہ شائع کیا ہے۔

❁ **مقصود الٰہی شیخ** (لندن): تازہ ''تمثیل نو'' مل گیا ہے، یہ آپ کی کاوشوں، جدت اور معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تحسین کے لئے الفاظ کم پڑیں گے۔

❁ **اقبال انصاری** (دہلی): ''تمثیل نو'' کا ہر شمارہ کسی نہ کسی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ پیش نظر شمارے کو آپ نے اس کے سر سہرا باندھ کر اپنے قارئین کی محفل میں پیش کیا ہے۔ میرے مختصر سے علم میں اس سے قبل کسی مدیر نے نہ یہ ''حرکت'' کی ہے نہ ایسی جرأت۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (اردو میں سہرے کی معنویت)، پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق (سہرا نویسی)، پروفیسر مجید بیدار (شاعری میں سہرا اور اس کی عصری معنویت) کے مضامین تحقیقی ہیں اس لئے خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی اور پروفیسر شاکر خلیق کے مضامین دلچسپ ہیں۔ ضیاء الرحمٰن غوثی بڑے مخلص اور بے حد سلجھے ہوئے صاحب قلم ہیں۔ ان کا ایک صفحے کا مضمون ''کملیشور اپنے ایک خط کے آئینے میں'' جہاں ان کی پر خلوص صاف گوئی کا آئینہ ہے وہیں ہندی کے عظیم قلم کار مرحوم کملیشور کی انسانی قدروں کا مظہر بھی ہے۔ رفیق شاہین ہمیشہ بہت گہرائی تک محسوس کر کے موضوع کو شعر میں ڈھالتے ہیں اس لئے سنجیدہ اور باشعور قاری کو ہمیشہ ہی متاثر کرتے ہیں۔ حفیظ انجم کریم نگری کی غزل ''بیر رکھتا ہے اپنے مونس سے'' اور انوار فیروز (پاکستان) کی غزل ''وہ خوش ہے آج میرے چمن کو اجاڑ کر'' ذاتی تجربات کی دیانتدارانہ شعری ترسیل کی تصوریں ہیں۔ انوری بیگم کی ''پرواز'' بہت بلند ہے۔ چوں کہ ''نظم'' ہے اس لئے نسیم سحری کے ایک معطر جھونکے کی طرح ہے۔ نظم انتہائی فکر انگیز ہے اور حسیت کا اظہار بڑی اثر انگیز خوبی کے ساتھ کرتی ہے۔ شمارے کی ان تخلیقات جنہیں کچھ دانشور ''نثری نظم'' کہتے ہیں، کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا رسالہ ہے، بنام ''جدید تر ادبی رجحانات کی ترجمانی'' آپ اس سے بھی آگے جا کر کچھ بھی شائع کر سکتے ہیں۔ اللہ آپ کو اچھا رکھے۔

❁ **جتندر بلّو** (لندن): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ یاد آوری کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ مزید خوشی اس واسطے بھی ہوئی کہ میرے افسانوی مجموعے ''چکر'' پر محترم فیاض احمد وجیہہ کا تبصرہ بھی شامل ہے۔ گو کہ تبصرہ فکر انگیز ہے لیکن مختصر ہونے کے کارن تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔ کاش موصوف نے تفصیل کا سہارا بھی لیا ہوتا؟ یہ میں اس نقطہ نظر سے لکھ رہا ہوں کہ ''چکر'' میں شامل کہانیاں مشرقی ادب، مغربی تہذیبوں کے براہ راست تصادم سے تعلق رکھتی ہیں اور بیرون ملک میں آباد اردو کے کسی مصنف نے ان موضوعات کو چھونے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ بہر حال آپ کا اور فیاض احمد وجیہہ صاحب کا بے حد شکریہ۔

❁ **گلشن کھنہ** (لندن): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ مجھے چند روز پہلے دستیاب ہو گیا تھا۔ اس کرم فرمائی کے لئے میں صمیم قلب سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ پیش نظر شمارہ اردو سہرے سے متعلق ایک دستاویز ہے جسے پا کر مجھے از حد مسرت ہوئی۔ یوں تو اس میں شامل بھی مضامین عمدہ ہیں مگر پروفیسر عبدالمنان طرزی کا مضمون ''سہرے کی ادبی معنویت'' مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ اس شمارے کا شعری حصہ بھی قابل قدر اور قابل مطالعہ ہے۔

❁ **ابواللیث جاوید** (نئی دہلی): ''تمثیل نو'' کا اکتوبر ۷ تا جون ۸ کا شمارہ ملا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اس میں پڑھنے اور جاننے کے لئے بہت کچھ ہے۔ اُردو صنف شاعری میں مختلف اصناف سخن مثلاً مثنوی، مرثیہ، رباعی، نظم، غزل، قطعہ وغیرہ کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہے جسے آج کے دور میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت امیر خسروؒ کی پہیلیاں، مکریاں بہت عام تھیں اور عوام میں اسے مقبولیت بھی حاصل تھی مگر رفتہ رفتہ یہ فن

سخن مندمل ہو گیا اور آج نہیں کے برابر رہ گیا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف صنف سخن کو عروج حاصل ہوا اور شاعری کسی ایک مقام پر ٹھہر نہیں سکی۔ آپ نے سہرا کی روایت اور اس کی اہمیت پر جو ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے وہ آپ کی طبیعت کی جدت پسندی ہی ہے ورنہ ان پرانی روایتوں کی طرف مڑ کر دیکھنے کی کس کو فرصت ہے۔ مرزا غالب اور ذوق کے سہروں کی ایک تاریخی اور ادبی حیثیت ہے۔ یہاں تک کوئی دوسرے شعراء نہیں پہنچ سکے حالاں کہ دوسرے اہم شاعروں نے بھی سہرے کہے ہیں جیسا کہ آپ نے اپنے اداریے میں جمیل مظہری، پرویز شاہدی، اجتبیٰ رضوی، محسن در بھنگوی، طاہر علی شاکر کلکتوی، مظہر امام، منظر شہاب، وقار صدیقی، انجم فرخ آبادی، قاری محمد داؤد طالب اور افتخار اجمل شاہین کا ذکر کیا ہے۔ اسی اداریہ میں تقریب شادی کے موقع پر شائع ہونے والے تقریباً تیس گلدستوں کا بھی آپ نے ذکر کیا ہے جو میرے خیال میں مکمل فہرست نہیں ہے۔ یہ فہرست خالصتاً صوبہ بہار سے متعلق ہے مگر بنگال، یوپی، حیدر آباد، بھوپال، بمبئی ریاستوں میں بھی شوق سے سہرے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ سہرا کے خصوصی مطالعہ کے تحت آپ نے تمام معتبر قلم کاروں سے مضامین لکھوا لیے ہیں۔ یہ ایک اچھا ادبی کام ہے۔ اس بار شعری حصہ بھی جاندار ہے۔ میری نظموں کے علاوہ تمام نظمیں معیاری ہیں۔ غزلوں میں عموماً معیاری غزلیں ہیں۔ احمد تنویر کی غزل ایک مدت کے بعد کسی رسالہ میں نظر آئی ہے۔ ایک زمانہ تھا (۷۵،۷۴ کا) کہ احمد تنویر ہر ادبی معیاری رسالہ میں نظر آتے تھے خواہ غزل کے ساتھ یا افسانہ کے ساتھ۔ مشاعروں کے نہایت پسندیدہ شاعر تھے اور سامعین انہیں بار بار سننا پسند کرتے تھے۔ ان کی ایک غزل تو اتنی مقبول ہوئی تھی کہ اسے لوگ ہر مشاعرہ میں فرمائش کر کے سنتے تھے۔ اس غزل کا مطلع کچھ یوں ہے:

جانے کیسی بادلوں کے درمیاں سازش ہوئی
میرا گھر مٹی کا تھا، میرے ہی گھر بارش ہوئی

اس بار کتابوں پر تبصرے بھی خوب سے خوب تر ہیں۔ رسالہ ماشاءاللہ بے حد جاندار ہے۔ خدا آپ کے حوصلے بلند رکھے، آمین

❁ **سید جعفر امیر** (امریکہ): ''تمثیل نو'' جلد ۸، شمارہ ۳ وصول ہوا۔ میری کتاب ''کا گیرونگی'' پر سلطانہ مہر صاحبہ کا مضمون صفحہ ۱۰۲ پر پڑھا۔ شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ انہوں نے کتاب کا بہت جامع اور معقول تجزیہ کیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح تمثیل نو کا یہ شمارہ بھی خوبصورت مضامین اور شاعری کا گلدستہ ہے۔

❁ **سہیل غازی پوری** (کراچی) ''تمثیل نو'' موصول ہوا، اس شمارے میں سہرے کے حوالے سے جو مضامین اور اشعار شامل کیے گئے ہیں واللہ آپ مبارک باد کے لائق کہ ایسی صنف جو معدوم ہو رہی ہے اسے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور آپ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

❁ **سلطانہ مہر** (لندن): ''تمثیل نو'' کا شمارہ اکتوبر 07 تا جون 08 ملا۔ محترمہ نعیمہ ضیاء الدین، آصف طارق بھائی اور سید مظفر شعیب ہاشمی کے افسانے بہت خوب ہیں اور فاروق راہب صاحب کا مختصر افسانہ بھی بڑا جاندار ہے۔

❁ **پروفیسر محمد محفوظ الحسن** (گیا): ''تمثیل نو'' کا ہر شمارہ آپ کی فکر کی ندرت کا غماز

ہے۔ ہر بار کچھ نیا کرنے اور کچھ نیا کر دکھانے کی خواہش اور جذبے نے تمثیل نو کی محض تزئین و آرائش میں ہی اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ ادب کی مختلف اصناف کو نئے تناظر میں دیکھنے کی راہ بھی ہموار کی ہے، اس کا بین ثبوت تازہ ترین شمارہ ہے۔ سہرا نگاری کی ابتدا کب کس نے اور کیسے شروع کی؟ اس تحقیق میں گئے بغیر یہ تو بہر حال کہنا ہی پڑتا ہے کہ اس کی ادبی معنویت وافادیت کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی معنویت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ غالب اور ذوق کی سہرانویسی کی تو بات ہی الگ ہے آج بھی جو سہرے لکھے جارہے ہیں ان میں ممکن ہے بہتوں میں ادبیت کی چاشنی نہ ملے مگر مخلصانہ جذبات کی رنگینی تو اس میں سے جھانکتی ہی ہے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جن فن پارے میں خلوص ہوگا وہ اپنی سادہ بیانی کے باوجود اثر انگیز ہوگا۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے سہرا نگاری اور اس کے تعلق سے مختلف محاوروں اور سہرا کی تاریخ جس طرح جمع کرنے کی کوشش کی ہے وہ نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ قابل تقلید ہے۔ عبدالمنان طرزی نے اپنی زندگی کے حوالے سے سہرے کی معنویت وافادیت جس طرح واضح کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ بالخصوص ان کے مضمون کی آخری سطر ہی تو خون دل میں ڈبو کر لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمجید بیدار، طلحہ رضوی برق، اور دوسرے مضمون نگاروں نے بھی سہرے کے فن سے متعارف کرانے کی اچھی کوشش کی ہے۔ اس سے سہرا نگاروں کو مہمیز ملے گی اور سہرے کی قدر و قیمت کی تعین کی راہ ہموار ہوگی۔ سہروں میں ایک جانب سنجیدگی، سادگی، صفائی، خلوص اور پاکیزہ جذبات کا اگر اظہار ہوتا ہے تو بعض سہرانویس نے مزاحیہ سہرے بھی لکھے ہیں جن سے سہرے کی سماجی معنویت اجاگر ہوتی ہے۔ میرے ایک استاد مولانا محمد حنیف عزیزی مرحوم ایک مزاحیہ سہرا سنایا کرتے تھے جس کا مجھے صرف ایک شعر ہی یاد رہ گیا ہے۔ اس سہرے میں طویل عمری کی شادی کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ سہرا پوتے کی زبانی دادا کا سہرا ہے۔ مجھے نہیں معلوم یہ سہرا کس کا ہے، کس کے لئے لکھا گیا اور کس نے لکھا ہے مگر اس سہرے میں جو دو نام آئے ہیں وہ میرے شہر کے ایک مخیر رئیس اور ان کے بیٹے کے ہیں۔ اس میں سچائی کہاں تک ہے یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، اس کی تفصیل استاد محترم مرحوم نے کبھی بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی تو آپ بھی وہ شعر سن لیجئے:

سہرا بنا کے لایا ہوں دادا کبیر کا
کہنا نہ مانا باپ نے بیٹا ضمیر کا

"دادا کبیر اور بیٹا ضمیر" یہ دو ٹکڑے ایسے ہیں جن کی معنویت، اشاریت اور تہداری کا جواب نہیں۔

❁ **محمد ھارون سیٹھ سلیم** (بنگلور) تمثیل نو کا تازہ شمارہ جو سہرے کے موضوع پر تو دل پذیر مقالات پر منحصر ہے واقعی لائق داد و تحسین ہے، میں نے بالاستیعاب غائر مطالعہ کیا اور محظوظ ہوا۔ تمثیل نو کے محاسن اظہر من الشمس ہیں۔ مشاہیر ادب نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں (ویسے آج کل سہرے کا فقدان ہے) تمثیل نو میں مشمول ہر مضمون مطمح نظر ہے پُر مغز مضامین سے لبریز یہ مجلہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اس کے خریدار لاکھوں میں ہوں۔ اور قارئین اربوں کھربوں میں۔ تمثیل نو کے لئے صدق دل سے میری یہ دعا ہے۔ آپ جیسی فعال و روح رواں ہستی نے صحافت کا نام بلند کیا آفریں صد آفریں۔ خدا کرے کہ ہند و پاک کے دیگر صحافیوں میں بھی آپ جیسے گن ہوں تا کہ اردو کا چراغ یوم رستخیز تک زندہ و تابندہ رہے۔ خدارا اسے غلو و تعلی نہ سمجھیں یہ نفس الامر ہے جسے میں نے آشکار کیا۔ تمثیل نو کی ستائش میں چند توصیفی اشعار حاضر خدمت ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

توصیفی قطعہ

صحافت کی دنیا کا سرخیل نو ہے میری نظر میں وہ تمثیل نو
ہے بھارت کی دھرتی پہ تنزیل نو سمجھ لیجئے گا ہے انجیل نو
یہ انجیل نو اک بڑی چیز ہے نیا نام اس کا ہے تمثیل نو
پڑھا میں نے اس کو تو ایسا لگا ہے اردو ادب کی یہ تشکیل نو
اسے کیوں نہ چاہیں گے اہل قلم ہے شعر و سخن کی یہ تکمیل نو
خدا کی عنایت ہے اس پر سلیم ادب کا خزانہ ہے تمثیل نو

❁ **ڈاکٹر محمد منصور عالم** (گیا): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ اردو میں سہرا نگاری پر خصوصی مطالعہ پیش کر کے آپ نے ایک بڑی ضرورت کو پیش کیا ہے۔ یہ تو باضابطہ ایک تحقیق کا موضوع ہے۔ کیوں کہ ہم اس بات سے کم ہی واقف ہیں کہ اردو سہروں میں ہمارے شاعروں نے کیسے کیسے احساسات و جذبات پیش کئے ہیں۔ سہرا نگاری تو اردو شاعری کی ایک صنف رہی ہے لیکن اس کو عموماً غیر سنجیدگی سے لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں شاعری قائم کرنے کے بڑے مواقع ہیں۔ البتہ رشتے داروں کے ناموں کا اندراج ایک سخت رکاوٹ ہے جو شعرا کی طبع رواں میں حائل ہوتی ہے۔ ''تمثیل نو'' کے اس خصوصی مطالعے میں جن حضرات نے حصہ لیا ہے انہوں نے اختصار میں بڑی معلوماتی باتیں لکھی ہیں۔ سہرا اور شادی کی نسبت سے جو پیغام تہنیت ملتا ہے وہ زندہ دل شعرا کو حجلۂ عروسی کی کشمکش اور کیفیت کا جشن منانے کی بھی دعوت دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ازار کشائی اور ازار بندی کے پسینہ چھڑا دینے والے مراحل کا شاعرانہ بیان بھی ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ برادر محترم و گرامی قدر پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ محمد طلحہ رضوی برق نے اس طرف محض اشارہ کیا ہے۔ وہ اس راہ کے عارف ہیں اور الحمدللہ اس صنف کے شاعر بھی ہیں۔

❁ **مشتاق احمد نوری** (چھپرہ): ''تمثیل نو'' کا شمارہ ۳ پیش نگاہ ہے۔ آپ نے اس شمارہ میں ایک ایسی صنف پر نگاہ ڈالی ہے جسے شاعری میں منکوحہ کا نہیں بلکہ رکھیل کا درجہ حاصل ہے۔ آپ نے درست فرمایا کہ ''شاعری محض اظہار جذبات اور فکری تجربوں کا نام نہیں ہے۔ یہ کبھی کبھی ضرورت بھی بن جاتی ہے۔'' اس کی سب سے بڑی مثال قصائد کا ہونا ہے، آخر وہ بھی تو ضرورت کے تحت کی گئی شاعری ہی ہے۔ میرے خیال سے 'سہرے' کو ایک صنفی درجہ عطا کرتے ہوئے اسے مستند بنانے کے سمت میں آپ کی یہ پہل یاد رکھی جائے گی۔

اس بار کہانی کے حصے نے ایک خاص تاثر چھوڑا۔ فاروق راہب نے مختصر کہانی 'ضمیر کی عدالت' میں آخر تک سسپنس بنائے رکھا۔ یہ ان کی تحریر کا خاص وصف ہے۔ محترمہ نعیمہ نے 'پیک دان' میں عورت مرد کے اس رشتے کی کہانی بیان کی ہے جس پر کم بحث ہوتی ہے۔ زندگی جب اتار پر ہوتی ہے تو عورت کو کن پریشانیوں سے گذرنا ہوتا ہے اس پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ ''پیک دان'' عنوان دے کر انہوں نے مرد کے جابرانہ عمل کو اشارے کنایے کے ساتھ.......... انداز میں بھی بیان کیا ہے۔ مصور سبزواری کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

مصور اس کو بتاتے ہیں زانیہ سب لوگ
کنوئیں میں اپنے جو سب نیکیاں گراتی ہے

آصف الرحمٰن طارق نے ''غلغلہ'' میں ضمیر ماموں کے کردار پر خاصی محنت کی ہے۔
مظفر شعیب ہاشمی کی کہانی متاثر کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ حیرت ہے پوری زندگی پولیس جیسے جابرانہ محکمہ میں گذارنے کے بعد بھی ان کے اندر کا کومل فنکار زندہ رہ گیا۔ انہیں نہ صرف کہانی کہنے کا سلیقہ معلوم ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کہانی بنت کس طرح کی جائے۔
کہکشاں پروین کی کہانی کی عورت آج کی کہانیوں میں اہم کردار ادا کر رہی ہے عورت چاہے تو ے پر کی ہو، یا گھر میں گھٹنے والی اس کی نفسیات کہکشاں خوب جانتی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ ان کی کہانیوں کی عورت کبھی کمزور نہیں ہوتی وہ نہ صرف زمانے سے لڑنا جانتی ہے بلکہ اپنی بات منوانے کا سلیقہ بھی اسے آتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے نسائی کردار پر الگ سے بحث کی گنجائش ہے۔ ''یہ سرگذشت ہی ہے'' منظر امام اپنی شگفتہ تحریر سے قاری کو اپنی گرفت میں لینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ وہ اتنی معصومیت سے بڑی سے بڑی بات کا ذکر کر جاتے ہیں کہ کہنا پڑتا ہے کہ: اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔ ان کی یادداشت بھی حیرت انگیز ہے۔ واقعات کی جزویات نگاری پر بھی انہیں ملکہ حاصل ہے۔ منظر کاظمی کا ایسا نقشہ انہوں نے پیش کیا کہ وہ اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ سامنے آگئے۔ میرے بھی ان کے تعلقات تھے میں بھی ان کی انکساری اور محبت کا قائل رہا۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ پٹنہ کے ایک ہوٹل میں ان کی ایک کریم کلر کے شال کی میں نے تعریف کردی بس کیا تھا انہوں نے اسے بھی پیش کردی میں بڑی مشکل سے ان کی شال لوٹانے میں کامیاب رہا۔ منظر کاظمی کی بہت سی صفتوں کا انکشاف انہوں نے بڑے معصومانہ انداز میں کیا ہے ان کی تجاہل عارفانہ بھی قابل داد ہے۔ آپ کے رسالے کا تبصرہ اور خطوط کا کالم بھی توجہ مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔

❁ **رونق شہری** (دھنباد): ''تمثیل نو'' مل رہا ہے۔ تازہ شمارہ سہرا نویسی کی روایت پر بھرپور مواد فراہم کرتا ہے سہرے کے ہی حوالے سے غالب نے اپنی سخن فہمی کو چیلنج کی شکل میں پیش کیا تھا۔ ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ☆☆ دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا''۔ میں پہلا مصرع اس قدر جاندار ہے کہ ادب کے منجملہ اصناف پر تنقیدی رویوں اور اس کے معیار کو ظاہر کرنے میں غالب کا مصرعۂ اول تکیہ کلام بن کر رہ گیا ہے۔
پروفیسر سید منظر امام کی خودنوشت جہانِ دیگر کی سیر کرانے میں کامیاب ہے۔

❁ **احسان ثاقب** (نوادہ): سہرے کا۔ 'خصوصی مطالعہ' مختصر سہی مگر ان مضامین سے سہرے کی معنویت مستحکم ہوئی ہے۔ سرورق پر غالب اور ذوق کا سہرا چھاپ کر آپ نے صنف سہرا کی ادبی اہمیت بڑھادی ہے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے......'' کے تحت آپ نے جن ممتاز شعراء کے حوالے پیش کیے ہیں اب کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ سہرا ایک نیم ادبی صنف سخن ہے۔ اردو اور اردو کی مختلف اصناف سخن کے تعلق سے فی زمانہ موشگافیاں ہوئی ہیں جب کبھی کوئی نیا تجربہ سامنے آتا ہے کچھ اردو کی سمت و رفتار طے کرنے والے ناقد بلا لحاظ اپنی قلمی انفرادیت منوانے کا عمل شروع کردیتے ہیں۔ دوسری زبان کی طرح اردو کا بھی اپنا ایک کلچر ہے، تہذیبی مضمرات ہیں اور رنگا رنگی ہے۔ اہل ذوق نے ہر دور میں اس کے حسن و قبح پر نظر ڈالی ہے اور اس کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ فن کار پہلے تخلیق کا ماحول

دیکھتا ہے اسے کھنگالتا اور پرکھتا ہے پھر اپنے تجربات و مشاہدات سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ فن کار تو وہ آواز وہ لہک بھی سن لیتا ہے جو سماعت کی گرفت میں بھی نہیں آتی۔

کچھ لوگ غزل اور بندھی ٹکی نظم کو ہی اصول شاعری کا معیار و اعجاز مانتے ہیں ان کے مطابق دوسری اصنافِ شاعری میں تخلیقی جوہر دکھانے والے افراد کو غالباً ایک پناہ گاہ کی تلاش ہوتی ہے جو ان کی انفرادی شان کے لئے ہموار کر سکے۔ کولکاتا کے نسیم عزیزی نے اپنے قافلے کی نمائندگی کرتے ہوئے آگے لکھا ہے:

''ادھر چند برسوں قبل ماہیا نگاری کی ایک لہر اٹھی تھی جس کی زد میں شعراء کا ایک مختصر سا قافلہ بھی آ گیا تھا...... اردو کی سمت و رفتار پر نظر رکھنے والے چند اہل قلم نے اسے سہل پسندی سے تعبیر کیا بلکہ اس میں فکر و شعور اور کیفیتِ شعری کا بھی بہت حد تک فقدان محسوس کیا۔''

نسیم عزیزی صاحب کی نگاہوں سے شائد 'کوہسار جرنل' اور اردو کے دیگر معیاری رسائل وغیرہ نہیں گذرے ہیں ورنہ حالیہ برسوں میں نئی پرانی اصناف پر جو معرکۃ الآراء تجربے ہوئے ہیں اور اردو کی زمین پر جو گل بوٹے کھلے ہیں انہیں دیکھ کر شائد ان کی قلمی موشگافیوں کی قلعی کھل جاتی۔ جو افراد جانے بوجھے بغیر نقد و نظر کے آزمائشی پگڈنڈی پر دوڑ جاتے ہیں اور خود کو علامہ بننے کی کوشش کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ جگالی کم اور مطالعہ زیادہ کریں...... کولکاتا میں پہلے ڈاکٹر رضی ناطقی ہوا کرتے تھے جو بھی مضطر حیدری، اعزاز افضل، وکیل اختر حتیٰ کہ غالب اور اقبال میں عیوب تلاش کر کے لطف اندوز ہوتے تھے پھر ایسا ہوا کہ کانکی نارہ کے جناب چشم الرمضان نے جب ان کے فاسد مواد کو فنی حاشیے پر رکھ کر پوسٹ مارٹم کرنا شروع کر دیا تو ان کی اکڑ فوں دور ہو گئی۔ دراصل اردو نگری میں ایک ایسا گروہ ضرور ہوتا ہے جو کسی کمزور کندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھنے کی ہنرمندی دکھاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کلکتے کا وہی کند ذہن گروہ اس بار میاں نسیم عزیزی کو استعمال کر رہے ہیں۔

4 مئی 08 'آزاد ہند' 'اجالا' میں نسیم عزیزی کا مجھ خاکسار پر ایک مضمون چھپا ہے۔ جس میں انہوں نے میرے مختلف اصنافِ سخن کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں نسیم عزیزی کا تعلق بھی شاعر برداری سے ہی ہے اب اگر آج کے دور میں بھی مختلف اصنافِ سخن پر ان کی الرجی قدامت پسندوں کی طرح قائم ہے تو اسے افسوسناک ہی کہا جائے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ موصوف غزل، قصیدہ، رباعی پر طبع آزمائی کرنے کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن پر کچھ لکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ نسیم عزیزی اگر بہت بڑے فنکار ہیں تو ٹیڑھی میڑھی گفتگو سے ہٹ کر راست موضوع پر توجہ دیں۔

مجھے بھی اپنے کچھ بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں۔ آسنسول میں چالیس برس رہا۔ کبھی سہیل واسطی، کبھی محبوب انور، کبھی ڈاکٹر عابد ضمیر، کبھی مشتاق اعظمی، کبھی نذیر احمد یوسفی، کبھی مضطر عظیم آبادی، کبھی شمس ندیم اور کبھی رونق نعیم وغیرہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے کچھ سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی اور آج جبکہ ۵۔۶ سال سے ادبی اعتبار سے ایک بنجر علاقے میں ہوں۔ یہ دعویٰ نہیں کہ مجھ کو کسی پناہ گاہ کی تلاش ہے۔ لیکن اتنی خود اعتمادی تو مجھ میں

ضرور آگئی ہے کہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر فراز حامدی، ڈاکٹر امام اعظم، شارق عدیل، منیر سیفی، سید مشتاق احمد، نذیر فتح پوری، سیدہ نسرین نقاش، سیفی سرونجی، عادل اسیر دہلوی اور ڈاکٹر عبدالمنان طرزی وغیرہ مجھ کو فن کے اعتبار سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ''تمثیل نو'' کا مطالعہ میں کر رہا ہوں۔ خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں ہے اور رسالہ اردو زبان کی مختلف انداز میں خدمت کر رہا ہے۔

❁ **اقبال حسن آزاد** (مونگیر): ''تمثیل نو'' اکتوبر ۲۰۰۷ء تا جون ۲۰۰۸ء موصول ہوا۔ اب یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ''تمثیل نو'' اردو کے اہم ترین رسالوں میں سے ایک ہے۔ زیر نظر شمارہ کے مشمولات پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ آٹھ برسوں کی مختصری مدت میں اس رسالے نے کامیابی کی کئی منزلیں طے کر لی ہیں۔ آپ کا یہ انداز بھی منفرد ہے کہ ہر شمارے کو کسی ایک اہم موضوع سے منسوب کر دیتے ہیں۔ ''سہرا'' بلاشبہ اردو کی مقبول ترین صنف ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ غالب اور ذوق جیسے بلند پایہ شاعروں کی سرپرستی کے باوجود یہ صنف ادب میں وہ مقام حاصل نہ کر سکی جس کی یہ مستحق ہے۔ امید کی جانی چاہئے کہ اب اس صنف پر خاطر خواہ توجہ کی جائے گی۔ اگر اس موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا گیا تو یقیناً تمثیل نو کا یہ شمارہ اس کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اس بار مضامین متنوع اور عمدہ ہیں۔ مجتہد العصر مولانا محمد ولی رحمانی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر کا مضمون ''کیا ۱۸۵۷ء کی جدوجہد پہلی جنگ آزادی تھی؟'' اس لحاظ سے اہم ہے کہ آج جب کہ پورے ہندوستان میں بڑے زور و شور کے ساتھ ۱۸۵۷ء کو Highlight کیا جا رہا ہے، عوام کو یہ صحیح تاریخ سے آگاہ کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ دراصل یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے جس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں پر پردہ ڈال دیا جائے۔

❁ **ظفر مجیبی** (موتیہاری): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء تا جون ۲۰۰۸ء دستیاب ہوا۔ آپ کا ہر شمارہ ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلا شمارہ بھی جنگ آزادی کی یاد تازہ کر گیا۔ اس شمارہ کے لئے بھی آپ کو کافی تحقیق کرنی پڑی ہوگی تب جا کر وہ شمارہ ادبی دستاویز بن دنیائے ادب میں رونما ہوا۔ اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ اس شمارہ کو بھی سہرے کی معنویت سے اس طرح سنوارا ہے کہ اردو ادب میں آپ نے نئی روح پھونک دی ہے۔ ''تمثیل نو'' تاخیر سے ضرور منظر عام پر آتا ہے۔ لیکن ایک شان سے آتا ہے۔ آپ کا ہر شمارہ اپنی ایک الگ چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ مبارکباد قبول کریں۔ اس شمارہ میں اداریہ سے لیکر راہ و رسم تک سبھی معیاری ہیں۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا ''اردو میں سہرے کی معنویت'' کافی پسند آیا۔ اس مضمون میں موصوف نے کافی مشقت کی ہے اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک اچھے محقق و ناقد بھی ہیں۔ افسانوں میں فاروق راہب کا ''ضمیر کی عدالت'' سید مظفر شعیب ہاشمی کا ''احسان کا بوجھ'' ڈاکٹر کہکشاں پروین کا ''قاعدہ'' کافی پسند آیا۔ یہ سبھی افسانے سبق آموز ہیں۔ ان سارے اشعار میں شاعروں نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے سماج کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا ہے۔ کاش سماج کچھ سمجھ سکے۔ راہ و رسم میں سارے خطوط خوب ہیں۔ محترم وارث ریاضی صاحب نے برادرم تشنہ اعجاز کے مضمون پر اعتراض کیا ہے جو مناسب نہیں ہے۔ مولانا ریاضی صاحب کو میرا مشورہ ہے کہ مشرقی

چمپارن کے ادب نوازوں میں کچھ کمی ضرور ہے جس طرف تشنہ اعجاز نے اشارہ کیا ہے بغیر تحقیق ثبوت کے تشنہ اعجاز زبان قلم نہیں کھولتے۔ مثال کے طور پر عرض ہے کہ ۲۶ رمئی ۲۰۰۸ء کے قومی تنظیم میں بتیا کے ایک شاعر ابوالخیر نشتر کا ایک مضمون ''۱۹۶۰ کے بعد چمپارن کی شاعری'' میں انہوں نے کافی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ایک جگہ تو انہوں نے حد کر دیا کہ بتیا کے کچھ شاعر استادوں کی غزل لے کر مشاعروں میں پڑھا کرتے ہیں۔ موصوف اگر اتنا ہی دیانت دار تھے تو ان شعراء کا نام بھی ظاہر کر دیا ہوتا۔ تو اردو ادب، منتظم مشاعرہ پر احسان عظیم ہوتا۔ اب ریاضی صاحب کیا کہیں گے۔ تشنہ اعجاز صاحب نے جو بھی کیا تحقیق کرنے کے بعد ہی کیا ہے۔ اگر تشنہ اعجاز نے مشرقی چمپارن کو علم کا مرکز قرار دیا ہے تو کون سا گناہ کیا ہے۔ مشرقی چمپارن میں حضرت سید شاہ عزیزؒ، حضرت شاہ حلیمؒ، حضرت مولانا عترت حسینؒ جیسے بزرگ گذرے ہیں۔ وہیں ادب میں عترت ہرگانوی، پروفیسر اسمعیل وحشی، سید شاہ محمد مجیب شاہ عظیم آبادی، مولانا جاتی سیمابی، جمیل الرحمٰن جمیل، مظہر الحق مظہر صدیق بیدل، سید جلال الدین اکبر، شعیب شمس جیسے استاد فن گذرے ہیں۔ اشاعت کے سلسلے میں جتنے شعری مجموعہ وافسانے کے مجموعہ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مشرقی چمپارن اس سے کوسوں دور ہے۔ اگر مولانا وارث ریاضی صاحب کی باتوں پر توجہ دی جائے تو اس بحث کے آگ کی لپٹیں بہت دور تک جائیں گی۔ جس سے محبت نہیں نفرت کے چراغ روشن ہوں گے۔ اور اس گلستانِ ادب میں ہر سو گل کے بجائے خار نظر آئیں گے۔

❁ **حباب ھاشمی** (الہ آباد): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ (اکتوبر ۰۷ء تا جون ۰۸ء) موصول ہوا۔ باعثِ مسرت ہے کہ آپ اسے بیحد مشقت، جانفشانی اور عرق ریزی سے نکال رہے ہیں اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی سپر انداختہ نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے عزائم کو مزید استحکام اور استقامت عطا فرمائے۔ (آمین) ایسے حالات میں رسالہ کے معیار کو برقرار رکھنا بڑی بات ہے۔ زیر نظر شمارہ کئی اعتبار سے خاصا اور باوقار ہے اور یہ آپ کی مساعی جمیلہ کا آئینہ دار ہے۔ اداریہ 'سہرے' کی رسم کے حوالے سے اہم اور پر مغز ہے۔ آپ کے لحاظ سے یہ ایک مستقل صنف سخن جس کی روایت اور اہمیت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ آپ نے سہرے کی پوری تاریخ کھنگال کر رکھ دی ہے۔ 'سہرا' خصوصی مطالعہ کے ضمن میں نصف درجن سے زاید معیاری اور معلومات افزا مقالات نظر سے گذرے۔ دیگر مضامین بھی قابل قدر ہیں۔ افسانوں میں فاروق راہب اور مظفر شعیب ہاشمی بطور خاص پسند آئے۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی خوب ہے۔

❁ **افروز عالم** (کویت): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ روایتی آب وتاب کے ساتھ یہ شمارہ بھی قابل توجہ ہے۔ غالباً ''سہرا'' کے حوالے سے کسی رسالے کا یہ پہلا نمبر ہے۔ اداریے کو سہرا کے حوالے سے تحقیقی مضمون کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

❁ **رفیق شاھین** (علی گڑھ): ''تمثیل نو'' (جون تا اکتوبر ۰۸ء) ملا۔ سہرا پر خصوصی مطالعے کے تحت مناظر عاشق ہرگانوی، طلحہ رضوی برق، مجید بیدار، عبدالمنان طرزی، شاکر خلیق، احسان ثاقب اور مامون ایمن نے اپنے اپنے مضامین میں سہرے کی روایت اور اس کی حقیقت پر سیر حاصل معلومات فراہم کئے ہیں۔ پروفیسر سید منظر امام

کی خودنوشت ماضی کی سہانی یادوں کو جگا کر دل کو سوز و ساز سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ فاروق راہب، نعیمہ آصف الرحمن اور مظفر ہاشمی کے افسانے بامعنی اور دلچسپ ہیں۔ علیم صبا نویدی، رضوان اللہ اور راشد جمال فاروقی کی نظموں نے متاثر کیا۔ ڈاکٹر امام اعظم، مجیر احمد آزاد اور فیاض احمد وجیہہ نے کتب پر اجمالی طور پر بلیغ تبصرے کیے ہیں۔

❁ **غلام مرتضیٰ راہی** (فتح پور): ''تمثیل نو'' کا ہر شمارہ مشمولات کے لحاظ سے دستاویز ہوتا ہے۔ ہر ہوشمند قاری اسے سنبھال کر رکھتا ہوگا۔ آپ کے اجتہادی ذہن پر مجھے رشک آتا ہے۔ اب تک تمثیل نو میں جتنے بھی خصوصی گوشے اشاعت پذیر ہوئے ہیں تاریخ ادب میں ان کی معنویت اہمیت اور انفرادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مبارکباد

❁ **فرحت حسین خوشدل** (ہزاریباغ): اکتوبر ۰۷ تا جون ۰۸ء کا تمثیل نو موصول ہوا۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' میں اکثر و بیشتر آپ کچھ نہ کچھ نئی باتوں سے قاری کو روشناس کراتے ہیں۔ صفحہ ۳ تا ۲۱ پر آپ نے اتنی ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں کہ اگر اس کا تجزیہ کرنے بیٹھوں تو مراسلہ بشکل مکالمہ مقالہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ''تمثیل نو'' اسم بامسمیٰ ہے۔ نئی تمثیل، نیاپن آپ کی ذہنی اپج ہے۔ آپ کا یہ جملہ کہ ''زیر مطالعہ شمارہ سہرے جیسی نیم ادبی سخن کو ادبی معنویت بخشنے کے لئے اور اس صنف سخن کی ادبی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لئے قارئین کی نذر ہے'' واقعتاً آپ کی محنت رنگ لائی۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، مجید بیدار، عبدالمنان طرزی اور مامون ایمن صاحبان کے مضامین اس نوعیت کے ہیں جن کی تعریف بہرحال کرنی ہی پڑے گی۔ طلحہ رضوی برق صاحب کا دوسرا مضمون ''غالب و ذوق کے سہرے'' نہایت ہی عالمانہ مضمون ہے۔ ڈاکٹر منصور عمر صاحب نے قطعات تاریخ بروفات مشاہیر علم و ادب میں خاکسار کے استاد محترم جناب سید شاہ طیب ابدالی مرحوم جو لکھا ہے اس کو پڑھ کر پرانی یاد تازہ ہوگئی۔ یعقوب تصور کی لکھی حمد باری بہت پسند آئی۔ پروفیسر سید منظر امام صاحب کی ''یہ سرگزشت ہی ہے'' کو بڑے ہی انہماک سے پڑھتا ہوں۔

❁ **ڈاکٹر نسیم اختر** (وارانسی): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ جریدہ بہرصورت خوبصورت، خوب سیرت، لائق مطالعہ اور محفوظ کرنے کے قابل ہے۔ ''جنگ آزادی نمبر'' کے بعد ''سہرا نمبر'' واہ بھئی واہ! آپ تو چھکے پر چھکا لگائے جارہے ہیں! فتح مندی مبارک ہو! برصغیر میں 'سہرے' کی روایات کی جڑیں کافی مضبوط ہیں۔ اس دلنواز صنفِ سخن کے تعلق سے تلاش و تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ نے اس کی بسم اللہ کر دی ہے۔ افسانوں، غزلوں، مضامین، خودنوشت، تبصروں، اور خطوط، یہ سب کے سب فلکِ تمثیل نو پر آفتاب و ماہتاب، نجوم و کہکشاں کی مانند ضو پاش و ضیا بار ہیں۔ کتابوں پر تبصروں کا حصہ اس قدر بسیط ہے کہ اس حصے کو علاحدہ کر دیا جائے تو 'تعارف و تبصرہ' کے نام سے ایک رسالہ شائع ہو سکتا ہے۔ سالم صاحب کی کتاب 'بہارِ نو بہار' پر تبصرہ کرتے ہوئے برادرم ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے درست لکھا ہے کہ مظہر امام، شکیل الرحمن، منظر شہاب وغیرہ جیسے بلند پایہ ادباء و شعراء کو بہاریت کے دائرے میں محدود نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بہار کے ادباء و شعراء پر متعدد معتبر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر ہرگانوی، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر سید مجید بیدار، پروفیسر عبدالمنان طرزی، جناب

اقبال انصاری، نیر جہاں، سلطانہ مہر کے مضامین خصوصیت سے پسند آئے۔ ودیا ساگر آنند، اصغر بہرائچی، حامدی کاشمیری، سید شی رضوی، غلام مرتضٰی راہی کی غزلیں فنی وفکری ہر دو اعتبار سے خوب ہیں۔ اس شمارہ کے مخصوص شاعر- افتخار اجمل شاہین کی دونوں غزلیں حکایات دل کے پہلو بہ پہلو حکایات عہد رواں ہیں۔ چہ خوب! ماحصل یہ کہ عالم میں انتخاب ''تمثیل نو'' کے روپ میں یکے بعد دیگرے آپ اُردو شعروادب کا انسائیکلو پیڈیا پر کاشت (شائع) کررہے ہیں۔ ایک اہم بات یہ کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر کی حیثیت سے آپ اپنے دیار میں اُردو تعلیم کے فروغ کے لیے لائق تحسین کام کررہے ہیں۔

❁ **انوار فیروز** (روالپنڈی): ''تمثیل نو'' کا اکتوبر ۲۰۰۷ء سے جون ۲۰۰۸ء تک کا خوبصورت شمارہ موصول ہوا۔ اس پر 'ندائے وقت' روالپنڈی اسلام آباد نے مختصر تبصرہ شائع کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمثیل نو ایک معیاری علمی وادبی پرچہ ہے۔ اس بار آپ نے سہرا: خصوصی مطالعہ کے عنوان سے سہرا نویسی کے بارے میں اہم نگارشات شائع کی ہیں۔ پروفیسر سید منظر امام کی خودنوشت، افسانے اور غزلیں، غرض جو کچھ بھی شائع کیا گیا ہے وہ بے حد اچھا ہے۔

❁ **تشنہ اعجاز** (بگہا، مغربی چمپارن): تازہ شمارہ نظر افروز ہوا۔ آپ نے سہرے کے موضوع پر جو رسالے کو ترتیب دیا ہے کتنی محنت اور کوشش کے بعد یہ رسالہ منصۂ شہود پر آیا ہے اس کے لئے آپ کی ہمت جرأت لائق ستائش ہے۔ آپ نے اداریے میں جو باتیں کہی ہیں وہ دامن دل کو کھینچتا ہے۔ شادیات کے موقعے پر کیسے کیسے گلدستے ترتیب دیئے جاتے تھے ماضی میں سہرے کی کیا وقعت تھی یہ سب پڑھنے کے لائق ہے۔ اس بار حمد باری تعالٰی میں برادرم یعقوب تصور نے کافی متاثر کیا ہے ایک الگ انداز اور نئے فکر کے ساتھ وہ نظر آرہے ہیں۔ محمد فرحت حسین خوشدل نے نعت سرور کونین کہہ کر دل کو واقعی خوش کردیا ہے۔ جناب مناظر عاشق ہرگانوی نے اردو میں سہرے کی معنویت لکھ کر ایک نئے انداز میں علم وفکر کا چراغ روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی قبلہ نے سہرا نویسی پر جو مضمون پیش کیا ہے وہ قاری کو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، برادرم مامون ایمن وغیرہ نے کافی محنت کی ہے۔

❁ **ڈاکٹر عظیم ہاشمی** (گیا): موجودہ شمارہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ آپ کی ادبی مہم جوئی بہ لفظ ظریف آپ کو ''سند باد جہازی'' کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ شاید آپ سے قبل کسی نے اتنی سنجیدگی سے اسے موضوعاتی رنگ میں ڈھالنے کا سوچا بھی نہ ہو! آپ نے Mini thesis کا کام کردیا ہے۔ سہرا کے موضوع پر ''تمثیل نو'' میں ویسے جس موضوع سے متعلق مضامین آتے ہیں ان کا توازن اور ان کی تنوع کاری دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایک صاحب نے رسالے پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''تمثیل نو'' Regional رسالہ ہے، اعظم صاحب بڑے فنکاروں کا تعاون نہیں لیتے جب کہ ان کے تعلقات کافی وسیع ہیں اور انہیں بڑا سے بڑا رائٹر آسانی سے مل سکتا ہے۔ مجھے ان سے بحث کا اچھا Topic مل گیا۔ بڑا فنکار کون ہوتا ہے؟ بہتر سال کی عمر کے کسی بچے کو پیدا ہوتے نہیں سنا اور جس کی حیات ہو وہ ستر ۷۰ سال کی عمر کو بھی پہنچ کر ہی رہتا ہے۔ تمثیل نو برادری کے ڈھیر سارے نام گنوائے میں نے انہیں اور بقول ان کے اس Reginal رسالے کی پہنچ کہاں تک ہے اس کے ہر شمارے سے

عیاں ہوتا ہے۔ دراصل تمثیل نو کی مثال اس پتنگ سے دی جاسکتی ہے جو آزاد فضاؤں میں ہوا کے جھونکے پر چہار سمت کی سیر کرتا ہو۔ سارا آسمان اس کے لئے کھلا ہے لیکن اس کا ربط ہاتھ کی چرخی سے کبھی نہیں ٹوٹتا! اس شمارے میں پروفیسر سید مجید بیدار، پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ہوا کے عافیت بخش جھونکے ہیں تو مامون ایمن پروفیسر عبدالمنان طرزی، اس کی مضبوط ڈور ہیں اور جناب سیف رحمانی اس چرخی کی طرح ہیں جو موضوع کا ربط زمین سے ٹوٹنے نہیں دیتے۔ ڈاکٹر رضوان احمد اور جناب سید منظر امام مشابہہ التاثر ہیں اس شمارے میں ویسے منظر امام صاحب کا اپنا انداز بیان منظر کو مووی بنادیتا ہے۔ نعیمہ ضیاء الدین کی کہانی ''پیک وان'' آپ کے تلاش سہرا کی طرح ہی ایک نفسیاتی موضوع کا بہترین Pull out ہے۔ ''قاعدہ'' ایک Touchy کہانی ہے۔ صاحب بصیرت لوگوں کے لئے میری مراد کہانی کی تکنیک سے نہیں بلکہ موضوع سے ہے۔ پروفیسر حامد کاشمیری کا خط غور طلب ہے۔ اور آخر میں احمد تنویر، حفیظ انجم، ڈاکٹر مسلم شہزاد وغیرہ تمام حضرات کا میں ''تمثیل نو'' کے توسط سے اپنی غزلوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

❁ **سید ہاشم رضا** (بتیا، مغربی چمپارن): ''تمثیل نو'' جنوری تا ستمبر ۲۰۰۷ء ملا۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی، خوب سے خوب تر ہے۔ مضامین، چھپائی اور سرورق سب اعلیٰ درجہ کی ہے۔ پہلی جنگ آزادی کی تصاویر نے اور چار چاند لگا دیا ہے۔ ''عظیم ہاشمی مخصوص شاعر'' بہت پسند آیا۔

❁ **صابر فخرالدین** (یادگیر): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ 'سہرے کی ادبی معنویت' ملا اور اپنی بھینی بھینی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کر گیا۔ 'مجھے کچھ کہنا ہے' ہر بار کی طرح اس بار بھی رُخ تمثیل نو پر سہرے کی طرح لگا تمام چیزیں اچھی لگیں ویسے لکھنے کو بہت کچھ ہے مگر میری کمزوری یہ ہے کہ میں نثر نہیں لکھ سکتا۔

❁ **عبدالحق امام** (گورکھپور): ''تمثیل نو'' جسے پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آپ نے بیش قیمتی مواد کو ترتیب دے کر جنگ آزادی کے علماء اور مجاہدین نیز اردو قلم کاروں کی تاریخ کو یکجا کر کے عوام کے سامنے پیش کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ آپ نے اپنے رسالے کے ذریعے ہندوستان کے علاوہ دنیا کے ادباء و شعراء کو یکجا کر لیا ہے اور جس کا عکس ہر شمارے میں دیکھنے کو ملتا ہے یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے جو ہمت و داد کے قابل ہے اور بلاشبہ یہ معیاری ادبی جریدہ ایک نئے دور کی نئی مثال ہے۔ میری نظر میں دربھنگہ علمی و ثقافتی لحاظ سے اوّل بن گیا ہے اور پٹنہ دوئم۔ کیوں کہ دربھنگہ میں جتنے لکھنے پڑھنے اور چھپنے والے شعراء و ادباء موجود ہیں اتنے صوبۂ بہار میں کہیں نہیں ملتے۔ اور ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے رسالے کے توسط سے جو دربھنگہ کی علمی، ادبی، ثقافتی سرگرمیوں سے روشناس کرایا ہے کہ ہر شخص پروفیسر سید منظر امام کا یہ مصرعہ کہنے کو مجبور ہے کہ ''دربھنگہ دل سے جاتی ہی نہیں یاد تری''۔ 'تمثیل نو' کا تازہ شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء تا جون ۲۰۰۸ء موصول ہوا۔ بلاشبہ اس شمارے میں آپ نے ایک نئی زمین تلاش کی ہے سہرا جیسی خفیف صنف کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی ہے جو آج تک نظر انداز کی جاتی رہی ہے آپ نے اس کی ادبی حیثیت اور عصری معنویت کو اجاگر کرنے کی جو پیش قدمی کی ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔

یہ مختصر سا گوشہ ہے اس پر اور بھی مضامین آنے چاہئے تھے اس کے علاوہ ہندوستان سے شائع ہونے

والے مختلف شہروں کے ''سہرے کے گلدستے'' کا بھی ذکر ہوتا تو تاریخی اہمیت حاصل ہو جاتی جیسے دہلی، لکھنؤ، کولکاتہ، حیدرآباد، بنارس اور گورکھپور وغیرہ کیوں کہ ان شہروں میں بھی سہرا لکھنے کی روایت برقرار ہے اور ''گلدستے'' موجود ہیں۔ لیکن آپ نے زیادہ تر ''صوبۂ بہار'' کے سہرے کا ذکر کیا ہے پھر بھی آپ نے ادبی وثقافتی لحاظ سے سہرا جیسی خفیف صنف کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے اس لحاظ سے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آپ کا اداریہ خوب ہوتا ہے جس میں اردو ادب کی تقریبات اور شعراء وادباء کی کارکردگی کا بھرپور جائزہ لیا جاتا ہے جس سے قارئین عالمی سطح پر ادبی، ثقافتی خبروں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ مختلف قسم کے مضامین، غزلیں، نظمیں، رباعیات، حمد ونعت، قطعات اور ''قطعات تاریخ وفات ڈاکٹر منصور عمر صاحب کے خوب ہوتے ہیں'' کتابوں پر تبصرے، مراسلات وغیرہ اتنے مواد ہوتے ہیں کہ قاری پڑھ کر اردو زبان وادب کے قومی، ملی اور تاریخی خدمات کا لطف حاصل کر لیتا ہے کیوں کہ آپ نے اپنے رسالہ میں لسانی، تمدنی اور معلوماتی نصب العین کو سامنے رکھا ہے جس سے معاصر ادبی رسالوں میں اس رسالے کا نام آگے آرہا ہے۔

❁ **وارث ریاضی** (سکٹا دیوراج مغربی چمپارن): ''تمثیل نو'' کی آٹھویں جلد کا تیسرا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ بھی سابق شماروں کی طرح لائق مطالعہ ہے۔ ''سہرا۔ خصوصی مطالعہ'' کے زیر عنوان پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق اور پروفیسر سید مجید بیدار وغیرہم کے مضامین میں سہرا اور اس کی ادبی معنویت پر وقت نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق صاحب کے مضمون کا تو جواب نہیں۔ موصوف جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں فکر ونظر اور معلومات کا دریا بہا دیتے ہیں۔ مناظر صاحب نے اپنے مضمون میں تقریباً ۴۷ شعراء کے سہرے کے اشعار درج کئے ہیں۔ اگر ان کی نگاہ سے اقبال سہیل مرحوم کے سہرے گزرے ہوتے تو وہ ضرور ان کے سہرے کے اشعار بھی درج کرتے۔ اقبال سہیل نے بڑے خوب صورت اور فکر انگیز سہرے لکھے ہیں۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر درج کئے جاتے ہیں:

نوید آئی ہے یارب کس کی تقریب عروسی میں
کہ خود کلیاں چمن کی آرزو میں بن گئیں سہرا
یہ کس کے جلوۂ رنگیں سے محفل یوسفستاں ہے
یہ کس کے فیض سے ہے اس قدر حسن آفریں سہرا

فضائے بزم کو عطر مسرت سے بنا دینا
رخ گل رنگ کو پھولوں کے جھرمٹ میں چھپا دینا
نگاہ شوق کی بیتابیوں پر مسکرا دینا
دلوں پر بجلیاں حسن تبسم کی گرا دینا
کہاں سے لے کے آیا ہے حسینوں کا چلن سہرا

اسرار اکبر آبادی صاحب نے اپنے مضمون ''آئینہ بہار ایجاد'' میں سید امین اشرف مدظلہ کے مجموعہ کلام پر بڑی ژرف نگاہی سے تبصرہ کیا ہے۔ سید امین اشرف نے ''بہار ایجاد'' کی غزلوں میں فکر ونظر کے نئے نئے گل بوٹے اگائے ہیں۔ اگر چہ امین اشرف صاحب کا انداز تغزل بالکل منفرد ہے تاہم اسلوب بیان کی ندرت، مضامین کی متانت، خیالات کی پاکیزگی، مذاق تصوف اور اثر آفرینی میں ان کی غزلیں حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کی یاد تازہ کردیتی ہیں۔ سید امین اشرف کی شخصیت کی طرح ''بہار ایجاد'' کی غزلیں بھی تہہ دار، سنجیدہ ومتین اور پر کیف ونشاط آگیں ہیں۔ اگر چہ سید امین اشرف کے یہاں میر کی یاسیت اور فانی کا غم نہیں، لیکن ایسا نہیں کہ موصوف کو نامرادی اور غم سے زندگی میں کبھی سابقہ نہ پڑا ہو، بات یہ ہے کہ امین اشرف صاحب ایک صوفی صفت، حلیم الطبع اور بے نیاز انسان ہیں۔ وہ غم ویاس کے ایام میں بھی ہنس کر گزر جاتے ہیں، اس لئے ان کی غزلوں میں یاس وغم کی لے مدھم اور نرم ہے۔ اصغر گونڈوی کی طرح امین اشرف صاحب کا بھی خیال ہے:

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہئے
مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ وفریاد کی

دراصل سید امین اشرف کے نزدیک:

زلف ورخ شام وسحر، حسن تخیل ذوق شعر
شاعری بکھری ہوئی رعنائیوں کا نام ہے (منشور واحدی)

گیسوئے غزل کے سنوارنے میں حضرت جگر مرادآبادیؒ کے بعد جن شاعروں نے زیادہ دلچسپی دکھائی ان میں سید امین اشرف کا نام سرفہرست آتا ہے۔ افسانے اور حصہ منظومات بھی اچھے ہیں۔

❁ **غلام مصطفی روحی کٹیہاری** (سیوان): اکتوبر ۰۷ تا جون ۲۰۰۸ء کا شمارہ ''تمثیل نو'' دستیاب ہوا۔ اس بار کا رسالہ ایک انوکھی شان لیکر جلوہ نما ہوا ہے۔ یوں تو تمثیل نو کا ہر شمارہ تاریخی ہی ہوتا ہے مگر اس شمارہ کی الگ ہی پہچان ہوگی۔ صنف ''سہرا'' پر اس قدر بھر پور تبصرہ بلاشبہ آپ کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ آنے والی نسلوں میں جب بھی صنف ''سہرا'' پر تذکرہ ہوگا تو ''تمثیل نو'' کا یہ شمارہ یقیناً ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ جس کا سہرا آپ کے سر جاتا ہے۔ اور بہت فخر کی بات ہے۔

❁ **عبد الرحمن عبدؔ** (واسع پور، دھنباد): آپ کا پرچہ مل گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا تھا۔ بلکہ اس بار کا شمارہ تو کچھ زیادہ ہی پسند آیا۔ اس لئے کہ ایک اچھوتے موضوع پر اتنے سارے مضامین پڑھنے کو ملے۔ اداریہ اور پروفیسر سید منظر امام صاحب کی خودنوشت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔

❁ **Dr. Ebraheem Al Batshan** (Cultural Attache (Royal Embassy of Saudi Arabia) New Delhi)

It is a great pleasure for me to inform you that I have received a copy of your Urdu Magazine Tamsile Nau. I appreciate your efforts for Promoting Urdu Language & Spreading Literacy through your magazine. I wish a prosperous and flourishing future for such as important magazine.

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी — مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

Maulana Azad National Urdu University

(A Central University established by an Act of Parliament in 1998)

Gachibowli, Hyderabad - 500 032

Ph. (EPABX) 040-23008402-04, Toll Free No. 1800-425-2958, website: www.manuu.ac.in

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Admission Notification (2008-09) اعلان برائے داخلہ ۲۰۰۸-۲۰۰۹

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو تعلیمی سال 2009-2008 کے لیے درج ذیل فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں:

پوسٹ گریجویٹ کورس (دو سال)	انڈر گریجویٹ کورس (تین سال)	ڈپلوما کورس (ایک سال)	چھ ماہی سرٹی فکیٹ کورس
ایم۔اے اردو ایم۔اے تاریخ ایم۔اے انگلش	بی۔اے بی۔کام بی۔ایس سی (B.Z.C & M.P.C) بی۔ایڈ B.Ed (دو سال) (برائے برسرِ خدمت اساتذہ)	ٹیچ انگلش (Teach English) جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن	اہلیت اردو بذریعہ انگریزی (PIU/English) اہلیت اردو بذریعہ ہندی (PIU/Hindi) فنکشنل انگلش (Functional English) غذا اور تغذیہ

پروسپکٹس مع پروگرام گائیڈ 17 اگست 2008 سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد اور ریجنل سنٹرس حیدرآباد، دہلی، بھوپال، بنگلور، دربھنگہ، کولکتہ، ممبئی، رانچی، سری نگر، سب ریجنل سنٹر حیدرآباد، جموں، لکھنؤ، نوح، میسور، امراوتی اور یونیورسٹی کے تمام اسٹڈی سنٹروں پر 17 اگست 2008 سے دستیاب رہیں گے۔ یہ فارمس یونیورسٹی ویب سائٹ (www.manuu.ac.in) سے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے امیدوار جو انٹرمیڈیٹ (10+2) یا اس کے مماثل قابلیت نہیں رکھتے ان کے لیے 30 نومبر 2008 کو اہلیتی امتحان منعقد ہوگا۔ اہلیتی امتحان میں شرکت کرنے والے امیدواروں کے لیے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ 30 اکتوبر 2008 ہے۔ پوسٹ گریجویٹ، انڈر گریجویٹ، ڈپلوما اور سرٹی فکیٹ کورس میں راست داخلے کی آخری تاریخ 31 جنوری 2009 ہے۔ انڈر گریجویٹ، ڈپلوما اور سرٹی فکیٹ کورس کے لیے پروگرام گائیڈ شخصی طور پر -/200 روپے یا بذریعہ ڈاک -/250 روپے کے بینک ڈرافٹ کے عوض حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بی۔ایڈ پروگرام کے لیے پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر -/500 روپے یا بذریعہ ڈاک -/550 روپے کے بینک ڈرافٹ کے ذریعے جو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نام حیدرآباد میں قابلِ ادا ہو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام کی تواریخ، انٹرنس ٹسٹ کی تفصیلات پراسپکٹس میں دی گئی ہیں۔

پوسٹ گریجویشن، ڈپلوما اور سرٹی فکیٹ کورس کے لیے بینک ڈرافٹ 'مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' کے نام حیدرآباد میں قابلِ ادا ہو۔ گریجویشن کورس کے لیے بینک ڈرافٹ ریجنل ڈائرکٹر متعلقہ ریجنل سنٹر کے نام اور ریجنل سنٹر سے ملحقہ اسٹڈی سنٹروں کے مقام پر قابلِ ادا کسی بھی قومیائے بینک سے حاصل کردہ ہونا چاہیے۔ نقد رقم کسی بھی صورت میں قبول نہیں کی جائے گی۔ مزید تفصیلات یونیورسٹی ویب سائٹ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ریجنل سنٹروں کے پتے اور فون نمبر حسبِ ذیل ہیں:

(1) Darbhanga Regional Centre, Super Market Building ,Moula Ganj, Darbhanga - 846004 (Bihar) Tel.No.0627-2221138 (2) Patna Regional Centre, 2nd Floor, Bihar State Co-operative Bank Building , Ashok Rajpath, Near B.N.College, Patna - 800004 (Bihar) Tel.No. 0612-2300413 (3) Delhi Regional Centre, B-1/275, Ground Floor, Zaidi Apartments, T.T.I.Road, Okhla, Jamia Nagar, New Delhi 110025 Tel.No.011-26934762, 011-26838260 (4) Srinagar Regional Centre, 18B, Jawahar Nagar,Opp BEECO Gallery, Srinagar-190001 (J&K) Tel.No.0194-2310221 (5) Ranchi Regional Centre, Near Millat Academy Campus,Tiwari Tank Road , Hindpiri, Ranchi-834001 (Jharkhand) Mob No. 9431623788 (6) Banglore Regional Centre, Room No. 8, 2nd Floor, Al-Ameen Commercial Complex, Hosur Road , Near Lal Bagh Main Gate, Bangalore - 560027. Tel.No.080-22228329 (7) Bhopal Regional Center, 12, Ahmedabad Palace, Koh - E-Fiza, Bhopal-1 (Madhya Pradesh) Tel. No. 0755 -2736930 (8) Mumbai Regional Centre, A-1, HS Ltd. F1/6, Flat No.4, 2nd Floor, Above Ram Dev Hotel, Sector-5, Vashi, New Mumbai - 400703 Tel.No.022-27820511/515 (9) Kolkata Regional Centre, Flat No.5, 2nd Floor, 9A, Lower Range, Kolkata - 700017, (West Bengal) Tel. No. 033 -22894568

کے۔آر۔اقبال احمد

ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم

حکیم الامت

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصانیف پر ایک نظر

☆ تعشق لکھنوی ☆ ذرودریائے نجف ☆ تاثیر ماتم ☆ مصحفِ تغزل ☆ انجم ☆ منظوم انجم ☆ فکر مطلعہ ☆ دربارِ رسالت

BIHURD00640/04/1/2005-T.C.
Monthly *TAMSEEL-E-NAU*
Vol. : 09, Issue : 06

Rs. 40/-
July 08-March 2009
Tel. : 06272-258755
Cell : 09431085816

Hony Editor : **Dr. Imam Azam**
Qilaghat, Darbhanga - 846004 (Bihar)
E-mail : imamazam99@yahoo.com

عالمی اُردو کانفرنس جدہ کے موقع کی یادگار تصویر جس میں معزز وائس چانسلر مانو پروفیسر اے ایم پٹھان، قونصلیٹ جنرل ڈاکٹر اوصاف سعید، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (لندن)، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر کے آر اقبال احمد (پرووائس چانسلر، مانو)

پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینڈا) ودیگر دیکھے جاسکتے ہیں۔
یہ کانفرنس مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی اور انڈین قونصلیٹ کے اشتراک سے ٦ تا ٧ جون ٢٠٠٨ء منعقد ہوئی۔

نقوشِ رفتہ: جامعہ اُردو علیگڑھ مرکز دربھنگہ (١٩٨٢ء، قدیم احاطہ مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ، دربھنگہ) کی یادگار تصویر میں طلباء و طالبات کے علاوہ ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر افتخار مدنی، سید نسیم اختر، ڈاکٹر الیس احمد ناصح، عبدالحفیظ، سید تنین اشرف، احمر اعظم، حسن امام فاروقی وغیرہ